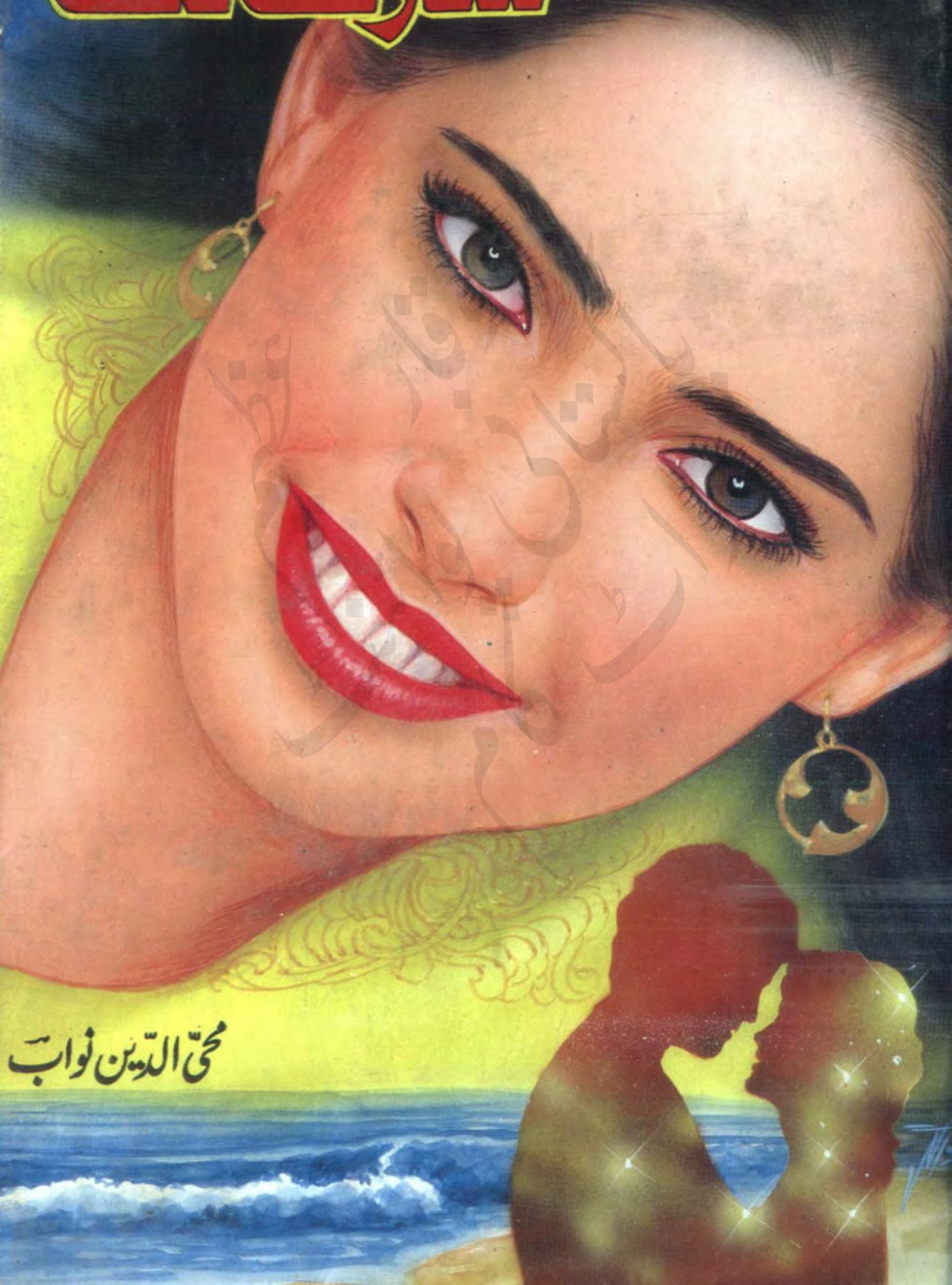


شارٹ کٹ



محی الدین نواب

دیباچہ

عموماً کسی ناول کا دیباچہ لکھتے ہوئے آغاز ان الفاظ سے کیا جاتا ہے کہ جناب فلاں اور فلاں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں یا قارئین ان کے نام سے بخوبی واقف ہیں یا ایسی ہی کوئی چیز۔ کسی بھی معروف مصنف کی کتاب کا دیباچہ لکھنے کے لیے اس قسم کا آغاز شیڈرڈ بن چکا ہے۔ لیکن محی الدین نواب!

اس نام کے ساتھ یہ لکھنا کہ ”محی الدین نواب کا نام قارئین کے لیے کسی تعارف کا محتاج نہیں“ کسربانی ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ ”محی الدین نواب“ ایک ایسا نام ہے جو بذات خود ایک حوالہ ہے۔ محی الدین نواب ان معدودے چند مصنفوں میں سے ایک ہیں جو اپنی کتابوں کے حوالے سے نہیں بلکہ ان کی کتاب ان کے نام کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے۔ ان کا نام اپنی ذات میں ایک لیجنڈ (Legend) بن چکا ہے۔ اس مقبولیت کی وجہ کیا ہے؟

کیا محی الدین نواب بہت اچھا لکھنے والے ہیں؟ کیا یہ بہت عرصے سے لکھنے کے میدان میں مصروف عمل ہیں؟ کیا ان کی شہرت اور ساکھ اس وجہ سے ہے کہ اس کا نام پاکستان کے بڑے بڑے ڈائجسٹوں میں مستقل نظر آتا رہتا ہے؟

نہیں..... مندرجہ بالا وجوہات میں سے کوئی بھی اس سوال کا جواب نہیں بن سکتی۔ بہت سے مصنف ان معیارات پر پورے اترتے ہیں۔ ان کے نام پاکستان کے بڑے بڑے جرائد اور ڈائجسٹوں میں نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ وہ بہت عرصے سے لکھ رہے ہیں۔ ان کی تحریر کی خوبی میں کسی کو کلام نہیں لیکن ان میں سے ہر کوئی محی الدین نواب نہیں..... آخر کیوں؟

اس سوال کا جواب صرف وہ شخص دے سکتا ہے جو محی الدین نواب کی تحریر کو محض وقت گزاری کے لیے نہیں بلکہ کچھ جاننے کے لیے، کچھ سیکھنے کے لیے پڑھتا ہے۔ صرف وہی شخص اس روح کو دیکھ سکتا ہے جو محی الدین نواب اپنی تحریر میں پھونکتے ہیں۔ صرف وہی شخص دوسرے مصنفین اور محی الدین نواب میں فرق کر سکتا ہے۔ صرف وہی شخص جان سکتا ہے کہ محی الدین نواب آخر محی الدین نواب کیوں ہے؟ ایسا نہیں ہے کہ محی الدین نواب زندگی کے جن نکات کو جن مسائل کو ہمارے

سامنے پیش کرتے ہیں، ان پر پہلے کسی نے طبع آزمائی نہیں کی۔ ان موضوعات پر پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا۔ محی الدین نواب کی دنیا وہی ہے جس میں ہم اور آپ رہتے ہیں لیکن پھر بھی یہ دنیا دوسروں سے الگ ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ محی الدین نواب میں اور دوسرے لکھنے والوں میں (میری مراد اچھا لکھنے والوں سے ہے) کیا فرق ہے؟

علم اقلیدس کی رو سے، ایک نکتے کو تین سو ساٹھ مختلف زاویوں سے دیکھا جاسکتا ہے مگر محی الدین نواب اس نکتے کو تین سو اکتھویں زاویے سے دیکھتے ہیں۔ دوسرے مصنفین اور محی الدین نواب میں یہی فرق ہے۔ چھوٹا سا لیکن از حد اہم۔

”شارت کٹ“ محی الدین نواب کا شاہکار ناول ہے۔ انسانی مسائل، مکافاتِ عمل اور انسانی نفسیات کی الجھنیں اور گرہیں اس کی بنیاد ہیں۔ ہماری دنیا کے انسان اس کے کردار ہیں اور ہماری روزمرہ زندگی میں ہمیشہ پیش آنے والے واقعات اس کا بلڈنگ میٹرل ہیں۔ اس میں ایسی کوئی چیز نہیں جسے ہم خلاف معمول یا خلاف فطرت کہہ سکیں لیکن پھر بھی یہ ناول شاہکار ہے۔

ایسا کیوں ہے؟

آپ اپنے ارد گرد روزانہ ہزاروں واقعات رونما ہوتے دیکھتے ہیں اور ان پر کوئی خاص توجہ دیئے بغیر اپنی راہ لگ جاتے ہیں۔ اس ناول میں ایسے ہی روزانہ زیر مشاہدہ آنے والے واقعات ہیں جو آپ کے لیے اجنبی نہیں لیکن پھر بھی جب آپ انہیں پڑھیں گے اور ان کے تاثر کو محسوس کریں گے تو آپ چونک اٹھیں گے۔

ایسا کیوں ہو گا؟

وجہ وہی ہے جو میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ تین سو اکتھویں زاویے! میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ اس ناول کا موضوع کیا ہے اور لکھنے والے نے کیا بتانے کی کوشش کی ہے۔ میرے بتانے کی کوئی ضرورت بھی نہیں، صفحہ پلٹنے اور محی الدین نواب کی دنیا میں داخل ہو جائیے۔ آپ کو قدم قدم پر حیرتیں ملیں گی اور حیرتوں کا لطف تب ہی آتا ہے جب وہ غیر متوقع ہوں۔

آفتاب ہاشمی

اچانک آسمان پر اندھیرا چھا گیا۔ خوبصورت منظر تاریکی میں ڈوب گیا۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ کہیں بھی، کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے آنکھیں مل کر اندھیرے کو منانا اور مٹے ہوئے منظر کو چمکانا چاہا۔ لیکن وہ ہزاروں کینڈل پاور کی روشنیوں سے بھی روٹھی ہوئی بصارت کو راضی نہیں کر سکتا تھا۔

وہ وہیں گھاس پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔ ایسا پہلے بھی ہو چکا تھا لیکن پہلے منظر دھندلا جاتے تھے۔ دیر تک کچھ واضح طور سے نظر نہیں آتا تھا۔ آس پاس کے لوگ دھند میں لپٹے ہوئے آہستہ سائے کی طرح منڈلاتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ وہ پہلی بار اس صورت حال سے بڑا پریشان ہوا تھا۔ پھر دھند چھٹنے لگی تو پریشانی دور ہو گئی۔ دو چار منٹ کے بعد ہی ہر شے بالکل صاف نظر آنے لگی تھی۔ جیسے کچھ ہوا نہ ہو۔ بس سر چکرایا ہو اور اس کے بعد وہ سنبھل گیا ہو۔

دوسری بار ماں نے اسے دیکھ کر پوچھا۔ ”پترا خیر تو ہے۔ یہ سر پکڑ کے کیوں بیٹھ گیا ہے۔ کیا سر چکرا رہا ہے؟“

اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ماں کو دیکھا۔ پہلی بار معلوم ہوا کہ آنکھیں دیکھتے دیکھتے تھک جائیں تو دودھ کے رشتے کو بھی دھندلا دیتی ہیں۔ ورنہ دعویٰ تھا کہ آخری سانس تک ماں باپ کی دیکھ بھال کرے گا۔ دیکھ بھال تو آنکھوں سے کی جاتی ہے اور دعویٰ زبان سے کیا جاتا ہے۔ افسوس کہ جذبے تو باقی رہتے ہیں جسمانی اعضاء ایک دوسرے کی نفی کرنے لگتے ہیں۔

اسے ماں کی آواز سنائی دینے لگی۔ ”ماں صدقے، یہ تو نایاب کی طرح آنکھیں کیوں پھاڑ رہا ہے؟“

اس نے فوراً ہی آنکھیں بند کر لیں۔ بہ دستور ہاتھوں سے سر تھام کر کہا۔ ”مجھ نہیں۔ بس یونہی ذرا نظریں دھندلا سی گئی ہیں۔“

”ہائے میں مر جاؤں۔ اسی لیے کہتی ہوں کتابیں نہ پڑھا کر۔ یہ علم کی روشنی بڑے گھروں میں ہوتی ہے۔ لائین کی روشنی میں پڑھنے والے آنکھیں بھی کھو دیتے ہیں۔“

اس پنڈ میں بجلی تھی لیکن چودھری شان الہی کی مرضی سے جلتی بجھتی تھی۔ اس نے کمہار دین محمد عرف دینو کو وارننگ دی تھی کہ اپنے بیٹے بشارت کو سکول نہ بھیجے۔ اس کے باپ دادا چودھریوں کی خدمت کرتے اور کچے مکانوں میں کچی زندگی گزارتے آئے ہیں اب وہ بیٹے کو پکا بنانے کے لیے تعلیم کی طرح نہ ڈالے۔

اور دینو کمہار کے دل میں بات بیٹھ گئی تھی کہ بیٹا مٹی کے برتن نہیں بنائے گا اور فاضل وقت میں چودھری کی غلامی نہیں کرے گا۔ اس نے بیٹے کی تعلیم جاری رکھی۔ چودھری نے سب سے پہلے اس کے گھر کی بجلی کٹوا دی اور کہا۔ ”راتوں کو بجلی کی روشنی میں زیادہ برتن بنایا کرتا تھا۔ بیٹا بھی خوب آگے پیچھے ہل ہل کر پڑھتا تھا اب مرو اندھیرے میں۔“

اندھیرا تو صدیوں سے رہا ہے۔ بجلی بہت بعد میں آئی ہے۔ باپ دادا چراغوں کی روشنیوں میں ہی کام کرتے اور پڑھتے لکھتے آئے ہیں۔ کہتے ہیں اگلے زمانے کے لوگوں کی بینائی حیرت انگیز ہوتی تھی۔ شام کے دھندلے میں سایہ سایہ نظر آنے والوں کو بھی صاف دیکھ کر پہچان لیتے تھے اور نام لے کر مخاطب کرتے تھے۔ قوت سماعت بھی ایسی تیز ہوتی تھی کہ ایک پنڈ کی مسجد سے بلند ہونے والی آواز دوسری مسجد کے لوگ سن لیا کرتے تھے۔ آج لاؤڈ سپیکر کے ذریعے گونجنے والی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اکثر ایک دوسرے سے پوچھا جاتا ہے۔ ”کیا اذان ہو چکی ہے؟“

بجلی سے محروم ہو کر دینو کمہار آدھا ٹوٹ گیا۔ بجلی کے بلب نے دیکھنے والی قوت ارادی چھین لی تھی۔ وہ پہلے کی طرح لائین کی روشنی میں کام نہ کر سکا۔ اپنے بیٹے بشارت سے بولا۔ ”بشارے! لائین کے سامنے نہ پڑھا کر، دن ہی دن کو اسکول کا کام نمٹا لیا کر۔“

”ابا! مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تیری آنکھیں بڑھاپے کی وجہ سے ہار گئی ہیں۔ میں جوان ہوں، جگنو کی روشنی میں پڑھ سکتا ہوں۔“

بشارت نے نادانی میں کہا تھا کہ اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جبکہ فرق پڑتا ہے۔ کسی کو کوئی چیز دے کر اسے اس کا عادی بنا دو اور پھر اس سے وہ چیز چھین لو تو فرق پڑتا ہے۔ پنکھا یا ایئر کنڈیشنر بند ہو جائے تو ہاتھوں سے پنکھا جھلکا گوارا نہیں ہوتا۔ انسان بھول چکا ہے کہ وہ کبھی قدرتی ہواؤں سے لطف اندوز ہوتا رہا ہے۔ وہ گرمی کو کوستا ہے، جبکہ نئی ایجادات کو کو سنا چاہیے جن کے باعث انسانی قوت برداشت جواب دے چکی ہے۔

بشارت نے بچپن سے لاہور شہر کا خواب دیکھا تھا اور باپ نے شہ دی تھی کہ خوب پڑھے گا تو لاہور جا سکے گا، ورنہ کنوئیں کا مینڈک بنا رہے گا۔ باپ نے لاہور اور تعلیم کو لازم و ملزوم کر دیا تھا۔ اسے ایک تعمیری جذبہ دیا تھا۔ چودھری اس کا یہ خواب چھین لینا چاہتا تھا۔ وہاں کے اسکول ماسٹر اور ہیڈ ماسٹر اگرچہ سرکاری تنخواہ دار تھے تاہم چودھری کی دھونس میں رہتے تھے۔ کیونکہ چودھری اس علاقہ میں سیاست دانوں کے لیے دوٹوں کا ٹھیکیدار تھا۔ وہ جس امیدوار کی حمایت کرتا تھا، اسے اسمبلی میں پھنچا دیتا تھا۔ یوں اپنے ہاتھ اوپر تک دراز رکھتا تھا۔ جس ماسٹر کو چاہتا اسے اسکول کی ملازمت سے درخواست کر دیتا تھا۔

اس نے ماسٹروں کو سمجھایا تھا۔ ”بچوں کو پڑھاؤ۔ پہلی سے دسویں جماعت تک پڑھاؤ۔ مگر تعلیم وہی دو، جو مزدوروں اور کسانوں کے بچوں کو دی جاتی ہے۔ تعلیم کے ہمانے ان کی زندگیوں کے دس برس ضائع ہونے دو۔ دس جماعتیں پڑھنے کے باوجود یہ انگریزی غلط پڑھیں، غلط لکھیں۔ اردو جتنا چاہیں پڑھنے دو۔ انہیں اسی فریب میں رکھو کہ یہ قوی زبان ہے۔ اس نکتے کو نہ سمجھنے دو کہ انگریزی سرکاری زبان ہے اور جب تک سرکاری زبان رہے گی، ان پنڈو اردو پنجابی پڑھنے والوں کو سرکاری ملازمتیں نہیں ملیں گی، اور یہ کسان اپنے بچوں کو بہت بڑا افسر بنانے کے خواب دیکھتے رہیں گے۔“

دینو کمہار بھی یہی خواب دیکھتا تھا کہ بیٹا یہاں سے پڑھ کر شہر جائے گا، وہاں پندرہ سولہ جماعتیں اور پڑھے گا پھر وہاں سے اتنا بڑا افسر بن کر آئے گا کہ چودھری سر جھکا کر اسے سلام کرے گا، سر اٹھا کر دیکھے گا تو پگڑی زمین پر گر پڑے گی۔

اس روز ہیڈ ماسٹر نے اسے گلے سے لگا کر کہا۔ ”دنوا مبارک ہو۔ تیرا بیٹا دسویں میں پاس ہو گیا ہے۔ باقی لڑکے ایک دو مضامین میں رہ گئے ہیں۔“

دنو مسرتوں سے بھر گیا۔ ہیڈ ماسٹر نے نہ پکڑا ہوتا تو وہ خوشی سے چکر اکر گر پڑتا۔ اس نے چند لمحوں میں بیٹے کو شہر جاتے اور ایک سرکاری جیب میں افسر بن کر آتے دیکھا اور اس اعتماد سے دیکھا کہ خواب کی آدمی تعبیر مل چکی تھی۔ پنڈ میں وہ پہلا لڑکا تھا جس نے چودھری کی ناک کے نیچے دس جماعتیں پاس کی تھیں۔

اس روز اس نے تمام پنڈ والوں کا منہ میٹھا کیا۔ چودھری شان الہی کے دروازے پر آیا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”چودھری صاحب! اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت کچھ دیا ہے بلکہ سب کچھ دیا ہے۔ آج اسی رب نے مجھے تھوڑی سی خوشی دی ہے۔ آپ یہ مٹھائی قبول کریں گے تو میری خوشی دو چند ہو جائے گی۔“

چودھری نے اپنی شاہانہ طرز کی کرسی پر بیٹھ کر ایک پاؤں پر دوسرا پاؤں رکھا پھر گردن اکڑائی، اس کے بعد کہا۔ ”مٹھائی قبول کر سکتا ہوں۔ پہلے یہ تو ہوتا۔ تیرا بیٹا پنڈ لکھ کر اب کیا کرے گا؟“

”جناب عالی! اسے شہر بھیجوں گا۔ وہ جماعتوں پر جماعتیں پڑھے گا اور آپ کی دعا سے کسی قابل ہو جائے گا۔“

”مجھے تیری عمر معلوم ہے۔ تو سٹھیا گیا ہے۔ بیٹے کی زندگی کے دس برس برباد کر دیے۔ اب اور دس برس برباد کرے گا۔ وہ بوڑھا ہو جائے گا۔ پھر بھی اسے کہیں ملازمت نہیں ملے گی۔ صرف دھکے ملیں گے۔ اگر پنڈ والوں کے مقدر میں کسی قابل ہو جانا لکھا ہوتا تو آج یہاں کوئی نظر نہ آتا سب اپنی قابلیت بگھارنے شہروں میں جا کر بس جاتے۔ میری مانو اور اس چھو کرے کو بیس عزت سے رہنے دو۔“

”وہ یہاں رہے گا تو میری طرح کچھ اور مٹی میں بیٹھے گا اور برتن بناتا رہے گا۔“

”ایسا کیوں سوچتا ہے۔ وہ دس جماعتیں پڑھ چکا ہے۔ میں اسے اسکول میں ماسٹر لگا دوں گا۔ دوسروں کو تعلیم دینا بہت بڑی نیکی ہے۔ وہ نیکی بھی کرے گا پیسے بھی کمائے گا۔“

”جناب عالی! وہ شہر جانا چاہتا ہے۔“

”شہر میں ٹھوکریں کھائے گا۔ اگر ماسٹر نہیں بننا چاہتا تو میرے پاس رہے۔ میرا منشی

بوڑھا ہو چکا ہے۔ تیرا بیٹا میرا منشی کھلائے گا تو پنڈ والے اسے جھک جھک کر سلام کریں گے۔“

دنو نے تصور میں دیکھا۔ سب اس کے بیٹے بشارت کو جھک جھک کر سلام کر رہے تھے لیکن بشارت چودھری کے سامنے جھکتے جھکتے بوڑھا ہو گیا تھا۔ وہ عاجزی سے بولا۔

”میں جناب کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن جوان بیٹے کی خوشی کا بھی خیال آتا ہے۔ آپ اسے کچھ دنوں کے لیے شہر جانے دیں۔ وہ گھوم پھر کر آئے گا تو آپ کی خدمت کرے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ مٹھائی یہاں رکھ دے۔ بیٹے سے کہہ دے، کل شہر جائے اور پرہوں آجائے۔ اس کے آنے تک مٹھائی باسی نہ ہوئی تو کھالوں گا۔ ورنہ شہر سے ٹھوکریں کھا کر آئے گا تو اسے یہاں بھی کسی کام کا نہیں رہنے دوں گا۔“

دنو اس کے سامنے مٹھائی رکھ کر چلا گیا۔ سارے پنڈ میں یہ خبر پھیل گئی تھی کہ دنو کا بیٹا بشارت دس جماعتیں پاس کر چکا ہے۔ دوپہر تک یہ خبر گشت کرنے لگی کہ چودھری، کھمار کے بیٹے کو منشی رکھنا چاہتا ہے۔ وہاں کے لوگوں کے لیے یہ اتنی بڑی خبر تھی، جیسے بشارت حویلی میں نہیں اسمبلی میں پہنچنے والا ہو۔ دراصل اسمبلی وہ جگہ ہے جہاں فرشتے بیٹھ کر ٹوٹے ہوئے قلم سے عوام کی ٹوٹی پھوٹی تقدیریں لکھتے رہتے ہیں۔ اس حویلی میں بھی پنڈ والوں کے مقدر بنائے اور اجاڑے جاتے تھے۔ دنو کے بوڑھے ساتھیوں نے سمجھایا۔ ”بیٹے کو شہر نہ جانے دے۔ تجھے یاد نہیں ہے۔ پنڈ بھوئے اصل کارب نواز لاہور گیا تھا۔ مینے بعد اس کی لاش آئی تھی۔“

دوسرے نے کہا۔ ”موٹر گاڑیاں لاہور کی سڑکوں پر ہوائی جہاز کی طرح گزرتی ہیں، بندوں کو کچل کے چلی جاتی ہیں۔ ادھر کوئی داد فریاد سننے والا نہیں ہوتا۔“

دنو نے کہا۔ ”وہاں ایسا اندھیر نہیں ہوتا۔ شہروں میں بھی ہمارے جیسے بندے رہتے ہیں۔ پھر موت کہاں نہیں آتی؟ کیا یہاں لوگ نہیں مرتے ہیں؟“

”مرتے ہیں، انہوں کے سامنے۔ تیری حیاتی کتنی رہ گئی ہے؟ جوان بیٹا سامنے رہے تو اچھا ہے۔“

”یہی سوچ سوچ کر ہم نے آج تک باہر کی دنیا نہیں دیکھی۔ بشارت کے چاچا نے

لاہور سے لکھا ہے کہ میں کوئی فکر نہ کروں۔ بشارت کو گاڑی میں بٹھا دوں۔ وہ اسے لاہور میں اتار لے گا اور اس کا نام انوار سیٹی میں لکھا دے گا۔
”انوار سیٹی کیا شے ہے؟“

”یہ بہت بڑا ادارہ ہے۔ یہاں اونچی سے اونچی تعلیم دی جاتی ہے۔“
”مگر وہ تیرا تعلیم حاصل کرنے والا بشارت کہاں ہے؟“
”پتہ نہیں، صبح کا نکلا ہوا ہے۔ بھوئے اصل گیا ہو گا۔“

بشارت پنڈ سے ذرا دور نہر کنارے بیٹھا ہوا تھا۔ سوچ رہا تھا، لاہور نہر کے دوسرے کنارے ہوتا تو ساری مشکلیں آسان ہو جاتیں۔ وہ نہر میں چھلانگ لگاتا اور آدھے منٹ میں تیرتا ہوا لاہور پہنچ جاتا۔ پتہ نہیں بڑی اور پُر رونق دنیا پنڈ والوں سے بہت دور کیوں رہتی ہے؟

وہ کسی چیز کی آرزو کرتا تھا تو اسے جلد ہی پالینا چاہتا تھا۔ مکے ماما کی بیٹی بیٹو اسے بچپن سے اچھی لگتی تھی۔ ایک بار ماں نے کہا کہ وہ بیٹو کا ہو بنا کر گھرائے گی۔ بشارت اسے فوراً ہی گھرانے کے لیے محل گیا تھا۔ ماں نے ہنستے ہوئے سمجھایا۔ ”تو ابھی تیرہ کا ہے اور وہ دس برس کی ہے۔ اسے جو ان تو ہو لینے دے۔“

اسے انتظار زہر لگتا تھا۔ لاہور کی آرزو کی تو دس جماعتیں پاس کرنے کی پابندی لگا دی گئی۔ بیٹو اچھی لگی تو جو ان ہونے کی شرط رکھی گئی۔ اس کی خواہشات ہی ایسی تھیں کہ ان تک پہنچنے کا کوئی چور راستہ یا بشارت کٹ نہیں تھا۔ دسویں جماعت پاس کرنے کے لیے ساتویں، آٹھویں اور نویں جماعتوں سے گزرنا لازمی تھا اور دس برس کی بیٹو کو گھر لانے کے لیے چھ برس تک کیلنڈروں کو گھورتے رہنا تھا۔ اس نے سنا تھا لڑکیاں سولہ برس میں جو ان ہوتی ہیں۔ اس سے پہلے دال نہیں گلتی۔

جب وہ سترہ برس کا ہوا تو اسے یہ نسخہ معلوم ہوا کہ ایک چٹکی کھانے کا سوڈا ہانڈی میں ڈالا جائے تو سخت سے سخت دال گل جاتی ہے۔ کم سن کو ہم سن بنانے کے لیے ابھی سے ہاتھ پکڑا جائے، اسے عشق و محبت کی ہانڈی میں ڈالا جائے اور جذبات کے چولے پر تپایا جائے تو وہ ہڑبڑا کر جو ان ہو جائے گی۔

وہ اسی لیے نہر کنارے آتا تھا۔ بیٹو کا گھر وہاں سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔ وہ

دوسری لڑکیوں کے ساتھ نہانے اور کپڑے دھونے آتی تھی۔ یہاں کی آب و ہوا میں جذباتیت بھری ہوئی ہے۔ اسی لیے ہیرا، نچھا، سوہنی مہینوال اور مرزا صاحبان جیسی ہستیاں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ الزا اور کم سن بیٹو نے پہلی بار بشارت کے اشاروں کو نہیں سمجھا۔ رات کو بستر پر کروٹیں بدلتے وقت وہ اشارے یاد آنے لگے۔ کچے ذہن کو کچھ سمجھانے لگے۔ ان اشاروں میں بڑی رازداری تھی اور راز کوئی سامی ہو، انسان کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ دوسرے دن وہ سیلیوں سے کترا کر اس کے پاس آئی۔ آنکھیں دکھا کر بولی۔ ”تو اشارے کیا کرتا ہے؟“

اس نے پوچھا۔ ”کیا میرا اشارہ تیری سمجھ میں نہیں آتا؟“
”سمجھ میں آتا تو پوچھتی کیوں؟“

”تو ایسے نہ آتی۔ میں نے اشارہ کیا تو پوچھنے کے بہانے چلی آئی۔ اشارہ سمجھ میں نہ آئے تب بھی کام ہو جاتا ہے۔“

”اسکول میں پڑھتا ہے نا کتابوں والی باتیں کرتا ہے۔ ایسی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں، میں جاری ہوں۔“
”جائے گی تو پھر اشارے کروں گا۔“

”کیا دیوانہ ہوا ہے۔ میری ہم جولیاں کیا سوچیں گی؟“
”یعنی اشارے اس حد تک تیری سمجھ میں آگئے ہیں کہ انہیں کوئی اور نہ دیکھے۔ یہ اوروں کے لیے نہیں، صرف تیرے لیے ہوتے ہیں۔“

اس سے جواب بن نہ پڑا۔ وہ جانے لگی۔ بشارت نے کلائی پکڑ لی۔ وہ آنکھیں دکھا کر بولی۔ ”یہ کیا حرکت ہے؟“

”تیری آنکھیں اچھی لگتی ہیں۔ اسی طرح دکھاتی رہا کر۔“

اس نے کلائی چھڑانے کی کوشش کی۔ وہ کوئی نازک نار نہیں تھی۔ اس کے گورے گورے ہاتھ کھیتوں میں درانتی چلاتے تھے۔ اس کی انگلیاں اتنی مضبوط تھیں کہ بیہنسوں کا دودھ دوہتی تھیں۔ ایک بار باپ نے اسے طمانچہ مارا۔ ماں نے کہا۔ ”تجھے شرم نہیں آتی۔ بیٹی چودہ برس کی ہو گئی ہے اور تو اس پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔“

باپ نے ماں کی نہیں سنی۔ دوسرا طمانچہ مارنا چاہا تو بیٹو نے ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ غصے

سے بھر گیا۔ ہاتھ چھڑانا چاہا تو ناکام رہا۔ زور سے لگایا۔ ہاتھ کو ادھر اُدھر جھٹکے دیئے۔ اس کے بعد ہانپنے لگا۔ پیٹو نے ہاتھ چھوڑ کر کہا۔ ”لے اے! مار لے۔ تو باپ ہے، باپ ہی رہے گا۔“ باپ نے کچھ پریشان ہو کر، کچھ شرمسار ہو کر بیٹی کو دیکھا پھر منہ پھیر کر چلا گیا۔

بشارت کی مٹھی میں اسی پیٹو کی کلائی تھی۔ وہ پھر جاتی تو چھڑا لیتی۔ مگر بکھر رہی تھی اور بکھرتے بکھرتے اس کی گرفت میں آکر سمٹ رہی تھی۔ لہذا اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ بکھر جانا چاہیے یا نامعلوم سے جذبول کی پناہ گاہ میں ٹھہر جانا چاہیے۔

بشارت نے کلائی چھوڑ دی۔ پھر بھی وہ سحرزدہ سی رہی۔ ایسی ظالم گرفت میں تھی کہ گوری کلائی سرخ انگارے کی طرح دھب رہی تھی۔ وہ بولا۔ ”میں تیری بانہ تھام کر تجھے چوڑیاں پہنانے کا حقدار ہو گیا۔ کل اسی وقت چوڑیاں لے کر آؤں گا۔“

وہ چلی گئی۔ دوسرے دن آگئی۔ دوسرا دن گزرا تو تیسرے دن آگئی۔ اب اسے آنا یاد رہتا تھا۔ جانا بھول جاتی تھی۔ بدنامی کے خوف سے جانا پڑتا تھا۔ بشارت کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ انتظار احمق کرتے ہیں کسان فصل کے منتظر رہتے ہیں۔ کوئے پکنے سے پہلے ہی دانے نوچ کر لے جاتے ہیں۔ اسی لیے بعض کوئے سیانے کھلاتے ہیں۔

دس جماعتیں پاس کرنے تک چالاکی بھی آگئی۔ نقالی کے ذریعے مشکل سے مشکل پرچے حل ہونے لگے۔ اس سلسلے میں استادوں نے بھی چھوٹ دی۔ بورڈ کے امتحانات میں بھی کسی نے نقالی سے نہیں روکا۔ بازاروں میں اسی مال کی قدر ہوتی ہے اور وہی مال ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے، جس کی پروڈکشن کوالٹی بہترین ہوتی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں کی فیکٹیوں سے جو طلباء پیدا ہو کر آتے ہیں، ان کی پروڈکشن کوالٹی نہایت ناقص ہوتی ہے۔ سرکاری یا غیر سرکاری شعبوں میں کوئی انہیں نہیں پوچھتا۔ مال اچھا نہ ہو تو فیکٹریاں بند ہو جاتی ہیں لیکن بے جان تعلیمی ادارے بند نہیں ہوتے۔ کوئی محاسبہ نہیں کرتا کہ جو تعلیمی ادارے ذہین افراد اور بہترین مستقبل کے امین پیدا نہیں کر سکتے، وہ جاری کیوں رہتے ہیں؟

بشارت نے اخبار میں پڑھا تھا کہ شہروں میں بعض طلباء اپنے ممتحن کو ٹی ٹی یا کلاشکوف دکھا کر نقالی کرتے ہیں اور اچھے نمبروں سے پاس ہوتے ہیں لیکن ایسے طلباء کی تعداد کم ہے۔ تمام پاکستانی طلباء نقال یا غنڈے نہیں ہوتے۔ وہ کم نمبروں سے پاس ہوتے

ہیں۔ جتنی ذہانت انہیں استادوں سے ملتی ہے وہ اسے لے کر عملی میدان میں آتے ہیں۔ عرصہ تک ٹھوکریں کھاتے ہیں پھر غلط راہوں پر چل پڑتے ہیں کیونکہ انہیں قرآن و جبراً جینا ہوتا ہے۔

وہ نہر کنارے بیٹھا ہوا تھا۔ ابھی اسے دسویں جماعت پاس کرنے کی خوشخبری نہیں ملی تھی۔ پھر بھی یقین تھا کہ ایمانداری سے زیادہ بے ایمانی مستحکم ہوتی ہے۔ وہ ضرور کامیاب ہو گا اور شہر جائے گا پھر ملازمت ملے ہی ماں کی خواہش پوری کرے گا۔ پیٹو کو دلہن بنا کر گھر لے آئے گا۔

وہ ایک ایک کنکراٹھا کر پانی میں پھینک رہا تھا اور اس پہلو سے سوچ رہا تھا کہ جتنی تیزی سے پیٹو کو حاصل کیا اور انتظار کی روایت ختم کر دی اسی طرح کیسے بشارت کٹ چل کر یا کسی چور دروازے سے گزر کر فوراً ملازمت حاصل کر سکتا ہے۔ اب جوئے شیر لانے کے لیے نہر کھودنے کا زمانہ نہیں تھا۔ راتوں رات اپنی منزل پالینے کا دور تھا۔ اس نے یہ بات دل پر لکھ لی تھی کہ جو آج نہیں پاتا اور کل کے انتظار میں جیتا ہے اس کی زندگی میں آج کا دن کبھی نہیں آتا اور کل کا دن نہ کسی کی زندگی میں آیا ہے، نہ آئے گا۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سورج ڈوبنے سے پہلے شفق کی سرخیوں میں صاف نظر آ رہا تھا۔ درخت کی شاخیں جھوم رہی تھیں اور پرندے ایک سمت پرواز کرتے جا رہے تھے۔ یہ سب کچھ واضح تھا، اچانک آسمان پر اندھیرا چھا گیا۔ خوبصورت منظر تاریکی میں ڈوب گیا۔ اس نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ کیسے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے آنکھیں مل مل کر اندھیرے کو مٹانا اور مٹے ہوئے منظر کو چمکانا چاہا لیکن تاریکی بدستور حاوی رہی۔ وہ وہیں گھاس پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔ ایسا پہلے بھی ہوا تھا لیکن پہلے منظر مٹتے نہیں تھے صرف دھندلا جاتے تھے۔ اسے ہر شے دھندلی سی نظر آتی تھی۔ پھر دو چار منٹ کے بعد دھندلا پن ختم ہو جاتا تھا اور وہ پہلے کی طرح صاف طور سے دیکھنے لگتا تھا۔

لیکن اس شام اس کی آنکھوں پر تاریکی مسلط ہو گئی۔ اس نے کئی بار آنکھیں بند کیں پھر کھولیں ایسا کرنے سے بینائی بحال ہو جاتی تھی۔ مگر ایک منٹ گزر گیا..... دو منٹ اور پھر گویا صدیاں گزر گئیں۔ وہ اندھے کی طرح بیٹھا رہا۔ اب اس کی قوت

برداشت جواب دے رہی تھی۔ وہ چیخا چاہتا تھا۔ ”اماں! اماں! میں اندھا ہو گیا ہوں مجھے کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔ مجھے میری آنکھیں واپس لادو۔ اماں! جیسے تو نے آنکھ والا پیدا کیا تھا ویسے ہی پھر سے میری آنکھیں پیدا کر دے۔“

وہ چیخے چیخے رہ گیا۔ ہونٹوں کو سختی سے بھیج لیا۔ قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی اور وہ آنے والی کولاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ یہ خیال تیزی سے آیا کہ اپنے اندھے پن کو ظاہر نہیں کرنا چاہیے۔ بیوی ہوتی تو میاں کا ہر عیب اور ہر نقص برداشت کر لیتی۔ معشوق سے ڈر لگتا ہے کہ پسری بدل لے گی۔ جب دو آنکھوں والے مل جاتے ہیں تو اندھے یا کانے کو کوئی نہیں پوچھتی۔

آہٹ تھم گئی۔ بشارت نے پوچھا۔ ”رک کیوں گئی، آجا بیٹو!“ وہ پاس آتے ہوئے بولی۔ ”ہائے ربا! تو نے پلٹ کر نہیں دیکھا پھر کیسے پہچان لیا؟“ وہ آہٹ سے سمجھ رہا تھا کہ وہ روبرو آگئی ہے۔ ”بیٹو! میں تجھے دل کی آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔ گہری تاریکیوں میں بھی تیری خوشبو پا کر یا تیرے بدن کو چھو کر تجھے پہچان سکتا ہوں۔“

بشارت نے دل برداشتہ ہو کر آنکھیں بند کر لیں اور سر کو جھکا لیا۔ وہ بولی۔ ”کیا بات ہے؟ تو کچھ ٹوٹا ہوا سا لگ رہا ہے۔“

”میں سوچ رہا ہوں کہ تو مجھے کیوں چاہتی ہے، مجھ میں کیا دیکھ کر میرے پاس آتی ہے؟“

”یہ تو میں نے کئی بار سوچا، پر سمجھ میں نہیں آیا کہ تو اچھا کیوں لگتا ہے۔“

”اگر میں اندھا ہوں جاؤں تو کیسا لگوں گا؟“

”اندھے ہوں تیرے دشمن۔ سورج ڈوب رہا ہے ایسے وقت میں دل ڈوبنے والی

باتیں نہ کر۔“

وہ سر جھکائے خاموش رہا۔ جی میں آیا، آنکھیں کھول کر دیکھے۔ شاید دکھائی دے اور آنے والی کا دیدار ہو جائے لیکن حوصلہ نہ ہوا، وہ بولی۔ ”یہ تو نے آنکھیں کیوں بند کی ہیں؟ سر بھی نہیں اٹھا رہا ہے، بات کیا ہے؟“

”کچھ نہیں، بس یونہی۔“

”کیا مجھ سے ناراض ہے؟“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”پھر مجھے دیکھتا کیوں نہیں؟ کیا مجھ سے بیزار ہو گیا ہے؟“

”تو تو بس ایسی ہی الٹی سیدھی باتیں سوچتی ہے۔ میں تجھے دیکھنے کے لیے ہی یہاں آتا ہوں۔“

”تو پھر میری قسم ہے۔ آنکھیں کھول اور مجھے دیکھ۔“

وہ آنکھیں بند کیے رہا، اس نے کہا۔ ”آخری بار کہہ رہی ہوں۔ مجھے دیکھ، نہیں تو میں چلی جاؤں گی۔“

اس نے بے اختیار آنکھیں کھول کر کہا۔ ”نہیں.....“

وہ آگے بکتے بکتے رک گیا۔ آنکھیں کھولتے ہی بیٹو صاف طور سے نظر آگئی۔ اس کے پیچھے سورج ڈوب چکا تھا۔ دن کی آخری روشنی دم توڑ رہی تھی۔ اتنی کم روشنی میں سے زیادہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اسے چھو کر پھر پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے خوشی سے کہا۔ ”میں تجھے دیکھ سکتا ہوں۔ تجھے دیکھ رہا ہوں۔ تو نے سلیٹی رنگ کا سوٹ پہنا ہے..... اور تیرے گلے میں سفید موتیوں کی مالا ہے۔“

وہ اسے جگہ جگہ سے چھو رہا تھا، پکڑ رہا تھا، یقین کر رہا تھا کہ بینائی بحال ہو گئی ہے۔ بیٹو نے حیرانی سے پوچھا۔ ”تجھے کیا ہو گیا ہے؟ ایسے کہہ رہا ہے جیسے پہلی بار مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں نے جو لباس پہنا ہے جو مالا پہنی ہے، وہی سب کچھ نظر آئے گا اس میں مت زیادہ خوش ہونے کی کیا بات ہے؟“

”ابھی بیٹھے بیٹھے خواب سا لگ رہا تھا کہ میں اندھا ہو گیا ہوں تجھے دیکھ نہیں سکتا۔“

”تو نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں پھر دیکھتا کیسے؟ تیری آنکھیں تو میں نے کھلوائی

ں۔ تو کچھ پاگل سا ہو گیا ہے۔ پاس ہونے کی خوشی برداشت نہیں کر رہا ہے۔“

”پاس ہونے کی خوشی؟“

”انجان کیوں بن رہا ہے۔ سارے پنڈ والوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ تو منے دسویں

ماعت پاس کر لی ہے اور چودھری کے پاس منشی لگنے والا ہے۔“

”یہ کیا بکواس ہے۔ خوشی بھی سناتی ہے اور غصہ بھی دلاتی ہے۔ میں مرجاؤں گا مگر چودھری کی غلامی نہیں کروں گا۔“

”چل نہ کر۔ پاس ہونے کی خوشی تو منالے۔“

اس نے ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ دو دو خوشیاں منانے لگا۔ سب سے بڑی خوشی یہ تھی کہ آنکھوں کی روشنی سلامت تھی۔ عارضی تاریکی نے مسلط ہو کر تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ دوسری خوشی پاس ہونے کی تھی اور اس خوشی میں وہ بیٹو کو ناز و داد اور حسن و عشق کے ہر مضمون میں پاس کرتا جا رہا تھا۔

اچانک بیٹو نے چیخ ماری۔ بشارت نے پھرتی سے پلٹ کر دیکھا۔ بیٹو کا باپ اور چودھری کے دو حواری کھڑے ہوئے تھے۔ ایک حواری نے اس کی گردن پر گنڈا مار رکھتے ہوئے کہا۔ ”تو نکلے گا ہونے والا داماد نہ ہوتا تو ابھی تیری گردن اتار دیتا۔“

باپ نے بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ ”دوسری بار میری بیٹی سے ملے گا تو میں ہونے والا رشتہ توڑ دوں گا۔“

وہ گنڈا اسے کو اپنی گردن سے ہٹاتے ہوئے اٹھ کر بولا۔ ”نکلے ما! میں دس جماعتیں پاس کر چکا ہوں۔ کل ہی اماں کو تمہارے گھر بھیجوں گا۔“

”تیری ماں دوپہر کو آئی تھی۔ شادی کی تاریخ مانگ رہی تھی۔ میں نے صاف کہہ دیا ہے کہ تو چودھری کی نوکری کرے گا تو میں بیٹی دوں گا۔“

”یہ تو کوئی شرط نہ ہوئی ما!۔“

”یہی پہلی اور آخری شرط ہے۔ میں تیس برس سے چودھری کی خدمت کر رہا ہوں۔ وہ تجھے بھی منشی کی ملازمت دے کر تیری عزت بڑھا رہا ہے۔ تو عزت کو ٹھکرا کر ذلت اٹھانے شہر جائے گا تو میں تیرے ساتھ اپنی بیٹی کو ذلیل ہونے نہیں بھیجوں گا۔“

پھر وہ ذرا نرم پڑتے ہوئے بولا۔ ارے بد بخت! ذرا عقل سے کام لے۔ گھر میں عزت اور نوکری مل رہی ہے تو باہر جا کر ٹھوکر کھانے کی کیا ضرورت ہے؟ تیری ماں بہت سمجھدار ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ تو اس کی نظروں سے دور جائے۔ تیرا باپ الٹی کھوپڑی کا آدمی ہے تجھے بھی الٹا سبق پڑھا رہا ہے۔“

”سبق الٹا ہو یا سیدھا۔ باپ پڑھا رہا ہے۔ اس لیے ایک سعادت بیٹے کو پڑھنا اور

اس پر عمل کرنا چاہیے۔“

”تو باپ کا فرمانبردار ہے اور میں چودھری کا تابع دار ہوں۔ چودھری کا حکم ٹھکرائے گا تو تم لوگوں سے رہا سہا رشتہ بھی توڑ دوں گا۔“

وہ بیٹو کو کھینچ کر لے جانے لگا۔ بشارت نے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے کہا۔ ”اما! مجھے اپنی زندگی اپنے ڈھنگ سے گزارنے دے، میں وعدہ کرتا ہوں تیری بیٹی کو ہمیشہ خوش رکھوں گا۔“

ایک حواری نے اسے دھکا دیا۔ اس نے اچانک ایک ہاتھ سے گنڈا اسے کو پکڑا دو سرا ہاتھ اس کے منہ پر مارا۔ وہ ذرا لڑکھڑایا تو بشارت نے ایک جھٹکے سے گنڈا سا چھین لیا۔ دوسرا حواری نہتا تھا۔ وہ بھاگ کر ذرا دور جا کر کھڑا ہو گیا۔

ایک تو بشارت کا کسرتی بدن تھا۔ پہاڑ جیسا قد تھا۔ اس پر ہاتھ میں گنڈا سا آگیا تھا۔ دونوں حواری سہم کر دور ہو گئے تھے۔ نکلے ما نے غصے سے پوچھا۔ ”اوئے بشارے! کیا غنڈہ گردی کرے گا؟“

”نہیں ما! ابھی سمجھا رہا ہوں۔ یہ مجھ پر ہاتھ چلا رہے تھے۔ اس لیے ہاتھ دکھا رہا ہوں۔ آئندہ چودھری کے کتے بھونکنے آئیں گے تو زندہ واپس نہیں جائیں گے۔“

”اچھا اچھا۔ یہ گنڈا سا واپس کر دے۔“

اس نے بیٹو کو گنڈا سا دیتے ہوئے کہا۔ ”اسے بھی اپنے ساتھ لے جا۔ گھر پہنچ کر دے دینا۔ ایک بات پوچھتا ہوں۔ کیا تو بھی ما کی طرح یہی چاہتی ہے کہ میں شر نہ جاؤں۔ یہیں زندگی گزار دوں۔“

وہ بولی۔ ”ابا ٹھیک کہتا ہے۔ جب یہاں عزت کی نوکری مل رہی ہے تو اپنا گھر اپنی زمین چھوڑ کر جانا سراسر نادانی ہے۔“

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ نکلے نے کہا۔ ”کتا میں پڑھ لینے سے عقل نہیں آتی۔ میری بیٹی تجھ سے زیادہ سمجھدار ہے۔ ارے! یہ کیا..... تو کسی بچے سے بھی پوچھتے گا تو وہ بھی یہی کہے گا۔“

”اسی لیے میں نے تمہاری بیٹی سے پوچھا ہے۔ ہمارے پرکھوں سے یہ قول چلا آ رہا ہے کہ عورتوں اور بچوں کی عقل سے فیصلہ نہ کیا کرو۔ میں نے عورت کی عقل دیکھ لی۔

خدا حافظ۔

وہ اپنے راستے پر جانے لگا۔ حواری نے کہا۔ ”لا پیٹو! میرا گنڈا سادے۔ میں اپنی بے عزتی کا بدلہ لوں گا۔“

پیٹو نے گنڈا سے کو مضبوطی سے تھام لیا۔ حملہ کرنے کے انداز میں تن کر کھڑی ہو گئی۔ پھر بولی۔ ”خسرے بھی پیچھے سے حملہ نہیں کرتے۔ تو کیسا مرد ہے؟ کون سی عزت ہے تیری؟ عزت اور شان والا مرد وہ جا رہا ہے، اس نے ہتھیار اور طاقت رکھتے ہوئے بھی ہمارا منہ دیکھ کر تجھے چھوڑ دیا۔“

وہ اونچی آواز میں بول رہی تھی۔ بشارت دور تک اس کی آواز سنتا رہا۔ وہ دھیمی آواز میں بھی حواری کو باتیں سنا سکتی تھی اور اپنے عاشق کی حمایت میں بول سکتی تھی لیکن وہ سنا رہی تھی کہ وہ روٹھ کر جا رہا ہے لیکن وہ اس کی حمایت میں بول رہی ہے۔ یہ بھی پیار کی ایک ادا تھی کہ وہ ساتھ نہیں آئی تھی مگر اپنی آواز کو دور تک اس کے ساتھ بھیج رہی تھی۔

رات کو سروسوں کا ساگ اور مچوں کی چٹنی کے ساتھ روٹیاں کھاتے ہوئے اس نے کہا۔ ”ابا! تیری طرح بوڑھا ہو جاؤں گا۔ تب بھی یہی ساگ اور روٹیاں کھاتا رہوں گا۔ کیا فرائی مچھلی، چکن اور مٹن، مرغ بریانی اور کباب سکے اور اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی طرح طرح کی نعمتیں صرف شر والوں کے لیے ہیں۔ اگھوں میں اور مٹنگے ہوٹلوں میں کھاتے ہیں تو پس منظر میں مدھر موسیقی سنائی دیتی ہے۔ یہاں کی روٹیوں کے پیچھے غربتی اور محتاجی کا سنا رہتا ہے۔ ذرا سوچو ابا! ان کا کھانا اور کتنا لذیذ ہو جاتا ہوگا، جب اس میں موسیقی، عورتوں کی ریلی ہنسی اور بچوں کی مسکراہٹیں شامل ہوتی ہوں گی۔ ہمیں تو ان نعمتوں سے اور خوبصورتیوں سے ایک چٹکی حصہ بھی نہیں ملتا ہے۔“

”مٹے گا پترے گا۔ تو کل ہی اللہ کا نام لے کر شہر چلا جا۔“

ماں نے کہا۔ ”کچھ سوچ سمجھ کر بولو۔ یہ جائے گا تو نکلے اپنی بیٹی نہیں دے گا۔“

”کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ نکلے بیٹی والا ہے، اسے سر جھکا کر بولنا چاہیے لیکن وہ چودھری کی شہ پر گرج رہا ہے۔ چودھری کو ہم سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ کبجنت میرے بیٹے کو روکنے کے لیے پیٹو کو چار بنا رہا ہے۔ نکلے کی مت ماری گئی ہے“

بیٹی کو اس معاملے میں لاتے ہوئے اسے ذرا بھی شرم نہیں آرہی ہے۔

”نکلے ماما کبھی بڑا غیرت مند ہوا کرتا تھا۔ چودھری کی غلامی کرتے کرتے بے غیرت ہو گیا ہے۔“

ماں نے کہا۔ ”کیوں میرے بھائی کو برا کہہ رہے ہو۔ وہ نوکر ہے، جو آقا کے گاؤں وہ کرے گا۔ اس بے چارے کی بھی مجبوری سمجھو۔“

ماں، بھائی اور بھانجی کے لیے جذباتی ہو رہی تھی۔ پیٹو کو کسی بھی طرح ہو بنا کر لانا چاہتی تھی۔ بشارت رات کو بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ ”میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ پیٹو میرے بستر پر رہے۔ دیکھا جائے تو میرے سامنے بستر یا میدان کا انتخاب ہے۔ ایک مرد کو پہلے میدان میں اترنا چاہیے۔ اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانا چاہیے۔ پھر بستر کی آرزو کرنی چاہیے۔ جو میدان چھوڑ کر آتا ہے، اس کے بستر پر عورت کو بہت کچھ ملتا ہے، مگر مرد میدان نہیں ملتا۔“

اس نے نیند میں ڈوبتے ڈوبتے فیصلہ کر لیا کہ اپنے عزائم پر قائم رہے گا شہر لاہور کے نئے نظارے کرے گا۔ پیٹو کے نظارے تو کر چکا تھا۔ نئی دنیا میں نئی دلچسپیوں میں اور نئی آب و تاب میں جو کشش ہوتی ہے، وہ دیکھی ہوئی اور برقی ہوئی چیز میں نہیں ہوتی۔ پیٹو کے اندر سے کشش نکل گئی تھی، صرف بے چاری سی رسم محبت رہ گئی تھی۔ وہ دوسرے دن رسی طور پر اسے بڑی محبت سے یاد کرتا ہوا ٹرین میں بیٹھ گیا۔

لاہور چھاؤنی پر تقریباً آدھی ٹرین خالی ہو جاتی ہے۔ شہر میں داخل ہوتے ہی ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے کہ جلد سے جلد گھر پہنچ جائے۔ ویسے بھی چھاؤنی اسٹیشن سے لاہور کے کسی بھی حصے میں جانے کے لیے ٹرانسپورٹ بہ آسانی مل جاتی ہے۔ بشارت کھڑکی سے باہر گردن نکال کر گامے چاچا کو ڈھونڈنے لگا۔

گامے چاچا بھی مزارعین والی زندگی سے فرار ہو کر یہاں آیا تھا۔ وہ سگا نہیں تھا لیکن انہوں نے اسے اتنی محبتیں دی تھیں کہ وہ سگوں سے بڑھ گیا تھا۔ پانچ برس پہلے لاہور آنے کے لیے اس کے پاس پھٹی کوڑی نہیں تھی۔ دینو نے اپنی بیوی کے کچھ زیور گروہی رکھ کر اسے شہر جانے کے لیے رقم دی تھی۔ تب سے وہ دینو کا مرید ہو گیا تھا۔ کئی خطوط میں لکھ چکا تھا کہ بشارت کی فکر نہ کرو۔ جب چاہو بھیج دو۔ باہر سے آنے والے

سے کم جانتے ہیں، خالی خالی سے رہتے ہیں۔“

وہ لاہور کی پختہ اور چکنی سڑکوں کے اطراف میں سایہ دار درختوں کو بھاگتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ کئی چور ہوں پر اتنے خوبصورت فوارے تھے کہ ان کی ناچتی اور تھرکتی شفاف دھاریں، بیٹوں کے بدن کا لونچ اور کرشمہ پیش کر رہی تھیں۔ وہ جی بھر کے دیکھ نہ سکا گاڑی آگے نکل گئی۔

وہ گویا پرستان میں آگیا تھا۔ راستے میں کئی پریاں نظر آئیں۔ عجب رنگ برنگے لباسوں میں تھیں۔ کسی کا دوپٹہ لہرا رہا تھا کسی کی زلفیں خوشبو لٹا رہی تھیں۔ گامے نے پوچھا۔ ”بھائی دینو کی صحت کیسی ہے؟“

ایک دم سے خواب ٹوٹ گیا۔ وہ پنڈ کی گرد اڑاتی ہوئی سڑک پر آکر کھڑا ہو گیا۔ ماں کھانس رہی تھی۔ دینو آوے پر جھکا ہوا تھا اور چودھری بڑک مار رہا تھا۔ وہ بے زار ہو کر بولا۔ ”او چاچا! جنت میں لا کر جنم کی باتیں نہ کر۔ کیا اس ایئر کنڈیشن میں بوڑھوں اور بیماروں کی کراہیں اچھی لگیں گی۔“

”بیٹا! خوشیاں سمیٹنے کے وقت اپنے بزرگوں کو نہیں بھولنا چاہیے۔“

”میں نہیں بھولتا۔ مگر خدا کے لیے تھوڑی دیر کو سب بھول جانے دو۔ ان طلسمی نظاروں میں کھو جانے دو۔“

کار ایک شاندار کوئٹھی کے سامنے رک گئی۔ چوکیدار نے بڑا سا آہنی گیٹ کھولا۔ گامے احاطے کے اندر ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔ ”میں یہیں رہتا ہوں۔“

”یہاں؟“ اس نے شدید حیرانی سے کہا۔ ”اتنے منگے اور خوبصورت محل میں رہتے ہو؟“

وہ کار سے باہر آئے۔ گامے نے ڈکی سے سامان نکالتے ہوئے کہا۔ ”یہاں کا مطلب ہے کوئٹھی کے سروٹ کوارٹر میں رہتا ہوں۔“

وہ ذرا مایوس ہوا۔ سروٹ کوارٹر میں پہنچ کر اپنی اوقات یاد آئی۔ وہ مٹی کے مکان سے نکل آیا تھا۔ اس کوارٹر کی چھت اور چار دیواری پختہ تھی۔ پیڈل اور چھت کے پتکے تھے۔ ایک ریڈیو اور چھوٹائی دی بھی تھا اور پرانے صوفے بھی تھے۔ گامے نے مسکرا کر کہا۔ ”کوئٹھی میں جو سامان پرانا ہو جاتا ہے، صاحب اسے میرے حوالے کر دیتا ہے۔“

نوکریوں کے لیے ٹھوکریں کھاتے ہیں لیکن وہ بشارت کو دوسرے ہی دن کام پر لگا دے گا۔ گامے چاچا پر نظر پڑتے ہی بشارت نے ہاتھ ہلایا۔ وہ ڈرائیو کی وردی میں تھا۔ لپک کر کپار ٹمنٹ میں آیا اسے گلے لگا کر دعائیں دیتا ہوا بولا۔ ”کیسا کڑیل جوان ہو گیا ہے۔ مجھ سے بھی ایک بالشت اوپر چلا گیا ہے، کہاں ہے سامان؟“

بشارت نے سامان اٹھایا لیکن گامے نے اس سے زبردستی چھین لیا پھر قلی کی طرح سامان اٹھا کر پلیٹ فارم پر اترنے لگا۔ بشارت نے کہا۔ ”چاچا! یہ اچھا نہیں لگتا تو اتنی سفید بشرٹ اور پتلون میں صاحب لگ رہا ہے اور یہ سامان اٹھا رہا ہے۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”یہ کوئی قیمتی سوٹ نہیں ہے۔ ایک ڈرائیو کی وردی ہے۔ میں صاحب نہیں ہوں مزدور ہوں، مزدور۔“

یہ بشارت کے لیے نئی اور حیران کن بات تھی کہ شر کے مزدور ایسا اجلا لباس پہنتے ہیں۔ اسٹیشن کے باہر ایک قیمتی کار کھڑی ہوئی تھی۔ گامے نے ڈکی کھول کر اس کا سامان رکھا۔ پھر اسے بند کرتے ہوئے کہا۔ ”عورتیں جان دے دیتی ہیں، زیور کبھی نہیں دیتیں۔ تیری ماں نے اپنے زیور دے کر مجھے یہ آزاد شہری زندگی دی ہے۔ میں مرتے دم تک تم لوگوں کے احسان کو نہیں بھولوں گا۔“

وہ دونوں گاڑی کی اگلی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ گامے نے شیشے چڑھا دیے اور ایئر کنڈیشنر آن کر دیا۔ باہر کی تپتی ہوئی دھوپ سے اندر آکریوں لگا جیسے وہ جنت میں پہنچ گیا ہے۔ سیٹ کے پچھلے رخسار کی گود کی طرح مہبان اور آرام دہ تھے۔ وہ گھوم گھوم کر گاڑی کو اندر سے دیکھ رہا تھا۔ گامے اس کی حیرانی کو سمجھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ وہ بولا۔ ”چاچا! یہ کھڑکیوں پر کتنے قیمتی پردے لگے ہوئے ہیں۔ یہاں ایک کمرے کی سجاوٹ کا ہر سامان ہے۔ ایسا سامان ہمارے پنڈ کے چودھری نے بھی نہیں دیکھا ہو گا۔ یہ کار نہیں، چلتی پھرتی خواب گاہ لگ رہی ہے۔ میں یہاں بیٹھا رہا تو نیند آ جائے گی۔“

گامے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ابھی تو نے کچھ نہیں دیکھا ہے۔ اس گاڑی سے باہر لاہور ایک سمندر ہے۔ یہاں تیرے تیرے دیکھتے دیکھتے تھک جائے گا۔ پھر بھی حیرانی ختم نہیں ہوگی۔ ایک گر کی بات بتا دوں، کسی کے سامنے کسی بات پر حیران نہ ہونا، ورنہ لوگ تجھے پنڈ کہیں گے۔ یہاں کے لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں، جیسے بہت کچھ جانتے ہوں۔ مگر اندر

اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنا قیمتی سامان کو بھی کا تھوکا ہوا ہے۔ یہ عجب مشاہدہ تھا کہ کو بھی کا تھوک کو ارٹر میں آکر چمکتا ہے اور ان کی چار دیواری کی رونق بڑھا دیتا ہے۔

گامے نے بتایا کہ اس کا صاحب ایک بہت بڑا مل اوزر ہے۔ نام ملک سرفراز خان ہے۔ کو بھی کے احاطے میں چار گاڑیاں ہیں۔ باقی دس گاڑیاں اور پندرہ ٹرک مل کے احاطے میں رکھے جاتے ہیں۔ گامے گھر کی چار گاڑیوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اس نے صاحب سے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے ایک بھتیجے کو یہاں ڈرائیور رکھنا چاہتا ہے اور صاحب نے منظوری دے دی تھی۔

بشارت نے کہا۔ ”چاچا! میں گاڑی چلانا نہیں جانتا ہوں۔“

”پہلے میں بھی نہیں جانتا تھا۔ سیکھنے سے سب کچھ حاصل ہوتا ہے۔ بیگم صاحبہ اپنے میکے پنڈی گئی ہیں ایک جوان بیٹا اور دو بیٹیاں گرمیاں گزارنے کے لیے سوئٹزرلینڈ گئے ہیں۔ صاحب ان کی غیر موجودگی میں یہاں بہت کم آتے ہیں۔ زیادہ تر مل ہی میں رہتے ہیں۔ وہ سب ایک ماہ سے پہلے نہیں آئیں گے۔ میں تب تک تجھے پکا ڈرائیور بنا دوں گا۔“

بشارت نے غسل کیا لباس تبدیل کیا۔ گاماگیراج سے ایک چھوٹی سوزوکی کار لے آیا۔ پھر بولا۔ ”تیرے سیکھنے کے لیے یہ گاڑی مناسب رہے گی۔ تجھے لاہور بھی دکھاناؤں گا اور ڈرائیوری بھی سکھاؤں گا۔“

چوکیدار نے بڑا سا آہنی گیٹ کھولا۔ گامے نے اس کے ہاتھ پر دس روپے رکھ دیے۔ پھر گاڑی آگے بڑھادی۔ بشارت نے پوچھا۔ ”یہ دس روپے کیوں دیے؟“

”رشتوت ہے۔ جب تک تو گاڑی چلانا نہیں سیکھے گا تب تک اسے روز دس روپے

دوں گا۔ بے چارے کی تنخواہ نو سو روپے ہے۔ چھ بچے ہیں اور ایک بیمار بیوی ہے۔ میری طرف سے یہ مدد ملتی رہے گی تو یہ کبھی مالک کو نہیں بتائے گا کہ میں گیراج سے روز گاڑی

نکال کر لے جایا کرتا تھا۔“

”کیا یہاں جتنے نوکر ہیں، وہ ایک دوسرے کی چغلی کھاتے ہیں۔“

”اکثر کوٹھیوں میں ایسا ہوتا ہے اور بہت سی کوٹھیوں میں نوکروں کے درمیان بڑا

اتحاد ہوتا ہے۔ جیسے ہماری کوٹھی کا باورچی ہمیں خوب اچھے اچھے کھانے کھلاتا ہے۔“

”چاچا! کیا کوٹھی والوں کا جھوٹا کھاتے ہو؟“

”لعلت ہے جھوٹے کھانے پر! تم نہیں جانتے کوٹھی میں پانچ بندے ہوتے ہیں تو پندرہ بندوں کا کھانا پکایا جاتا ہے۔ کیونکہ اکثر مہمان آتے رہتے ہیں۔ اس لیے کھانا بچتا بہت ہے۔ کچھ فریج میں رکھا جاتا ہے کچھ ہم کھا لیتے ہیں۔ باورچی کی اس مہربانی کے بدلے میں اسے گاڑیوں میں گھماتا پھراتا ہوں۔ چوکیدار کے بیوی بچوں کو بھی سیر کرا دیتا ہوں۔ صاحب کے ملنے والے مجھے پچاس کبھی سو روپے انعام کے طور پر دیتے ہیں۔ ہر مہینے ہزار پندرہ سو روپے اوپر مل جاتے ہیں۔ میں باورچی، چوکیدار اور مالی کو سو پچاس دیتا رہتا ہوں۔ ہمارے درمیان بڑا اتحاد ہے۔ مالک کو ہمارے خلاف کبھی کوئی شکایت نہیں ملتی۔“

”چاچا! ناراض نہ ہونا، یہ تو مالک سے بے ایمانی ہے، پنڈ میں ایسا نہیں ہوتا۔“

”پنڈ میں کچھ ہو گا تو بے ایمانی ہوگی۔ وہاں دو گوالے میں ہیں۔ دودھ میں پانی ملائیں گے تو بے ایمانی ظاہر ہو جائے گی۔ یہاں ہزاروں گوالے ہیں۔ وہ دودھ میں پانی کی ملاوٹ چیک کرنے والے افسر کو ایک ایک روپیہ بھی دیں تو افسر ہزاروں روپے کما لیتا ہے۔ پتر بشارے! شہر دیکھنے سے پہلے شہر والوں کے رنگ ڈھنگ سمجھو، پنڈ والوں کی معصومیت سے جو گے تو ساری عمر بینڈو کھلاتے رہو گے اور اپنے باپ کے خواب پورے کرنے کے لیے کبھی افسر نہیں بن سکو گے۔“

اس نے مزگ پنچ کر ایک بڑے ہوٹل کے سامنے گاڑی روک دی۔ وہاں اور کئی ہوٹل تھے۔ چرغے، نکلے اور کبابوں کی اشتہا انگیز مک دور تک پھیل رہی تھی۔ لوگ میزوں کے اطراف میں بھی تھے اور اپنی شاندار کاروں میں بیٹھ کر بھی کھا رہے تھے۔ کار رکتے ہی ایک ملازم دوڑا ہوا آیا۔ گامے نے ایک چرغے اور نان کا آرڈر دیا۔ پھر ملازم کے جانے کے بعد بولا۔ ”یہ لوگ جو میز کرسیوں پر کھا رہے ہیں، غریب غراء نہیں ہیں۔ ان کی جیبوں میں بڑی رقیں ہوتی ہیں۔ لیکن یہ جتنی بھی رقم والے ہوں، رکشے ٹیکسیوں میں آتے ہیں۔ کار میں بیٹھ کر آرڈر دینے اور کھانے کی شان ہی کچھ اور ہوتی ہے۔“

کچھ کاروں میں بوڑھی اور جوان عورتیں بھی کھاتی پیتی نظر آ رہی تھیں۔ بشارت

اس نے پہلی بار ملک کو کار میں بٹھا کر گاڑی چلائی۔ گامے نے اچھی طرح سکھا دیا تھا کہ کس طرح کار کا دروازہ کھولنا اور آرام سے بند کرنا چاہیے اور ڈرائیونگ کے دوران بت کی طرح خاموش رہنا چاہیے۔ اس نے تمام ہدایات پر عمل کیا اور واپسی میں پاس ہو گیا۔ مالک نے گامے سے کہا۔ ”اسے بیگم اور بچوں کی گاڑیوں کے لیے رکھ لو۔ بچے اگلے ہفتے واپس آ رہے ہیں۔“

اگلے ہفتے جو بچے واپس آئے، وہ بیس، بائیس اور پچیس برس کے تھے۔ پچیس برس کی ایک بھرپور جوان اور صحت مند لڑکی تھی۔ اس کا نام شائستہ تھا۔ بشارت کو اس میں کہیں سے شائستگی نظر نہیں آئی۔ چونکہ سیدھی یورپ سے آرہی تھی اس لیے جینز اور شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ لباس نے اسے بڑی مشکوں سے باندھ رکھا تھا ورنہ بدن پھٹ پڑنے کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ دوسری بائیس برس کی لڑکی کا نام شازیہ تھا۔ وہ بھی دوپٹے سے بے نیاز تھی لیکن ڈھیلا ڈھالا لباس پہنے ہوئے تھی۔ تیسرا بیس برس کا لڑکا زبیر تھا اگرچہ بیٹا تھا لیکن رفتار و گفتار سے بیٹی لگ رہا تھا۔ اس نے بشارت کو دیکھ کر گامے سے پوچھا۔ ”ہائے گامے! یہ نیا بندہ کہاں سے پکڑ لائے ہو؟“

گامے نے کہا۔ ”بابا صاحب! یہ میرا بھتیجا ہے۔ نمبرون ڈرائیور ہے۔“ شائستہ نے ناگواری سے کہا۔ ”ہوگا۔ میں نئے بندے کا رسک نہیں لیتی۔ گامے! تم میری کار ڈرائیو کرو۔“

وہ ایک کار میں جا کر بیٹھ گئی۔ بشارت نے دوسری کار کا دروازہ زبیر اور شازیہ کے لیے کھولا۔ وہ دونوں کچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ سامان ڈکی میں رکھا جا چکا تھا۔ بشارت نے اسٹیرنگ سنبھالا پھر ایر پورٹ کے پارکنگ ایریا سے ڈرائیو کرتے ہوئے جانے لگا۔ زبیر نے کہا۔ ”ہائے باجی! یہ آپنی کتنی مغرور ہیں۔ بیباکی کار میں اکیلی بیٹھ کر چلی گئیں۔ جیسے بیبا انہی کے ہیں، ہمارے نہیں ہیں۔“

شازیہ نے ڈانٹ کر کہا۔ ”بیبا زبیر! ہائے جیسا لفظ زبان پر نہ لاؤ۔ وہاں انگریزوں کو ہائے وکی! ہائے ٹونی! کہتے تھے، کوئی بات نہیں۔ انگریزی میں ”ہائے“ ایک انداز مخاطب ہے۔ تم اکثر نئی نئی فضول سی عادتیں سیکھ لیتے ہو۔ اس بار انگریزوں کی ہائے لے کر آئے ہو۔ یہ ہائے ہمارے بیبا پر پڑے گی۔ لوگ تمہیں زنجنا سمجھیں گے۔“

نے پوچھا۔ ”چاچا! تم نے شادی کیوں نہیں کی؟“

”کوئی ڈھنگ کی ملی نہیں۔ میں نے ڈھونڈی بھی نہیں۔ تو بھی یاد رکھ، یہاں زنانیوں کے چکر میں نہ پڑنا۔ تجھے بچ کر کھا جائیں گی۔“

”چاچا! تم تو شہر کے مردوں سے ہی نہیں عورتوں سے بھی ڈرا رہے ہو۔ اب یہاں ڈرنے کے لیے کیا رہ گیا ہے؟“

”میں خوف زدہ نہیں کر رہا ہوں، ہوشیار کر رہا ہوں۔ یہ جانتا ہوں کہ بزرگوں کے سمجھانے کے باوجود نوجوان غلطیاں کرتے ہیں اور ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ پھر بھی میری آنکھ سے جتنا دیکھ سکو اور میرے دماغ سے جتنا سمجھ سکو، بہتر ہے۔“

کھانے کے دوران کار کے اسپیکر سے ہلکی ہلکی موسیقی ابھر رہی تھی۔ چرغے اور تنکے کباب کے ساتھ موسیقی کے خواب پورے ہو رہے تھے۔ کھانے کے بعد گامے اسے شہر کے راستے اور علاقے سمجھاتا رہا۔ آدھی رات کے بعد جہاں خالی سڑک نظر آئی۔ وہاں بشارت کو اسٹیرنگ سیٹ پر بٹھا کر سمجھاتا رہا کہ ایکسپریز اور بریک کسے کہتے ہیں۔ گتیر کہتے ہوتے ہیں اور کیسے بدلے جاتے ہیں۔ وہ چلاتا رہا، گھبراتا رہا اور غلطیاں کرتا رہا۔ گامے حوصلہ دیتا رہا۔ ”کوئی بات نہیں۔ غلطیوں کے بعد ہی انسان سنبھلتا ہے۔ ایسا کوئی بندہ نہیں گزرا جس نے کوئی کام سیکھنے سے پہلے غلطیاں نہ کی ہوں۔“

وہ رات تین بجے واپس آئے اور صبح دیر تک سوتے رہے۔ بشارت کے اگلے پندرہ بیس دن خوب مزے میں گزرے۔ اس عرصے میں وہ بڑے اعتماد سے گاڑی ڈرائیو کرنے لگا۔ شہر کے کتنے ہی راستوں، گلیوں اور علاقوں کو اچھی طرح سمجھ گیا۔ گامے نے جھوٹ بولنے کی بھی اچھی ٹریننگ دی تھی، تب اسے اپنے مالک ملک سرفراز خان کے سامنے پیش کیا تھا۔

مالک نے پوچھا۔ ”اس سے پہلے کہاں کام کیا ہے؟“

بشارت نے کہا۔ ”پہلے ملتان میں تھا۔ تین برس تک ایک صاحب کی گاڑی چلاتا رہا۔ پھر گامے چاچا نے مجھے لاہور آنے کے لیے کہا تو آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہوں۔“

”مجھے اتار کلی تک لے چلو۔ میں دیکھوں گا تم کام کے آدمی ہو یا نہیں۔“

”تم مجھے ڈانٹتی کیوں ہو؟ اور وہ جو تم اپنے بوائے فرینڈ کو ہائے فاروق کہتی ہو؟“
شازیہ نے چونک کر بشارت کو دیکھا۔ وہ بُت کی طرح خاموش تھا جیسے گونگا بہرا ہو۔
وہ انگریزی میں بولی۔

”SHUT UP YOU NONSENSE! YOU SHOULD NO
BEHAVE YOUR SISTER LIKE THAT. DO YOU THIN
THAT MAN IS DEAF AND DUMB?“

(تمہیں اپنی بہن کے بارے میں ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ کیا تم اس شخص کو گونگا اور
راکھتے ہو؟)

پھر وہ بشارت سے بولی۔ ”اے یو! تمہارا نام کیا ہے؟“

”بشارت۔ پورا نام بشارت علی۔“

”تعلیم کتنی ہے؟“

”دس جماعتیں پاس کر چکا ہوں۔“

شازیہ نے گھور کر بھائی کو دیکھا۔ پھر انگریزی میں کہا۔ ”کل سے تم پیلا کے ساتھ
میں رہو گے۔ وہی تمہیں مینرز (طور طریقے) سکھائیں گے۔“

بشارت نے کہا۔ ”بی بی جی! ناراض نہ ہوں۔ میں نے پنڈ میں تعلیم حاصل کی
ہے۔ میں اچھی طرح انگریزی نہیں سمجھتا ہوں۔“

”وہاٹ؟“ وہ تقریباً چیخ کر بولی۔ ”تم انگریزی نہیں سمجھتے ہو پھر کیسے سمجھ گئے کہ
میں بھائی کو ڈانٹ رہی ہوں۔ کیا مجھے فول بنا رہے ہو؟ پیلا نے تمہیں ملازم کیسے رکھ لیا؟“

”آپ یقین کریں، میں انگریزی نہیں سمجھتا ہوں۔ میں نے آپ کے انداز سے
سمجھا ہے کہ آپ ناراض ہو رہی ہیں۔“

اس وضاحت نے اسے مطمئن کر دیا پھر بھی وہ ناگواری سے بولی۔ ”ٹھیک ہے،
ٹھیک ہے اپنے کام سے کام نہ رکھو۔“

اس رات بشارت سونے سے پہلے بڑی دیر تک سوچتا رہا۔ ”یہ بڑے لوگوں کے
بچے کیسے فرزا انگریزی بول لیتے ہیں۔ بالکل انگریز کے بچے لگتے ہیں۔ میں دس جماعتیں
پڑھنے کے بعد بھی انگریزی کا ایک فقرہ نہیں بول سکتا۔“

اس نے ملازمت ملنے کے دوسرے ہی دن سے کسی کالج میں داخلہ لینے کی کوشش
شروع کی تھی لیکن وہ اتنے کم مارکس لایا تھا جیسے بھیک میں علم حاصل کر کے پنڈ سے آیا
ہو۔ اسے کسی کالج میں داخلہ نہیں ملا۔ گامے نے مشورہ دیا۔ ”کسی ٹیوشن سنٹر میں داخل
ہو جا۔ اپنی تعلیم کو مضبوط کر، نہیں تو بڑا افسر کبھی نہیں بن سکے گا۔“

اب وہ شازیہ کی زبان سے انگریزی سن کر مرعوب ہو گیا تھا اور سوچ رہا تھا۔
”انگریزی بولنے والوں کا بڑا رعب پڑتا ہے۔ دوسرے سننے والے صرف متاثر ہی نہیں
ہوتے بلکہ خود کو کمتر سمجھنے لگتے ہیں۔ میں کل ہی کسی انگریزی بول چال والے ادارے
میں داخلہ لوں گا۔“

اس نے بڑے لوگوں کے متعلق سنا تھا یا خوابوں میں انہیں دیکھا تھا۔ شرم میں آکر
انہیں آنکھوں سے دیکھ کر پتا چل رہا تھا کہ بڑا افسری آدمی بننا کتنا دشوار ہوتا ہے۔ تقریباً
ناممکن سا لگتا ہے۔ وہ تو ایک ہی کوشی والوں کی چکا چونڈ دیکھ دیکھ کر مایوس ہو رہا تھا۔ اس
نے ماں باپ کو خط لکھا۔ ”میں قدم قدم پر رکاوٹیں ہیں۔ کالجوں میں داخلے کے لیے جاؤ
تو کوئی نہیں پوچھتا۔ ہزاروں جوان بے روزگار پھر رہے ہیں یا اپنے خواب بھول کر چھوٹے
موٹے دھندے کر رہے ہیں۔ بڑا افسر بننا ناممکن سا دکھائی دے رہا ہے۔ شاید ساری زندگی
ایک ڈرائیور ہی بن کر رہ جاؤں۔“

گامے نے وہ خط پھاڑ کر کہا۔ ”خبردار! میرے دینو بھائی اور بھائی کو مایوس نہ کرنا۔
تو کیسا مرد کا بچہ ہے۔ ابھی شر آئے دو مہینے ہوئے ہیں۔ تو نے ایک ماہ کی تنخواہ دینو بھائی کو
بھیجی ہے۔ ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوگا۔ ایسے میں یہ خط انہیں مار ڈالے گا۔“

”تو میں آگے بڑھنے کے لیے کیا کروں؟“

”تو منزل تک پہنچنے کے لیے ہمیشہ شارٹ کٹ راستہ ڈھونڈتا ہے۔ ٹھیک ہے،
عروج حاصل کرنے کے لیے ایسا راستہ ضرور دیکھنا چاہیے لیکن جب تک راستہ نہ ملے،
طریقے سے اور مبر سے کوششیں کرتے رہنا چاہئیں۔“

گامے نے حوصلہ بڑھایا۔ اس نے ایک ٹیوشن سنٹر اور ایک انٹرنش لینگویج کی
کلاس میں داخلہ لیا۔ لیکن وہ روز کلاسیں اینڈ نہ کر سکا۔ دن ہو یا رات کبھی بیگم صاحبہ
کو، کبھی زبیر کو اور کبھی شازیہ کو کہیں نہ کہیں جانا ہوتا تھا۔ کبھی تمام دن کہیں جانا نہیں

ہوتا تب بھی انتظار میں رہتا کہ کب گیراج سے گاڑی نکالنے کا حکم صادر ہو جائے۔ اس کی تعلیم کا نقصان ہوتا تھا لیکن جیسے گرم ہونے لگی تھیں کبھی شازیہ یونیورسٹی جاتی تو اسے گھنٹوں انتظار کرنے کو ہستی اور روٹی کھانے کے لیے پیچیس پچاس روپے ضرور دیتی۔ بیگم صاحبہ پٹرول کا حساب نہیں کرتی تھیں۔ وہ آدمی ٹنکی بھراتا اور پوری ٹنکی کے پیسے لے لیتا تھا۔

یہ گلے نے سکھایا تھا۔ ”یہاں جتنی رقم بنا سکو“ بتاتے رہو۔ ہو سکتا ہے کبھی اتنی رقم جمع ہو جائے کہ یہاں کی سڑکوں پر اپنی ٹیکسیاں چلا سکو۔ زیادہ مال کمانے کا کوئی چانس نہیں کھوٹا چاہیے۔“ گلے کے کوارٹر میں چھوٹا سائیک اینڈ وائٹ ٹی وی تھا۔ بشارت کو جب بھی وقت ملتا، وہ انگریزی فلمیں یا سی این این کے پروگرام غور سے دیکھتا اور توجہ سے سنتا تاکہ ان کی زبان، لہجہ اور مفہوم سمجھ میں آتا رہے۔ یہ کوشش اس لیے تھی کہ وہ پیچھے بیٹھنے والی شازیہ، زیر اور ان کے دوستوں کی باتیں اچھی طرح سمجھ سکے۔

تین ماہ کی مسلسل کوششوں سے وہ بڑی حد تک ان کی باتیں سمجھنے لگا۔ ایک روز وہ گیراج سے کار نکال کر پورچ میں لایا۔ شازیہ یونیورسٹی جانے والی تھی۔ اس سے پہلے ہی شائستہ آکر بچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ پھر بولی۔ ”چلو۔“

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”جی چلتا ہوں لیکن وہ چھوٹی بی بی.....“

وہ ڈپٹ کر بولی:

”SHUT UP. CARRY ON MY ORDERS“

وہ خاموشی سے کار اشارت کر کے کار ڈرائیو کرتا ہوا احاطے سے باہر آیا پھر بولا۔

”کہاں چلوں؟“

”جنم میں۔“

”مگر..... میں تو راستہ جانتا نہیں ہوں۔“

”وہاں نان سنس۔ کیا راستہ جانتے تو مجھے جنم میں لے جاتے؟“

”میں نے صرف اتنا کہا ہے کہ جہاں آپ کو جانا ہے، وہ راستہ نہیں جانتا ہوں۔“

”اچھا اچھا۔ زیادہ نہ بولو۔ ماڈل ٹاؤن چلو۔“

پھر وہ موبائل ٹیلی فون کے ذریعے نمبر ملانے لگی۔ اس کے بعد بولی۔ ”ہیلو کون؟“

دوسری طرف سے کسی نے کچھ کہا۔ وہ چونک کر بولی۔ ”ہائے فاروق، کیا کر رہے ہو؟“
فاروق کا نام سن کر بشارت کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ کئی بار شازیہ کو فاروق کے ساتھ کار میں بٹھا کر یونیورسٹی سے کسی پارک یا دوسری تفریح گاہوں میں لے جاتا رہا تھا۔ شائستہ فون پر کہہ رہی تھی۔ ”میں راستے میں ہوں۔ تم تیار رہو۔ ہم پرل جائیں گے۔ آئی لو سوننگ۔ پھر سوننگ کے بعد لچ کریں گے۔ اوکے؟ میں آ رہی ہوں۔“

اس نے فون آف کر دیا۔ بشارت نے اس کے بتائے ہوئے پتے پر ایک معمولی کوشش کے سامنے کار روک دی اور ہارن بجایا۔ ایک منٹ کے اندر ہی فاروق باہر آیا پھر بشارت کو دیکھ کر ٹھک گیا۔ شائستہ نے دروازہ کھولتے ہوئے انگریزی میں کہا۔ ”او کم آن۔ یہ ایک معمولی نوکر ہے۔ شازیہ سے ہماری بات کہنے کی جرات نہیں کرے گا۔“

فاروق بچھلی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ بشارت نے پوچھا۔ ”کہاں چلوں؟“
شائستہ نے پوچھا۔ ”کیا تم نے سنا نہیں تھا۔ میں نے فون پر فاروق کو کہاں جانے کے لیے انوائٹ کیا تھا؟“

”آپ انگریزی بول رہی تھیں۔ یہ زبان میری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔“

وہ مطمئن ہو کر بولی۔ ”ٹھیک ہے، پرل چلو۔“

اس نے کار آگے بڑھا دی۔ شائستہ نے کہا۔ ”فاروق! تم کچھ نروس ہو۔“

وہ مسکرا کر بولا۔ ”نہیں بھلا نروس ہونے کی کیا بات ہے؟“

”تو خاموش کیوں ہو؟“

”تیسرے کی موجودگی میں کیا بول سکتا ہوں؟“

”تم سن چکے ہو کہ یہ گدھا انگریزی نہیں سمجھتا ہے۔“

”ہاں۔ وہ تو ٹھیک ہے۔ میں نے شازیہ سے کہا ہے کہ وہ اپنے پیلا سے ہماری شادی کی بات کرے۔ تم سے بھی یہی کہتا ہوں۔ دونوں میں سے جو پہلے بات طے کر لے گی، میں اسی سے شادی کروں گا۔“

”میرے سامنے شازیہ کی نہیں چلے گی۔ میں بڑی ہوں۔ پہلے میری شادی ہو گی اور تم سے ہی ہو گی۔“

”اور جب تک نہیں ہو گی، میں دونوں کے درمیان لکتا رہوں گا۔“

”تمہیں پریشانی کیا ہے؟“

”یہ ہے کہ وہ کبھی میرے سوٹ سلواتی ہے۔ کبھی جیب میں ہزار دو ہزار رکھ دیتی ہے۔ تم سے بات کچی ہوگی تو مجھے شرمندگی ہوگی۔“

”شرمندگی کوئی نہیں ہوگی۔ تم حساب جوڑ کر رکھو“ اس نے آج تک تم پر کیا خرچ کیا ہے“ اسے سود سمیت لوٹا دیتا۔“

اس نے پرل کانٹنی نینٹل کے احاطے میں کار روک دی۔ اتر کر شائستہ کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ پرس میں سے سو کا نوٹ نکال کر اسے دیتی ہوئی بولی۔ ”جب تک میں نہ کہوں کوٹھی کی طرف نہ جانا“ صرف پندرہ منٹ کے لیے روٹی کھانے جاسکتے ہو۔“

وہ فاروق کے ساتھ اندر جلی گئی۔ بشارت آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سب کچھ دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ ”کیسے کیسے تماشے دیکھنے میں آتے ہیں۔ آخر اس فاروق میں ایسی کیا بات ہے کہ دونوں ہنوں میں رسا کشی ہو رہی ہے۔ میں چھ فٹ کا باڈی بلڈر ہوں۔ مجھے تو یہ دونوں ایسے دیکھتی ہیں، جیسے کچرے کو دیکھ رہی ہوں۔ صرف اس لیے کہ میں ڈرائیور ہوں۔ تنخواہ پانے والا نوکر ہوں۔ معاشی مسائل نے ہم جیسے جوانوں کو دو کوڑی کا بنا دیا ہے۔“

معاشی مسئلہ تو فاروق کے ساتھ بھی تھا لیکن جو چالاک ہوتے ہیں بلکہ مکار ہوتے ہیں، وہ بے روزگاری اور محتاجی کا حل ڈھونڈ لیتے ہیں۔ مختلف اوقات میں مختلف امیرزادیوں سے فلرٹ کرتے ہیں اور ان سے جیب خرچ اور ماہانہ اخراجات وصول کرتے رہتے ہیں۔ وہ اس طرح دیکھتے دیکھتے ایک دم سے گھبرا گیا۔ تقریباً چار ماہ بعد پھر اسی طرح آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ روشنی بجھ گئی تھی۔ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ کار کو ٹٹولتے ہوئے اسٹیرنگ سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ اسے کلام پاک کی جو آیتیں یاد تھیں۔ انہیں جلدی جلدی پڑھنے لگا۔ گڑگڑا کر دعائیں مانگنے لگا۔ ”یا اللہ! مجھ سے جو گناہ ہوئے ہیں، ان کی معافی دے دے۔ میں بھولی بھالی بیٹو کو برباد کر کے آیا ہوں۔ اس کی اتنی بڑی سزا نہ دے۔ بینائی ملے گی تو میں پنڈ جاکر اس سے شادی کر لوں گا۔ یہاں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ پیٹرول چوری نہیں کروں گا۔“

یہ اندیشہ تھا کہ شائستہ واپس آئے گی اور اس کے اندھے پن کو دیکھے گی تو کیا

ہوگا؟ یہی کہ ہمدردی کرے گی تو زیادہ سے زیادہ اسپتال پہنچا دے گی۔ لیکن ملازمت چلی جائے گی۔ دعا قبول ہوگی اور پھر بینائی واپس آئے گی تو بھی ملازمت واپس نہیں ملے گی۔ جو اچانک ہی اندھا ہو جاتا ہو، اسے گاڑی چلانے کی ذمہ داری کوئی احمق بھی نہیں دے گا۔

ہوٹل کے ملازم نے آکر کہا۔ ”مسٹر! گاڑی پارکنگ میں لے جاؤ۔ پیچھے آنے والی گاڑی کو جگہ دو۔“

اس نے ملازم کی طرف سر نہیں اٹھایا۔ اٹھاتا تو وہ نظر نہ آتا۔ اس نے پریشان ہو کر کہا۔ ”یار! میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ میں گاڑی نہیں چلا سکوں گا۔ خدا کے لیے کسی بندے سے کہو۔ وہ یہ گاڑی پارکنگ میں پہنچا دے گا۔“

ملازم کسی کو پکڑ لایا۔ بشارت سے بولا۔ ”ادھر ہو جاؤ۔ یہ باؤ تمہاری گاڑی پہنچا دے گا۔“

وہ ایک طرف ہٹ گیا کسی شخص نے اسٹیرنگ سیٹ پر آکر گاڑی ثالث کی پھر اسے ڈرائیو کرتا ہوا کہیں لے جا کر روک دیا۔ پارکنگ ایریا میں ہی روکا ہوگا۔ وہ تو دیکھنے سے معذور تھا۔ اجنبی نے پوچھا۔ ”تمہیں کیا تکلیف ہے؟ کسی قریبی ڈاکٹر کے پاس لے چلو؟“

”تمہارا شکریہ۔ ابھی طبیعت سنبھل جائے گی۔ اپنی مالکن کو کوٹھی پہنچا کر ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا۔“

”میں ادھر سامنے والی بوتیک شاپ میں سیلز مین ہوں۔ زیادہ پریشانی ہو تو مجھے آواز دینا۔ میرا نام امجد حسین ہے۔“

”امجد بھائی! تمہارا بے حد شکریہ۔ ضرورت ہوئی تو ضرور بلاؤں گا۔“

بشارت نے دروازہ کھولنے اور اجنبی کے باہر جانے کی آہٹیں سنیں پھر دروازہ بند ہونے کے آواز سنائی دی۔ جب یقین ہو گیا کہ وہ کار میں اکیلا ہے تو زیر لب کہنے لگا۔ ”جل جلالہ وجل شانہ! میری مالک! تو بڑا جلال والا ہے۔ تو بڑی شان والا ہے۔ میری بینائی لوٹا دینا تیرے لیے معمولی سی بات ہے۔ میں اپنی غلطی مانتا ہوں۔ پانچ چھ برس ہو گئے، میں نے کلام پاک کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ایک سپارہ بھی نہیں پڑھا۔ اب تاریکی میں عقل آ رہی

ہے کہ ہم تیری دی ہوئی بینائی سے کلام پاک کی مقدس آیتوں کو کیوں نہیں دیکھتے، انہیں آنکھوں سے لگا کر کیوں نہیں چومتے۔ ابھی بینائی واپس آ جائے گی تو میں کوارٹر میں جا کر غسل کروں گا اور کلام پاک کی تلاوت کروں گا۔“ انسان کی عجیب فطرت ہے۔ وہ دوسرے انسان کے کیے ہوئے احسان کو بھولے بھٹکے یاد کر لیتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے احسانات کو دنیا داری میں یکسر بھول جاتا ہے۔ مصائب کے وقت بھی ماں باپ، بھائی دوست کو پکارتا ہے، ان سے مدد مانگتا ہے۔ لیکن کوئی ایسی مصیبت نازل ہو جائے جو خدا کی قدرت سے ہی دور ہو سکتی ہو، تب خدا یاد آتا ہے۔ وہ نہایت عاجزی سے گڑگڑا رہا تھا۔ وعدے کر رہا تھا کہ آئندہ ایک نیک اور عبادت گزار بندہ بن کر رہے گا۔

اس نے دعائیں مانگتے ہوئے ایک ذرا سی آنکھ کھولی تو کچھ نظر آنے لگا۔ خوشی سے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا سا آیا۔ اس نے پوری طرح آنکھیں کھول کر دیکھا۔ کار کے اندر اور باہر دنیا اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ دکھائی دے رہی تھی۔

سب کچھ نظر آتا ہو تو کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ دنیا بچھ سکتی ہے۔ وہ تھوڑی دیر پہلے زندہ تھا مگر جیسے قبر کی تاریکی میں تھا۔ نہ جانے ناپیدان لوگ کس طرح قبر کی سی تاریکیوں میں زندگی گزارتے ہیں اور بڑے حوصلوں سے جیتے ہیں۔ وہ تو ذرا سی دیر کے لیے گھبرا گیا تھا۔

اس نے کئی بار سوچا تھا کہ کسی آئی اسپیشلسٹ سے آنکھوں کا معائنہ کرائے گا لیکن دنیا اتنی صاف نظر آتی تھی کہ پچھلا اندھا پن محض ایک حادثہ یا ڈراؤنا خواب سا لگتا تھا اور وہ سوچتا تھا کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ ہر گزری ہوئی مصیبت لوٹ کر آنے والی نہیں ہوتی۔ مگر کسی دن بھی لوٹ آتی ہے۔ لاہور آنے کے چار ماہ بعد یہ مصیبت واپس آئی تھی۔ اب وہ سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ کسی ڈاکٹر سے رجوع نہ کیا تو کسی دن یہ اندھا پن مستقل ہو جائے گا۔ پھر بڑا آدمی بننا تو دور کی بات ہے، اسے موجودہ ملازمت سے اور اس شہر سے دودھ کی مکھی کی طرح نکل جانا ہوگا۔

شائستہ تین گھنٹے کے بعد فاروق کے ساتھ واپس آئی۔ پھر اسے فاروق کے گھر چلنے کا حکم دیا۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔ فاروق کو اتار کر شائستہ نے کہا۔ ”کوٹھی چلو۔“ اس نے گاڑی موڑ لی۔ شائستہ نے اس سے پوچھا۔ ”تم نے کیا دیکھا؟“

وہ بولا۔ ”بی بی جی! میں ڈرائیور ہوں۔ صرف سامنے دیکھتا ہوں۔“

”لیکن پیچھے کی باتیں سننے ہو۔“

”آپ دونوں تمام وقت انگریزی بولتے رہے۔ میرا سننا نہ سننا برابر رہا۔“

”میں تمہیں اپنے مقصد کے لیے ساتھ لائی تھی۔ وہاں شازیہ تملتا رہی ہوگی۔ تم

اسے بتاؤ گے کہ میں فاروق کے ساتھ پرل گئی تھی۔“

”بی بی جی! وہ مجھ سے کچھ پوچھتی نہیں ہیں۔ میں خواہ مخواہ یہ بات کہوں گا تو وہ مجھے غصہ دکھائیں گی۔“

”یہی میں چاہتی ہوں کہ اسے زیادہ سے زیادہ غصہ آئے۔“

”کیا آپ کا ان سے جھگڑا چل رہا ہے؟“

”مجھ سے کوئی سوال نہ کیا کرو۔ جتنا کہا ہے، اتنا ہی کرو۔“

پھر اس نے سو روپے کا ایک نوٹ اسے کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا۔ ”یہ شازیہ کی گالیاں سننے کی فیس ہے۔“

کار کو ٹھی کے احاطے میں داخل ہوئی پھر پورچ میں آکر رک گئی۔ اس نے اتر کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ شائستہ ایک شان بے نیازی سے باہر نکلی، برآمدے کی سیڑھی چڑھ کر کوٹھی کے اندر پہنچی۔ ڈرائنگ روم میں ماں سے سامنا ہوا ماں نے پوچھا۔ ”چھوٹی بہن کی کار لے جا کر تمہارا کلبجہ ٹھنڈا ہو گیا؟“

وہ بولی۔ ”مجھے سوئمنگ کے لیے پرل جانا ضروری تھا۔“

”اس سے زیادہ ضروری یونیورسٹی ہے۔ وہ کبھی پڑھائی کا نائفہ نہیں کرتی ہے۔“

”پڑھائی کا نہیں، بوائے فرینڈ سے ملنے کا نائفہ نہیں کرتی ہے۔“

”نکو اس مت کرو۔ تم اسے بدنام کر کے یا اس کی کوئی چیز چھین کے یا اسے کوئی نقصان پہنچا کے خوش ہوتی ہو۔ تم ایب نارمل ہو۔ میں تمہیں علاج کے لیے کسی سائیکائسٹ کے پاس لے جاؤں گی۔“

”میں بالکل نارمل ہوں اور مجھے کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے۔“

وہ تیزی سے چلتی ہوئی ڈرائنگ روم سے نکل کر کاریڈر میں آئی۔ پھر اپنی خواب گاہ میں پہنچی۔ وہاں شازیہ بیٹھی ہوئی تھی۔ شائستہ اسے دیکھ کر ٹھک گئی پھر چیخ کر بولی۔

”میری اجازت کے بغیر میرے بیدروم میں کیوں آئی ہو؟“

”جہاں میں زبردستی پہنچ جاتی ہوں، وہاں پہنچنے کی اجازت کبھی حاصل نہیں کرتی۔ تمہیں یہ بتانے آئی ہوں کہ فاروق سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ میں نے ایک آدھ بار اس کے سامنے کینٹین میں چائے پی لی تو وہ بڑی بڑی ڈینگیں مارنے لگا ہے۔“

”تم جھوٹ بولتی ہو۔ فاروق کو بڑی بڑی رقصیں دیتی ہو۔“

”میں تمہاری طرح پاگل نہیں ہوں کہ کسی لالچی شخص سے محبت کروں۔ میں ایک ایسے غریب نوجوان سے محبت کرتی ہوں جو بہت پنڈ سم ہے۔ قد آور اور باڈی بلڈر ہے۔ فاروق کی طرح چوہا نہیں ہے۔“

”شائستہ اسے گھور کر دیکھتی ہوئی بولی۔ ”کون ہے وہ؟“

”وہ وہ ہے جسے تم کبھی مجھ سے چھین نہیں سکو گی۔ مجھ سے مقابلہ کرنے اور میری کوئی اہم چیز چھین لینے کے لیے تمہارے دماغ میں جو کیزا کانٹا رہتا ہے وہ آئندہ بھی کانٹا ہی رہے گا۔ تم حسد کی آگ میں جلتی رہو گی۔ لیکن میرے اس محبوب کو کبھی چھین نہیں سکو گی۔“ وہ اٹھ کر جانے لگی۔ شائستہ نے کہا۔ ”میرے سامنے تمہاری اوقات ہی کیا ہے۔ میں معلوم کر کے ہی رہوں گی کہ وہ کبخت کون ہے؟“

شازیہ مسکراتی ہوئی کارڈ رور میں آئی پھر ایک ملازم سے بولی۔ ”بشارت سے کمرے کی گاڑی نکالے، میں باہر جاؤں گی۔“

شائستہ دروازے کے پاس کھڑی سن رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ گھر کے ڈرائیور سے کوئی راز چھپا نہیں رہتا۔ بشارت ضرور جانتا ہو گا کہ یہ شازیہ کس سے چھپ کر ملتی ہے۔

بشارت کو ارڑ میں آکر غسل کر رہا تھا۔ ارادہ تھا کہ اللہ تعالیٰ سے کیا ہوا وعدہ پورا کرے گا نماز کے بعد ایک سپارہ پڑھے گا لیکن بندوں کی تابعداری فرصت نہیں دیتی۔ کوٹھی سے بلادا آگیا کہ شازیہ بی بی باہر جائیں گی۔ گاڑی نکالو۔

اس نے جلدی سے بدن خشک کیا۔ لباس پہنا۔ پھر گاڑی لا کر پورچ میں کھڑی کر دی۔ وہ کوٹھی سے نکل کر آئی اور پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس نے گاڑی اشارت کر کے آگے بڑھائی۔ پھر احاطے سے نکلنے کے بعد پوچھا۔ ”کہاں چلوں؟“

وہ بھڑک کر بولی۔ ”جنم میں۔“

”لیکن مجھے تو راستہ معلوم نہیں ہے۔“

”وہاٹ۔“ وہ چیخ کر بولی۔ ”اگر راستہ معلوم ہوتا تو مجھے جنم میں لے جاتے۔“

”میں نے صرف یہ کہا ہے کہ جہاں آپ جانا چاہتی ہیں، وہاں کا راستہ معلوم نہیں ہے۔“

”زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ بس چلتے رہو۔ بڑی ایریا سے نہ گزرو۔“

وہ تھوڑی دیر تک خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ پھر بولا۔ ”صبح میں نے آپ کے لیے گاڑی نکالی تھی۔ لیکن بڑی بی بی.....“

وہ بات کاٹ کر بولی۔ ”مجھے پتا ہے۔“

”وہ فاروق صاحب کے ساتھ پرل گئی تھیں۔“

”پتا ہے۔“ وہ گھور کر بشارت کو دیکھنے لگی۔ اس نے بڑی بہن کو جلائے کڑھانے کے لیے کہا تھا کہ وہ ایک غریب نوجوان سے محبت کرتی ہے، جو بہت پنڈ سم، قد آور اور باڈی بلڈر ہے۔ یہ باتیں اس کے لاشعور میں ہوں گی کہ بشارت بالکل دیباہی ہے۔ اس وقت اس نے زبان پر جو آیا وہی کہہ دیا تھا۔ بشارت کو گھورتے خیال آیا۔ ”کیوں نہ شائستہ کو معلوم ہو کہ میں اسی غریب سے محبت کرتی ہوں۔ وہ جنونی ہے، فاروق کو چھوڑ کر اس کے پیچھے پڑ جائے گی۔“

وہ تھوڑی دیر تک اس تدبیر کو دماغ میں پکاتی رہی۔ پھر بولی۔ ”کیا تم بتا سکتے ہو کہ ملازم کس حد تک بھروسے کے قابل ہوتے ہیں؟“

”میں دوسروں کی بات نہیں کہہ سکتا۔ اپنی کہتا ہوں، میں نے کبھی صاحب سے یا بیگم صاحب سے آپ کی مصروفیات کا ذکر نہیں کیا اور بڑی بی بی جی سے تو کبھی سامنا ہی نہیں ہوتا تھا۔ آج پہلی بار وہ اس گاڑی میں آکر بیٹھ گئی تھیں۔“

”اگر میں تمہیں کسی معاملے میں رازداں بناؤں تو؟“

”یہ میرے لیے بڑے فخر کی بات ہوگی۔ میں جان دے کر بھی آپ کا اعتماد قائم رکھوں گا۔“

”کیا میں نے جان دینے کے لیے کہا ہے؟ تم لوگوں سے ذرا پولاٹ ہو کر بولو تو

فلمی مکالمے بولنے لگتے ہو۔“

”سوری بی بی جی۔“

”میں جو کہہ رہی ہوں، اسے غور سے سنو۔ شائستہ تم سے کسی وقت بھی پوچھے گی کہ میرا اصل بوائے فرینڈ کون ہے؟“

”وہ تو فاروق صاحب کے اور آپ کے.....“

”یوش اپ! تم گفتگو کے آداب نہیں جانتے کہ اگلے کی بات پوری ہونے سے پہلے نہیں بولنا چاہیے؟“

”سوری بی بی جی۔“

”کیا سوری سوری لگا رکھی ہے۔ جو کہنا چاہتی ہوں، تمہاری جہالت سے بھول جاتی ہوں اور اب کیا خاک بولوں؟ واپس چلو۔“

”معافی چاہتا ہوں۔ اس بار معاف کر دیں، آئندہ مر بھی جاؤں گا تو نہیں بولوں

گا۔“

”مر جاؤ گے تو کیسے بولو گے؟ تمہاری بات کا کوئی سر پیر ہے؟ کیوں مجھے غصہ دلا

رہے ہو۔“

اسے بہن سے انتقام لینا نہ ہوتا تو وہ فوراً کوٹھی میں واپس جا کر بشارے کو نوکری

سے نکال دیتی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ شائستہ کو بری طرح ذلیل کرے گی۔ وہ بظاہر

نارمل تھی۔ مگر ایک معمولی سی حد تک دماغی مریضہ تھی۔ اس کے باپ نے اسے ایک

معروف ماہر نفسیات کے پاس لے جانا چاہا لیکن وہ ناراض ہو گئی کہ اسے پاگل سمجھا جا رہا

ہے۔ ماہر نفسیات نے ملاقات کا وقت دینے سے پہلے شائستہ کے متعلق چند سوالات کیے

تھے پھر کہا تھا۔ ”بیٹی کو یہ احساس نہ دلائیں کہ وہ ایب نارمل ہے۔ اسے محبت سے سمجھا

کر میرے پاس لائیں۔“

وہ محبت سے سمجھانے پر بھی نہیں گئی۔ باپ نہیں چاہتا تھا کہ وہ خود کو پاگل سمجھے۔

اس لیے بات ٹل گئی۔ شازیہ نے قسم کھالی تھی کہ وہ تک چڑھی بہن کو پاگل بنا کر ہی

چھوڑے گی۔ اس نے بشارت سے کہا۔ ”میں آخری وارنگ دے رہی ہوں۔ اب کوئی

بے تکی بات بولو گے تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“

وہ خاموش رہا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا سن رہے ہو؟“

”جی بی بی جی۔“

”میں نے شائستہ کو یہ بتا دیا ہے کہ فاروق کو میری جوتی بھی نہیں پوچھتی ہے۔“

وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ جوتی کس طرح پوچھا کرتی ہے؟ لیکن وہ آقا زادی سے یہ نہیں

پوچھ سکتا تھا۔ وہ بول رہی تھی۔ ”میں نے فاروق سے بری طرح نفرت ظاہر کی ہے اور

شائستہ سے کہا ہے کہ میں ایک غریب اور خوب رو نو جوان سے محبت کرتی ہوں۔“

اتنا کہہ کر وہ چپ ہوئی۔ وہ بھی چپ رہا۔ اس نے کہا۔ ”تم پوچھ سکتے ہو کہ وہ

جوان کون ہے۔“

”آپ کی اجازت سے پوچھ رہا ہوں، وہ صاحب کون ہے؟“

”تم ہو۔“

اس نے اچانک بریک لگاتے ہوئے گاڑی روک دی۔ نہ روکتا تو دل سینے سے

اچھل کر باہر آ جاتا۔ اس کی کھوپڑی گھوم گئی تھی۔ اس نے کھوپڑی گھما کر شدید حیرانی سے

آقا زادی کو دیکھا وہ گھور کر بولی۔ ”اپنی اوقات میں رہو اور گاڑی چلاؤ۔“

وہ اپنی اوقات میں آکر گاڑی چلانے لگا۔ اس نے کہا۔ ”شائستہ تم سے ضرور

میرے اصل عاشق کا نام اور پتہ پوچھے گی۔ تم پہلے کچھ بتانے سے کترنا، ہچکچانا پھر اپنا نام بتا

دینا۔ کیا تم ایسی ایکٹنگ کر سکو گے؟“

”کرتوں گا بی بی جی! لیکن وہ یقین نہیں کریں گی۔“

”میں جس طرح کہہ رہی ہوں، اسی طرح کرتے رہو گے تو اسے یقین آ جائے

گا۔“

اس نے پرس میں سے اپنی ایک تصویر نکالی۔ اس کی پشت پر اپنے دستخط کیے پھر

تصویر بڑھا کر بولی۔ ”اسے اپنے پاس رکھو۔ اسے کو گے کہ میں نے یہ تصویر تمہیں یادگار

کے طور پر دی ہے۔“

”اس طرح آپ بدنام ہو جائیں گی۔“

اس نے سوچ رکھا تھا کہ بات بڑھے گی تو می پیا سے کہہ دے گی کہ تصویر پرس

سے کار میں گر گئی ہوگی۔ اسے بشارت اٹھا کر سکیڈل بنا رہا ہے۔ وہ بولی۔ ”میری بدنامی

کی فکر نہ کرو۔ تمہاری کوئی تصویر ہے؟“

”جی ہاں کوآرٹریس ہے۔“

”میں کوٹھی پہنچ کر دس منٹ بعد تمہیں کسی کام سے بلاؤں گی۔ تم اپنی تصویر کی پشت پر لکھ کر لاؤ گے ”ودھ لو“ اپنے دستخط بھی کرو گے۔ کیا اتنی انگریزی لکھ لو گے؟“

”جی ہاں لکھ لوں گا۔“

وہ کوٹھی کی طرف واپس جاتے ہوئے اچھی طرح سمجھاتی رہی کہ اسے کس طرح باتیں بتانا کر شائستہ کو اس کے ساتھ رومانس کا یقین دلانا چاہیے۔ اس نے کہا۔ ”ایک بات یاد رکھو۔ پہلے وہ تمہیں ملازمت سے نکال دینے کی دھمکی دے گی۔ تم ڈرتے بھی رہو گے اور مجبوریاں بھی ظاہر کرتے رہو گے۔ پھر وہ تمہیں بڑی بڑی رقموں کا لالچ دے گی۔ بتاؤ ایسے وقت کیا کرو گے؟“

”میں بڑی بی بی جی سے ایک پیسہ نہیں لوں گا۔“

”ایک پیسہ نہیں لو گے لیکن ایک ہزار اور دس ہزار روپے تو لو گے۔ کیا میں یقین کر لوں کہ تم لالچی نہیں ہو؟“

”میں اپنے عمل سے یقین دلاؤں گا۔“

”اس کے بعد جانتے ہو وہ کیا کرے گی؟“

”میں کیسے جان سکتا ہوں۔ آپ بتائیں۔“

”وہ تم سے عشق شروع کر دے گی۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں ایک معمولی ڈرائیور ہوں۔“

”وہ مجھے چوٹ دینے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔ تم اسے دلدل میں بھی بلاؤ گے“

تو وہ چلی آئے گی۔ میری بات سمجھ رہے ہوں نا؟“

”جی سمجھ رہا ہوں۔“

”کیا سمجھ رہے ہو؟“

”یہی کہ جب وہ عشق شروع کر دیں تو میں کسی دلدل میں جا کر انہیں بلاؤں گا۔“

”یو ایڈیٹ! تم سے اچھے تو گدھے ہیں۔ دلدل کا مطلب ہے گناہ۔ وہ ایب نارمل ہے۔ اب مجھے ایب نارمل کا مطلب سمجھانا ہو گا۔ یوں سمجھو اس کی ذہنی رو بہک جاتی

ہے۔ وہ سب سے برتر رہنا چاہتی ہے۔ چونکہ میں اس سے ہر معاملے میں برابر ہوں بلکہ یونیورسٹی میں اس سے برتر ہوں اس لیے وہ دوسرے معاملات میں مجھے کمتر بنانے کی کوششیں کرتی رہتی ہے۔ میں پچاس ہزار کی جیولری خریدتی ہوں تو وہ بیبا سے ضد کر کے لاکھ روپے کی جیولری لے آتی ہے۔ مجھے فاروق جیسے کنگے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے اسے آزمانے کے لیے عشق کا ٹانک کیا تو وہ اس کنگے کو مجھ سے چھین رہی ہے۔ اب دیکھتے جاؤ، اگر میری تمام باتوں پر عمل کرتے رہو گے تو وہ تم پر مہربان ہونے لگے گی۔“

”بی بی جی! میری ملازمت کا کیا بنے گا؟“

”عجیب احمق ہو۔ ایک امیر زادی سے عشق کرو گے، وہ تمہیں ملازمت چھوڑ کر

جانے نہیں دے گی۔ پھر تمہیں اندیشہ کیا ہے؟“

”جی۔ آپ کی باتیں میری سمجھ میں آرہی ہیں۔ میں آپ کے ہر حکم کی تعمیل

کروں گا۔“

اس نے کوٹھی پہنچ کر حکم کی تعمیل کی۔ اپنی ایک اچھی سی تصویر کے پیچھے لکھا

”ودھ لو“ پھر اپنے دستخط کیے۔ دس منٹ کے بعد شازیہ نے اسے اپنے کمرے میں بلایا۔

وہ اس کی تصویر لے کر تکیے کے نیچے چھپاتی ہوئی بولی۔ ”یہ اچھا موقع ہے۔ می اور بیبا

کیس گئے ہیں۔ شائستہ اپنے کمرے میں ہے آؤ ذرا ڈراما پلے کریں۔“

اس نے مختصراً سمجھایا کہ اسے کیا کرنا اور کتنا چاہیے پھر اپنے کمرے کے دروازے

کو ذرا سا کھول کر ہنسنے لگی۔ سامنے شائستہ کا کمرہ تھا۔ وہ شازیہ کی ہنسی کو سن کر چونک

گئی۔ فوراً ہی خیال آیا کہ کوئی سہیلی ہے۔ ورنہ دیوانی تو نہیں ہے کہ اکیلے کمرے میں

ہنسنے لگی پھر اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ ایک مردانہ ہنسی سنائی دی تھی۔ وہ فوراً ہی اٹھ

کر دروازے کے پاس آئی۔ اسے کھول کر دیکھا۔ سامنے شازیہ کے بیڈروم کا دروازہ ذرا

سا کھلا ہوا تھا۔

وہ دبے قدموں چلتی ہوئی اس دروازے کے پاس آئی۔ بشارت کی آواز سنائی دی۔

”بی بی جی! اب میں چلتا ہوں۔“

شازیہ کی آواز سنائی دی۔ ”میں نے کتنی بار کہا ہے، تمہاری بی بی جی نہیں

شازیہ کہا کرو۔“

”ٹھیک ہے، میری شازیہ کموں گا۔ اپنی جان شازیہ کموں گا۔ لیکن ڈر لگتا ہے صاحب آجائیں گے۔“

”ہاں۔ مئی اور پلایا کسی وقت بھی آسکتے ہیں۔ لیکن تم سے شکایت ہے، میں رقم دیتی ہوں تو تم لینے سے انکار کر دیتے ہو۔“

”شازیہ! غریب کے پاس غیرت ہی ساری پونجی ہوتی ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ آپ مجھے بڑی بڑی رقمیں لینے پر مجبور کریں گی تو ملازمت چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ دل پر پتھر رکھ لوں گا اور دور ہی دور سے چھپ چھپ کر آپ کو دیکھتا رہوں گا اور جیتا رہوں گا۔“

”ہائے بے حد غیرت مند بھی ہو اور بے حد رومانٹک بھی۔ میں تمہارے سامنے ہار جاتی ہوں۔ چلو میں باہر تک چلتی ہوں۔“

وہ دونوں پوری طرح دروازہ کھول کر کوریڈور میں آتے ہی ٹھٹک گئے۔ وہاں شائستہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے کھڑی تھی۔ غرا کر بولی۔ ”اچھا تو یہ بے حیائی ہو رہی ہے اس گھر میں؟ دو کوڑی کے ملازم سے عشق فرما رہی ہو۔“

شازیہ نے کہا۔ ”بشارت! تم جاؤ۔ اسے بکنے دو۔“

”یہ جائے گا کہاں؟ پلایا آتے ہی اسے جوتے مار کر نکالیں گے اور تیرے جیسی بے حیا کا گھر سے نکلنا بند کر دیں گے۔“

بشارت گھبرایا ہوا تھا۔ شازیہ نے کہا۔ ”تم پریشان کیوں ہوتے ہو؟ کوئی تمہیں یہاں سے نہیں نکالے گا۔ تم نے سنا نہیں، یہ پلایا کو میرا باپ کہہ رہی ہے جبکہ وہ ہم دونوں کے باپ ہیں۔ یہ پاگل ہے، تم جاؤ۔“

وہ جانے لگا۔ شائستہ نے کہا۔ ”تم مجھے پاگل کہہ رہی ہو؟ ہاؤ ڈیریو سے دس! میں تمہارا منہ نوج لوں گی۔“

”تم مجھے ہاتھ لگا کر دیکھو۔ میں اپنے کپڑے پھاڑ کر اپنے جسم پر خراشیں ڈال کر پلایا کے سامنے پیش ہو جاؤں گی۔ انہیں یقین ہو جائے گا کہ تمہارا پاگل پن خطرناک حد تک بڑھ چکا ہے اور اب تم حملے بھی کرنے لگی ہو۔“

وہ مٹھیاں بھیجنے کر سوچنے لگی۔ ”یہ کبخت ایسا کر سکتی ہے۔ اس کا باپ مجھے کئی بار ماہر نفسیات کے پاس چلنے کو کہہ چکا ہے۔ مجھے ذرا صبر کرنا چاہیے۔ پھر میرے پاس ثبوت بھی نہیں ہے کہ یہ ایک ڈرائیور کے ساتھ منہ کالا کر رہی تھی۔ مجھے دانشمندی سے کام لے کر پہلے ثبوت حاصل کرنا چاہیے۔“

وہ پاؤں پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں گئی پھر زوردار آواز کے ساتھ دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ شازیہ مسکرا رہی تھی، کچھ سوچ رہی تھی۔ پھر وہ اپنے والدین کے بیڈروم میں آئی۔ اسے معلوم تھا کہ فیملی اہم کہاں رکھی رہتی ہے۔ اس نے اہم کو اٹھا کر کھولا۔ اس میں ماں باپ، بھائی اور بہنوں کے علاوہ قریبی عزیزوں کی تصاویر تھیں۔ اس کی تصویر کی وہ کاپی بھی تھی جس کی پشت پر اس نے دستخط کیے تھے اور تصویر بشارت کو دی تھی۔ اس نے وہ تصویر اہم سے نکال لی پھر اہم کو اس کی جگہ رکھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔

شائستہ اپنے کمرے میں ٹل رہی تھی۔ کبھی اٹھ رہی تھی۔ کبھی بیٹھ رہی تھی۔ شازیہ نے جب فاروق سے نفرت ظاہر کی تھی اور کہا تھا کہ وہ ایک غریب نوجوان سے محبت کرتی ہے تو شائستہ کو یقین نہیں آیا تھا اور اب آنکھوں سے دیکھ کر بھی حیرانی ہو رہی تھی کہ وہ ایک معمولی ملازم سے عشق کر رہی ہے۔

یہ بھی یاد آیا کہ اس نے غریب عاشق کے مقابلے میں فاروق کو چوہا کہا تھا۔ دیکھا جائے تو واقعی بشارت قد آور گھبرو جوان تھا۔ شائستہ نے دل میں تسلیم کیا کہ فاروق اس کے سامنے سکڑا ہوا سا لگتا ہے۔ یہ بھی تسلیم کیا کہ اس نے شازیہ کو مات دینے اور فاروق کو چھیننے میں جلدی کی تھی۔ آج اس پر پرل میں ڈیڑھ ہزار خرچ کیے اور دو ہزار جیب خرچ کے لیے دیے۔

وہ پھر اٹھ کر ٹٹلنے لگی۔ یہ بات چھ رہی تھی کہ شازیہ کو ایک غیرت مند عاشق ملا ہے۔ جو اس سے ایک روپیہ بھی نہیں لیتا ہے۔ ٹھیک ہے کہ وہ ڈرائیور ہے مگر محنت کی کھاتا ہے۔ فاروق کی طرح لڑکیوں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر بھیک نہیں لیتا ہے۔

وہ غصے میں چلتی ہوئی موبائل فون کے پاس آئی، نمبر ملایا۔ پھر انتظار کرنے لگی۔ دوسری طرف گھنٹی بج رہی ہوگی۔ پھر فاروق کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو، ہیلو کون ہے؟“

اس نے پوچھا۔ ”تم کون ہو؟“

”ارے شائستہ میں نے تمہاری آواز پہچان لی اور تم اپنے فاروق کو.....“

وہ چیخ پڑی۔ ”یوشٹ اپ بلڈی کرمل ڈاگ! آئندہ کبھی میرا نام زبان پر نہ لانا۔ کبھی میرے قریب سے نہ گزرتا۔ ورنہ جانتے ہو، میرے باپ کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ تمہیں سچ چوراہے پر لٹا لٹکا دیں گے۔ تھو ہے تم پر۔“

یہ کہہ کر اس نے فون آف کر کے بستر پر پھینک دیا۔ اب اس کے دماغ میں یہ دھن سا گئی تھی کہ شازیہ اور بشارت کے عشق کا ٹھوس ثبوت حاصل کرے۔ یہ جانتی تھی کہ شازیہ چالاک ہے۔ کسی دباؤ میں نہیں آئے گی لیکن بشارت پر زور چل سکتا ہے۔ زر سے اور زور سے وہ بندہ قابو میں آ سکتا ہے۔

وہ بستر کے سرے پر بیٹھ کر سوچنے لگی۔ ”ابھی وہ کوارٹر میں ہو گا۔ میرا وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔ اپنے کمرے میں بلاؤں گی تو شازیہ اپنے عاشق کو یہاں نہیں آنے دے گی۔ اسے کہیں باہر لے جانا ہو گا۔ لیکن اسے باہر لے جانے کے لیے کل صبح کا انتظار کرنا ہو گا۔ رات ہونے والی ہے۔ مئی پاپا شام کے بعد کہیں جانے کی اجازت نہیں دیتے۔“

اس کے اندر ایسی کھلبلی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ اگلی صبح کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد پھر بستر سے فون کو اٹھایا۔ نمبر ملایا، جلد ہی رابطہ ہو گیا۔ وہ بولی۔ ”ہیلو صفیہ! میں بول رہی ہوں۔“

”ہیلو شائستہ! کیسی ہو؟ کیا کر رہی ہو؟“

”بور ہو رہی ہوں۔ آؤٹنگ کو جی چاہتا ہے۔ مگر شام کے بعد گھر سے باہر جانے کی اجازت نہیں ملتی ہے۔ یار کوئی تدبیر کرو۔ اس پنجرے سے نکالو۔“

”ہوں! اگر میں دو چار سیلیوں کو لے کر آ جاؤں تو باہر جانے کی اجازت ملے گی؟“

”مل سکتی ہے لیکن یہ پوچھا جائے گا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں، کوئی اچھا سا بہانہ سوچو۔“

”سوچنا کیا ہے کہہ دیں گے کہ رضوانہ کے ہاں گٹ ٹوگید رہے۔ ساری سیلیاں جمع ہو رہی ہیں۔“

”یہ ٹھیک ہے۔ ایک منٹ بعد ٹیکسی میں آؤ۔ اپنی کار نہ لانا۔ پاپا سے کہنا کار درکشاپ میں ہے تاکہ میں اپنی کار لے جا سکوں۔ اوکے گڈ بائی۔“

اس نے فون آف کر کے رکھا۔ اپنے پرس میں سے پچاس کا ایک نوٹ نکال کر باہر آئی اور ملازم سے کہا۔ ”گاہے کو بلاؤ۔“ ملازم اسے بلائے گیا، وہ باغیچہ میں ٹھلنے لگی۔ گاہے نے آکر اسے سلام کیا۔ وہ بولی۔ ”میری چند سیلیاں آرہی ہیں۔ میں ان کے ساتھ باہر جاؤں گی۔ تم بوڑھے ہو، رات کو ہمارے ساتھ کہاں جاؤ گے۔ صاحب جانے کو کہیں تو اپنے بھتیجے کو ہمارے ساتھ بھیج دیتا۔“

”آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن صاحب ناراض ہوں گے۔“

”تم کسی بیماری کا بہانہ کر سکتے ہو۔ یہ پچاس روپے رکھو۔ ابھی کہیں چلے جاؤ۔ چوکیدار سے کہتے جاؤ کہ تمہارے پیٹ میں درد ہے۔ ڈاکٹر کے پاس جا رہے ہو..... اور خبردار! تین گھنٹے سے پہلے واپس نہ آنا۔“

وہ سلام کر کے کوارٹر میں آیا۔ بشارت سے بولا۔ ”بھتیجے! یہ چکر کیا ہے؟ شائستہ بی بی کہیں باہر جانے والی ہیں۔ مجھے ڈاکٹر کے پاس جانے کو کہہ رہی ہیں تاکہ میں نہ ہوں تو صاحب اسے تیرے ساتھ جانے کی اجازت دیں۔“

بشارت سمجھ گیا کہ ڈراما کامیاب رہا ہے۔ اس نے کہا۔ ”چاچا! آپ تو کوٹھی والوں کو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ شائستہ کا کسی سے کوئی چکر ہو گا اور وہ آپ کو بزرگ سمجھ کر چھپا رہی ہے۔ مجھے ساتھ لے جانا چاہتی ہے۔“

گاہے بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ بشارت سمجھ رہا تھا کہ پہلے پہل شامت آئے گی۔ تھوڑی دیر پہلے کوٹھی میں شامت آہی گئی تھی۔ شائستہ نے اسے نکال دینے کی دھمکی دی تھی۔ وہی دھمکی دینے والی اب اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ یعنی بہن سے لڑائی کے پینترے بدل رہی تھی۔

وہ شام ہی سے سوچ رہا تھا کہ دونوں بہنوں کے درمیان جو جنگ ہو رہی ہے، اس میں وہ پس جائے گا یا سلامت رہے گا؟ ہر پہلو سے سوچنے کے بعد یہی سمجھ میں آیا کہ دونوں کی طرف سے کافی رقم ملتی رہا کرے گی۔ انجام کار شائستہ اسے شازیہ سے چھین لینے کے لیے لاکھوں روپے داؤ پر لگا سکتی ہے۔ اسے ایک ٹیکسی خرید کر دے سکتی ہے پھر اتنی رقم ہو جائے گی کہ وہ کسی مٹکے ڈاکٹر سے آنکھوں کا علاج کرا سکے۔

بڑا آدمی بننے کے لیے ایسے شارٹ کٹ مواقع کم نصیب ہوتے ہیں۔ وہ اس موقع

سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ رات کے آٹھ بجے کو ٹھی سے بلاوا آیا۔ وہ گیراج سے کار نکال کر لے آیا۔ شائستہ اپنی دو سیلیوں کے ساتھ ہنستی ہوئی کوٹھی سے باہر آئی، اور ان کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اسے مال روڈ چلنے کا حکم دیا گیا تھا۔ وہ خاموشی سے کار ڈرائیو کرنے لگا۔ شائستہ سیلیوں سے باتیں کر رہی تھی اور چور نظروں سے بشارت کو دیکھتی جا رہی تھی۔ پھر وہ سب ایک جگہ اتر کر آکس کریم کی دکان میں چلی گئیں۔ وہ کار کے پاس گھٹنے بھر تک کھڑا رہا۔ پھر وہ باہر آکر سیلیوں سے بولی۔ ”مال روڈ پر سٹا ہے، پیدل چلنے میں مزہ آئے گا۔ یہ پیچھے پیچھے گاڑی لے آئے گا۔“

وہ تینوں پیدل چلنے لگیں۔ بشارت آہستہ آہستہ کار چلاتا رہا۔ انہوں نے آدھے گھنٹے بعد ایک جگہ رک کر دی بھلے کھائے۔ ٹھنڈی بوتلیں پیں۔ پھر کار میں آکر بیٹھ گئیں۔ وہ بولی۔ ”ہائے میں تو تھک گئی۔ تمہیں گھر چھوڑتی ہوئی واپس جاؤں گی۔“ وہ بشارت سے بولی۔ ”اے، اقبال ٹاؤن چلو۔“

وہ کار اشارت کر کے تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا اقبال ٹاؤن پہنچا۔ وہاں ایک کوٹھی میں اس کی سیلیوں کو اتارا۔ پھر واپسی کے لیے مڑ گیا۔ وہ بولی۔ ”گاڑی آہستہ چلاؤ، واپسی کی جلدی نہیں ہے۔“

اس نے رفتار سست کر دی۔ شائستہ نے پوچھا۔ ”تم دونوں کا پریم کب سے چل رہا ہے؟“

”کیا آپ مجھ سے پوچھ رہی ہیں؟“

”یوٹان منس، کیا یہاں کوئی تیسرا بھی ہے؟“

وہ خاموش رہا۔ وہ سخت لہجے میں بولی۔ ”جواب دو۔“

”آپ کے سامنے کیا زبان کھولوں۔ یہ دل کا معاملہ ہے۔ کب شروع ہوا تاریخ یاد

نہیں ہے اور یہ کہاں جا کر ختم ہو گا۔ انتہا معلوم نہیں ہے۔“

”کیا تم اپنی اوقات بھول گئے ہو؟“

”میں نہیں بھولا۔ میں تو زمین ہوں۔ زمین کبھی اوپر نہیں جاتی۔ آسمان اس پر آکر

جھکتا ہوں۔ شازیہ نے پہل کی۔ اسی نے حوصلہ دیا ہے۔“

”پاپا کو معلوم ہو گا تو تمہیں کتوں سے بچاؤ دیں گے۔“

”میں نے جان ہتھیلی پر رکھنے کے بعد دل لگایا ہے۔“

”سچے عاشق ہو تو اس سے شادی کر کے دکھاؤ۔“

”میں نے محبت کی ہے۔ شادی کروں گا تو ایک ڈرائیو کی بیوی بن کر وہ سوسائٹی

کی نظروں سے گر جائے گی۔ میں اسے کسی کی نظروں سے گرنے نہیں دوں گا۔“

اس کی یہ باتیں سن کر شائستہ کے دل پر چوٹ سی لگی۔ ایک پرانا زخم تازہ ہو گیا۔

وہ ناگواری سے بولی۔ ”تم یونہی باتیں بنا رہے ہو وہ تمہیں بڑی رقمیں دیتی ہوگی۔“

”میں فاروق نہیں ہوں۔“

”قیمتی تحفے دیتی ہوگی۔“

”میں نے یادگار کے طور پر صرف ایک تحفہ لیا ہے اور وہ تحفہ ہے اس کی

تصویر۔“

”تم جھوٹ بولتے ہو۔ کیا اس کی تصویر دکھا سکتے ہو؟“

اس نے جیب سے شازیہ کی تصویر نکال کر اسے دی پھر کہا۔ ”میں نے بھی اپنی

ایک تصویر اسے دی ہے۔ کہتی ہے کہ رات کو تکیے کے نیچے اسے رکھ کر سوتی ہے اور

مجھے خواب میں دیکھتی ہے۔“

”رفتار بڑھاؤ اور گھر چلو۔“

اس نے رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے وہ تصویر دیکھ لی۔ اب واپس کر

دیں۔“

”واپس نہ کروں تو کیا کرو گے؟“

”میری کیا مجال ہے کہ کچھ کروں۔ آپ سے درخواست کر رہا ہوں۔“

”درخواست پر غور کر رہی ہوں۔ گاڑی اور تیز چلاؤ۔“

وہ طوفانی رفتار سے ڈرائیو کرتا ہوا کوٹھی کے پورچ میں آیا۔ گاڑی رکتے ہی شائستہ

غصے سے دروازہ کھول کر نکلی۔ پھر تیز تیز چلتی ہوئی کوٹھی کے اندر آئی۔ اپنے والدین کے

دروازے پر پہنچ کر دستک دی۔ باپ نے کہا۔ ”آجاؤ۔“ وہ دروازہ کھول کر اندر آئی۔

باپ نے زیرو پاور کا بلب بجھانے سے پہلے ٹیوب لائٹ کو آن کیا۔ پھر جمای لیتے ہوئے

پوچھا۔ ”واپس آگئیں؟ کوئی کام ہے؟“

وہ تصویر بڑھاتی ہوئی بولی۔ ”اسے دیکھیے۔“
 باپ نے تصویر لے کر دیکھی۔ ماں نے بستر سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا ہے؟“
 ”شازیہ کی تصویر ہے۔ لیکن بیٹی اتنی رات کو تصویر کیوں دکھا رہی ہو؟“
 ”آئینہ دکھا رہی ہوں۔ آپ کی لاڈلی اس دو کوڑی کے ڈرائیور سے عشق کرتی ہے۔ میں یہ تصویر بشارت سے چھین کر لائی ہوں۔“

”کیا بکواس کر رہی ہو؟ کیا پھر تمہاری ذہنی رو بہک رہی ہے؟“
 ماں نے کہا۔ ”بیٹی! تجھے کیا ہو جاتا ہے۔ اس ڈرائیور کی اوقات تو دیکھ۔ ہماری عزت کو کہاں لے جا کر جوڑ رہی ہے۔“

”آپ مان لیں کہ بڑے گھروں کی عزت خاک میں ملتے دیر نہیں لگتی۔ ابھی شازیہ اور بشارت کو بلائیں۔ میں آپ کے سامنے ان سے ان کی بے حیائی اگلاؤں گی۔“
 باپ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”بس کرو۔ ایک ملازم کو یہاں بلا کر مجھے ذلیل نہ کرو۔ بیگم! تم جاؤ اور شازیہ کو بلا کر لاؤ۔“

بیگم چلی گئی۔ باپ نے کہا۔ ”دیکھو شائستہ! میں تمہیں جان سے زیادہ سے چاہتا ہوں۔ تمہارا دل رکھنے کے لیے ابھی شازیہ کو بلایا ہے۔ لیکن سورج مغرب سے بھی طلوع ہو گا تو میں یقین نہیں کروں گا کہ شازیہ کبھی اتنا گر سکتی ہے۔“
 ”اور آج میں یقین دلا کر رہوں گی۔“

شازیہ ماں کے ساتھ کمرے میں آئی۔ باپ نے کہا۔ ”شائستہ کا بیان ہے کہ تمہاری یہ تصویر ڈرائیور بشارت کے پاس تھی۔ تم کیا کہتی ہو؟“

شازیہ نے تصویر اپنے ہاتھ میں لی۔ اسے دیکھا پھر کہا۔ ”یہ تقریباً دو برس پرانی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ یہ صرف تین تصویریں تھیں۔ ایک پنڈی والہ خالہ لے گئی تھیں۔ دوسری بڑے ابو لے گئے تھے اور تیسری آپ نے اہم میں لگائی تھی۔ چوتھی کوئی نہیں تھی پھر یہ کہاں سے آگئی؟“

”یہی تو میں پوچھ رہا ہوں۔“
 ”پاپا! پہلے آپ اہم تو دیکھیں۔“
 ماں اہم اٹھا لائی۔ باپ نے کھول کر دیکھا۔ ہر صفحہ پر خاندان والوں کی تصویریں

یہاں تھیں۔ ایک ورق میں ایک تصویر کی جگہ خالی تھی۔ ماں نے کہا۔ ”مجھے اچھی طرح دے، یہاں شازیہ کی یہی تصویر تھی۔“

”تو پھر یہ تصویر یہاں سے نکلی کیسے؟ کس نے نکالی؟“
 شازیہ نے کہا۔ ”ہم میں سے کوئی نکال سکتا ہے۔ ڈرائیور کی اتنی مجال نہیں ہے کہ کمرے میں آئے اور اہم سے میری تصویر نکال کر لے جائے۔“

پھر وہ شائستہ سے بولی۔ ”کیا پھر تم دورہ پڑا ہے۔ کوئی اسکیڈل بنانے سے پہلے پاپا کی عزت کا تو خیال کرو۔“

”عزت کی بچی! میں تیرا منہ نوچ لوں گی۔“
 وہ شازیہ پر جھپٹنا چاہتی تھی۔ باپ نے پکڑ لیا۔ ”یہ کیا جاہلانہ حرکتیں ہیں؟ کیا تمہیں احساس ہے کہ تم پر اہم بیتی جا رہی ہو؟“
 ”کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں نے اہم سے تصویر نکالی ہے اور اس چڑیل کو ڈرائیور کے ساتھ بدنام کر رہی ہوں۔“

باپ نے کہا۔ ”سمجھنے کے لیے اور کیا رہ گیا ہے؟ یہ پاگل پن؟ یہ اسکیڈل لوگوں کے سامنے آئے گا تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔“
 ”میں پاگل نہیں ہوں۔ آپ میرے ساتھ صرف شازیہ کے کمرے میں چلیں۔ میں ایک اور ثبوت پیش کروں گی۔“

وہ باپ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگی۔ سب اس کی راہنمائی میں شازیہ کے کمرے میں پہنچے۔ شائستہ نے کہا۔ ”آپ جانتے ہیں یہ تکیے کے نیچے کیا رکھ کر سوتی ہے؟“
 شازیہ نے کہا۔ ”میرے تکیے کے نیچے بھلا کیا ہو گا۔ اگر تمہیں غیب کا علم ہے تو بتاؤ کیا ہے؟“

شائستہ نے تیزی سے سر ہانے پہنچ کر تکیے کو اٹھایا۔ وہاں بشارت کی تصویر پڑی ہوئی تھی۔ سب نے چونک کر دیکھا۔ شازیہ نے شدید حیرانی سے کہا۔ ”او گاڈ! ایک ڈرائیور کی تصویر میرے بستر کیسے آئی؟“

شائستہ نے کہا۔ ”اس کا جواب تم ہی دو گی؟“
 ”میں تو سوال کروں گی، تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میرے تکیے کے نیچے یہ تصویر

پڑی ہوئی ہے؟“

باپ نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ”یہ اہم سوال ہے۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“
”مجھے خود بشارت نے بتایا تھا کہ یہ اس کی تصویر سرہانے رکھ کر سوتی ہے۔“

شازیہ روتے ہوئے بولی۔ ”اوہ مُمی! اب تو میں شرم سے ڈوب مروں گی۔ اس کمبخت کی تصویر کو اس نے امیرے سرہانے لا کر رکھ دیا ہے۔ مجھے یہ سوچ کر شرم آ رہی ہے کہ میں اس پر سر رکھ کر سو رہی تھی۔“

باپ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا۔ ماں نے سختی سے کہا۔ ”شائستہ! سچ بتاؤ۔ تم نے بشارت کی یہ تصویر کہاں سے حاصل کی؟ اور یہاں کب لا کر رکھی؟“

وہ چیخ کر بولی۔ ”کوئی میری بات کا یقین نہیں کرتا؟ کیا میں جھوٹی ہوں؟“

باپ نے کہا۔ ”جھوٹی ہی نہیں، پاگل بھی ہو، ڈاکٹر نے ہمیں تاکید کی تھی کہ تمہیں ایب نارمل ہونے کا احساس نہ دلایا جائے۔ لیکن پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ تمہیں دماغی امراض کے ماہر کے پاس لے جانا ہی ہو گا۔“

”میں کسی ماہر و ماہر کے پاس نہیں جاؤں گی۔ چیخ چیخ کر کہوں گی کہ پاگل میں نہیں۔ یہ شازیہ پاگل ہے اور مجھے پاگل بنانے کی سازش کر رہی ہے۔“

”خاموش رہو۔ رات کے سنائے میں تمہاری چیخیں دور تک پہنچ رہی ہوں گی۔“
”پلیز، آپ ایک بار بشارت کو یہاں بلائیں اور اسے جوتے ماریں، وہ ساری سچی باتیں اگل دے گا۔“

”کیا مجھے ملازم کے سامنے ذلیل کرنا چاہتی ہو؟“

شازیہ نے کہا۔ ”پاپا! میری بھی یہی التجا ہے۔ آپ شائستہ کی تسلی کے لیے بشارت کو بلا کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیں۔“

اس نے ماں بیٹیوں کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر کہا۔ ”اچھی بات ہے۔ میں اسے بلاتا ہوں۔ لیکن تم میں سے کوئی ڈرائنگ روم میں نہ آنا۔ میں تنہائی میں اس سے باتیں کروں گا۔“

اس نے ڈرائنگ روم میں آکر انٹرکام کے ذریعے گیٹ پر ڈیوٹی دینے والے چوکیدار کو مخاطب کیا۔ ”ڈرائیور بشارت سے کہو، کوٹھی کے اندر فوراً آئے۔“

پھر وہ سر پکڑ کر سوچنے لگا۔ کتنے شرم کی بات ہے کہ ایک ملازم سے اپنے گھریلو معاملے میں بات کروں گا لیکن ایسا کرنا ہی ہو گا۔ ڈاکٹر نے تاکید کی تھی کہ شائستہ کو زیادہ نصیحت نہ دلایا جائے۔ کسی بات پر طیش آئے تو اس کی ہر بات مان کر اس کی دلجوئی کی جائے جب وہ پرسکون اور نارمل ہو جائے تب اسے محبت سے اس کی غلطی کا احساس دلایا جائے۔

وہ اسے نارمل رکھنے کے لیے یہ سب کچھ کر رہا تھا۔ ورنہ یقین تھا کہ ابھی وہ ایب نارمل ہے اور بہن کو خواہ مخواہ بدنام کر رہی ہے۔ کوئی بے ضرر سا جھوٹ بولتی تو اس کی تسلی کے لیے جھوٹ کو سچ مان لیا جاتا۔ لیکن چھوٹی بیٹی کے خلاف اسکینڈل ناقابل برداشت تھا۔ اس لیے اسی وقت جھوٹ اور سچ کا فیصلہ کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

بشارت نے آکر سلام کیا۔ ملک سرفراز نے اسے گھور کر دیکھا۔ پھر تصویر اس کی طرف بدھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ تمہاری تصویر ہے۔ جواب دو، میری کوٹھی میں کیسے آئی؟“
بشارت نے تصویر کو دیکھا پھر کہا۔ ”جناب! اس کے ساتھ ایک خط بھی ہو گا؟“
”خط؟ تم نے اس کے ساتھ خط بھی لکھا تھا؟“

”جی ہاں۔ کل ایک خط لکھ کر لفافے میں یہ تصویر رکھی تھی۔ وہ لفافہ میں نے سوزوکی کار کے ڈیش بورڈ میں رکھا تھا۔ سوچا تھا کسی ڈاک خانے کی طرف سے گزر ہو گا تو پوسٹ کر دوں گا۔ لیکن آج شام کو جنرل پوسٹ آفس کے پاس گاڑی روک کر پوسٹ کرنا چاہا تو ڈیش بورڈ میں لفافہ نہیں تھا۔ میں نے سیٹ کے نیچے ادھر ادھر تلاش کیا۔ مگر وہ نہیں ملا۔ جناب عالی! یہ تصویر یہاں ملی ہے تو لفافہ بھی یہی کہیں ہو گا۔“

”ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈیش بورڈ سے تمہارا لفافہ گم نہیں ہوا بلکہ چرایا گیا ہے۔ یہ تم نے تصویر کے پیچھے کیا لکھا ہے؟“

وہ ذرا ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”جناب! وہ خط میں نے اپنی منگیت کو لکھا تھا۔ تصویر بھی اس کو بھیج رہا تھا۔ اس لیے اس کے پیچھے.....“

”ٹھیک ہے۔ ساری باتیں سمجھ میں آگئی ہیں، تم جاسکتے ہو۔“

وہ جیسے ہی جانے کے لیے پلٹا، شائستہ چیختی چلاتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئی۔ ”کینے! کتے! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تو جھوٹا، حرام خور ہے۔ میں نے ڈیش بورڈ

سے لفافہ نہیں چرایا تھا۔ میں تجھے گولی مار دوں گی۔“

وہ اسے مارنے کے لیے لپک رہی تھی۔ وہ بھاگ کر صاحب کے پیچھے آگیا۔ صاحب نے بیٹی کو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ”میں نے کہا تھا یہاں کوئی نہ آئے۔ تم کیوں آئی ہو، میری عزت کو خاک میں ملائے.....“

بیگم اور شازیہ دروازے پر تھیں۔ بیگم نے کہا۔ ”میں اسے روک رہی تھی مگر یہ زبردستی آئی ہے۔ اس لڑکی نے تو جینا عذاب کر دیا ہے۔“

شائستہ نے چیخ کر کہا۔ ”ہاں، میں نے جینا عذاب کر دیا ہے۔ میں پاگل کی بیٹی ہوں۔ یہ ملک سرفراز کی بیٹی ہے۔ میں پاگل کی بیٹی ہوں بابا! بابا! وہ ادھر سے ادھر لڑکھڑاتی ہوئی تھمتھے لگانے لگی۔ ملک صاحب نے بشارت سے کہا۔ ”تم جاؤ اور خبردارا یہاں کی کوئی بات باہر نہ جائے۔“

وہ سر جھٹکا کر دروازے پر آیا۔ پھر کن انکھیوں سے شازیہ کو دیکھتا ہوا چلا گیا۔ وہ مطمئن تھی۔ زیر لب مسکرا رہی تھی اور بڑی بہن پاگلوں کی طرح کبھی ہنس رہی تھی، کبھی رو رہی تھی۔ اپنے کپڑے پھاڑتا چاہتی تھی۔ ماں باپ دونوں ہی اسے سنبھالنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ جب اسے جکڑ لیا گیا تو وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چیختی لگی۔ باپ نے ڈرائیور کو وارننگ دی تھی کہ گھر کی بات باہر نہ جائے لیکن بیٹی کی چیخیں رات کے سناٹے میں دور تک پھیل رہی تھیں۔

بشارت کو ارڈر کے سامنے آ کر رک گیا۔ گامے کو ارڈر سے باہر آ کر چیخوں کی آوازیں سن رہا تھا۔ دوسرے ملازمین دوڑتے ہوئے کوٹھی کے سامنے والے حصے کی سمت جا رہے تھے۔ گامے نے کہا۔ ”یہ بڑی بی بی جی کی چیخیں ہیں بشارے! تو کوٹھی میں گیا تھا۔ صاحب نے کیوں بلایا تھا؟ تو نے گڑبڑ تو نہیں کی ہے؟“

”کیا کہہ رہے ہو چاچا؟ میری کیا مجال کہ کوٹھی میں جا کر کوئی گڑبڑ کروں۔ تم نے یہ کیسے سوچ لیا؟“

”تو وہاں گیا کیوں تھا؟“

”میں نے ابا کو ایک خط لکھا تھا۔ اس میں اپنی تصویر بھی رکھی تھی۔ وہ خط اور تصویر والا لفافہ گاڑی کے ڈیش بورڈ والے خانے سے غائب ہو گیا۔ میری یہ تصویر کوٹھی

میں کہیں پڑی تھی۔ صاحب نے مجھے دی ہے۔ خط اور لفافہ نہیں ملا۔“

گامے نے تصویر پر ایک نظر ڈالی پھر کہا۔ ”بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ تیری تصویر کوٹھی میں کیسے پہنچ گئی؟“

”سیدھی سی بات ہے۔ بڑی بی بی جی نے لفافہ چرایا تھا۔ پتہ نہیں خط کہاں پھینک دیا۔ شاید صاحب ان پر سختی کر رہے ہیں اسی لیے وہ چیخ رہی ہیں۔“

وہ کو ارڈر میں آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ دل میں بات آرہی تھی کہ یہ اچھا نہیں ہوا۔ ٹھیک ہے کہ وہ ایب نارمل تھی۔ لیکن آج کی سازش نے اسے جنونی بنا دیا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ وہ حکم کا بندہ ہے۔ جیسا چھوٹی صاحب زادی نے حکم دیا، ویسے اس نے تعمیل کی۔ یہ اس کا فرض تھا۔ لیکن یہ بھی فرض تھا کہ بڑی صاحب زادی کو نقصان نہ پہنچائے۔ اس نے نمک حلائی بھی کی تھی اور نمک حرامی بھی کر چکا تھا۔ اگرچہ وہ خود کو تسلی دے رہا تھا کہ اس نے کوئی بڑی غلطی نہیں کی ہے۔ تاہم یہ سچائی اس پر واضح ہو چکی تھی کہ ملازم کی نمک حلائی مالک کو اتنا فائدہ نہیں پہنچاتی، جتنا نمک حرامی نقصان پہنچا دیتی ہے۔

ایک گھنٹے بعد معلوم ہوا کوئی بہت بڑا ڈاکٹر آیا تھا۔ کوٹھی کے اندر کام کرنے والے ایک ملازم نے بتایا۔ بی بی جی کے دیدے پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ پلکیں نہیں جھپک رہی ہے۔ صرف سانس لے رہی ہے۔ دوسرا ملازم دوڑا ہوا آیا پھر بولا۔ ”گامے بھائی! گاڑی نکالو۔ بی بی جی کو ہولی کر اس کے ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے۔“

گامے دوڑنے کے انداز میں چلتا ہوا گیراج کی سمت لپکا۔ بشارت آرام سے لیٹ نہ سکا۔ باہر آ کر دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد کار باہر نکل رہی تھی۔ پچھلی سیٹ پر شائستہ ماں کی گود میں لیٹی ہوئی تھی۔ اگلی سیٹ پر اس کا باپ بیٹھا ہوا تھا۔ جب کار نظروں سے اوجھل ہو گئی تو اس نے کوٹھی کے بیرونی دروازے کی طرف دیکھا، وہاں شازیہ کھڑی ہوئی تھی۔

وہ ٹہلنے کے انداز میں چلتی ہوئی باغ میں آئی۔ وہ بھی آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ آہستگی سے بولا۔ ”بی بی جی! یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔“

”ہوئے دو۔ میں اسے ایسا ہی ایک زبردست شاک پہنچانا چاہتی تھی۔ تم میری توقع

سے زیادہ کام کے آدمی ہو۔ کل یونیورسٹی جاتے وقت تمہیں پانچ ہزار روپے دوں گی۔“
”آپ کی مہربانی ہے۔ ویسے کوئی تشویش کی بات تو نہیں ہے۔“

”وہ دو چار روز میں نارمل ہو جائے گی۔ تمہیں اس کی فکر کیوں ہے؟ اب جاؤ یہاں سے۔“

وہ سر جھکا کر کوارٹر میں آگیا۔ شازیہ نے ناگواری سے پوچھا تھا۔ ”تمہیں اس کی فکر کیوں ہے؟“ یہی بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ اس کے اندر شائستہ کے لیے چھپی چھپی سی ہمدردی کیوں ہے؟ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دماغ میں انسانیت کے تقاضے چھپے ہوتے ہیں اور انسان سمجھ نہیں پاتا۔ اس کے اندر بھی یہ بات پوشیدہ تھی کہ کوئی بھی ایسا نارمل شخص ہمدردی اور توجہ کا مستحق ہوتا ہے۔ اگر اس سے ہمدردی نہ کی جائے تو اسے نقصان بھی نہ پہنچایا جائے۔

پھر شائستہ نے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ صرف اتنا تھا کہ وہ مغرور امیرزادی کے لہجے میں بولتی تھی۔ صدیوں سے دولت مندوں کا یہی لہجہ رہا ہے۔ اس کا انداز کوئی نیا نہیں تھا۔ شازیہ بھی ملازموں سے اسی طرح بولتی تھی۔ اگر اسے ملازمت گراں گزرتی تھی تو وہ چھوڑ کر چلا جاتا۔ اسے توڑ کر نہ رکھ دیتا۔ اس سلسلے میں ایک ہی سچائی تھی کہ شائستہ سے کوئی انتقامی رشتہ نہیں تھا۔ اس نے ایک کرائے کے قاتل کی طرح بڑی رقم حاصل کرنے کے لیے ایسا کیا تھا۔

اس رات نیند آنے سے پہلے اس نے تسلیم کیا کہ اس نے بڑا آدمی بننے کے لیے ایسا کیا ہے۔ کل اسے پانچ ہزار روپے ملیں گے۔ اس نے جو کبار کیا لیکن رقم بری نہیں ہوتی۔ وہ صرف کوٹھی والوں کے لیے ہی نہیں کوارٹر والوں کے لیے بھی ضروری ہوتی ہے۔ دنیا میں بہت کم لوگ ہیں جو ضرورت کے پھندے سے بچ نکلے ہیں۔

☆=====☆

رات گزر گئی۔ دوسری صبح آٹھ بجے اسے ہوش آیا۔ آنکھیں کھولنے سے پہلے اس کے گلابی ہونٹ لرز رہے تھے۔ جیسے کچھ بولنا چاہتی ہو۔ ماں نے نرس سے کہا۔ ”دیکھو یہ حرکت کر رہی ہے۔ ڈاکٹر کو بلاؤ۔“
نرس چلی گئی۔ ماں نے بیٹی کے چہرے پر جھک کر ممتا سے پکارا۔ ”شائستہ میری

جان؟“

اس کے ہونٹ کھل رہے تھے۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ بہت مردہ سی آواز تھی۔

ماں نے کان لگا کر سنا۔ ہلکی سی آواز آرہی تھی۔ ”بشارات۔ بشارات.....“
ماں نے پریشان ہو کر بیٹی کو دیکھا۔ وہ بشارات کو یاد کر رہی تھی یا اسے پکار رہی تھی۔ یا پھر نیم بے ہوشی میں اسے مارنے کے لیے دوڑ رہی تھی۔ پچھلی رات کا واقعہ اس کے ذہن میں پھنس گیا تھا۔

ڈاکٹر آکر اسے چیک کرنے لگا۔ معائنہ کے دوران اس نے آنکھیں کھول دیں۔ پہلے ڈاکٹر کو دیکھا پھر ماں پر نظر پڑتے ہی منہ پھیر لیا۔ ماں نے تڑپ کر پکارا۔ ”بیٹی!“
وہ بولی۔ ”ڈاکٹر! یہ میری ماں نہیں ہے، آپ اسے باہر نکالیں ورنہ ورنہ.....“
ڈاکٹر نے اسے تھپک کر کہا۔ ”آل رائٹ، آل رائٹ۔“ پھر بیگم سے کہا۔ ”میڈم! پلیز آپ باہر جائیں۔“

ماں روٹی ہوئی باہر آئی۔ پھر کاؤنٹر پر آکر فون کا ریسیور اٹھایا۔ کوٹھی کے نمبر ڈائل کیے۔ چند سیکنڈ میں ملک سرفراز خان سے رابطہ ہو گیا۔ اس نے پوچھا۔ ”شائستہ کیسی ہے؟ کیا ہوش آگیا؟“

”ہاں، ابھی ہوش میں آئی ہے۔ مجھ سے اظہار نفرت کر رہی ہے، کہتی ہے میں اس کی ماں نہیں ہوں۔“

”میں بھی ابھی آ رہا ہوں۔ اس کی بات دل پر نہ لو۔ وہ غصے میں یونہی کہتی ہے۔“
بیگم ریسیور رکھ کر وہیں کھڑی رہی۔ سوچتی رہی۔ پچھلی رات وہ بے ہوش ہونے سے پہلے جنونی انداز میں چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ ”ملک سرفراز خان کی بیٹی نہیں ہوں۔ تم میرے پاپا نہیں ہو۔ میرا باپ کوئی اور ہے۔“

اور یہ سن کر بیگم کا کلیجہ کانپ گیا تھا۔ اس بات میں کتنی صداقت تھی؟ کیا وہ غصے اور جنون میں کہہ رہی تھی؟ ملک صاحب یہی سمجھ رہے تھے لیکن پیدا کرنے والی ماں کے پاس حساب تھا۔ اس لیے وہ پریشان ہو گئی تھی۔ اس کے ہوش میں آنے تک دل کو تسلیاں دے رہی تھی کہ ایسا محض جھنجھلا کر کہہ رہی ہے لیکن اب ہوش میں آکر اس نے نفرت سے منہ پھیرا اور کمرے سے نکل جانے کو کہا تو شبہ یقین میں بدل گیا کہ بیٹی بہت

کچھ نہ سہی، کچھ نہ کچھ ماں کے متعلق جانتی ہے۔ پتہ نہیں کیسے جانتی ہے؟ اور شاید انہی معلومات کی وجہ سے وہ ایب نارمل رہتی ہے۔

ملک صاحب نے آکر کہا۔ ”آؤ بیٹی کے پاس چلیں۔“

وہ ذرا ہچکچائی پھر بولی۔ ”پہلے ڈاکٹر سے اس کی ذہنی حالت معلوم کرنا چاہیے۔“

وہ ڈاکٹر کے چیمبر میں آئے۔ اس نے کہا۔ ”وہ بظاہر نارمل ہے مگر کچھ پریشان سی لگتی ہے جیسے کوئی بات اس کے اندر جڑ پکڑ چکی ہو۔ کیا آپ نے کسی ماہر نفسیات کو دکھایا ہے؟“

”وہ کسی ماہر نفسیات کے پاس نہیں جانا چاہتی۔ ویسے میں نے سائیکا ٹرسٹ سے اس کا کیس ڈکس کیا تھا۔ اس نے مشورہ دیا تھا اسے ایب نارمل ہونے کا احساس نہ دلایا جائے۔ تب سے ہم اس کے احساسات اور جذبات کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ اسے ناراض نہیں ہونے دیتے۔“

”وہ آپ لوگوں سے ملنا کیوں نہیں چاہتی؟“

”بھلا ماں باپ سے کیوں نہیں ملے گی؟ محض غصے میں ایسا کہہ رہی ہے۔“

”نہیں مسٹر! ابھی میں کہہ چکا ہوں۔ وہ نارمل ہے غصے میں نہیں ہے۔ پورے ہوش و حواس میں یہ کہہ رہی تھی کہ ماں باپ اور بہن بھائی کو کمرے میں نہ آنے دیا جائے۔“

ملک صاحب نے حیرانی سے بیگم کو دیکھا۔ بیگم نے رونے کا موقع پا کر دوپٹے میں منہ چھپا لیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”پریشانی کی بات نہیں ہے۔ ہم اسے سمجھائیں گے، فی الحال آپ شام تک اس سے دور رہیں۔“

وہ دونوں ویٹنگ روم میں آکر بیٹھ گئے۔ ملک صاحب نے کہا۔ ”ہسپتال آکر بیٹی کو دیکھے بغیر جانا اچھا نہیں لگتا اور شام تک یہاں بیٹھے بھی نہیں رہ سکتے۔“

”میں تو بیٹھی رہوں گی۔ اسے دیکھے بغیر کچھ کھایا پیا نہیں جائے گا۔“

”یوں جذباتی ہونے سے تم بھی بیمار ہو جاؤ گی۔ مجھے تو مل بھی جانا ہو گا، جاپان کی ایک پارٹی آرہی ہے کروڑوں کی ڈیلنگ ہونے والی ہے۔“

”آپ کی کاروباری مجبوری ہے، آپ کو جانا چاہیے۔“

ملک صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں مل پہنچتے ہی بیٹے کو یہاں بھیج دوں گا۔ تم وعدہ کرو یہاں بھوکی پیاسی نہیں رہو گی۔“

اس نے وعدہ کیا پھر شوہر کے جاتے ہی اطمینان کی سانس لی۔ وہ یہی چاہتی تھی کہ میاں صاحب کی عدم موجودگی میں بیٹی سے باتیں کرے اور باتوں ہی باتوں میں معلوم کرے کہ وہ کیا کچھ جانتی ہے؟

بیگم نے کاؤنٹر سے ایک پرچی اور قلم مانگ کر لکھا۔ ”میری جان سے پیاری بیٹی، مجھ سے ملنے سے انکار نہ کرو۔ میری ممٹا کا خیال کرو۔ میں اپنے دودھ کا واسطہ دیتی ہوں مجھ سے دو باتیں کر لو۔ میں بالکل تنہا آؤں گی۔ تمہاری بد نصیب ماں۔“

وہ پرچی تہہ کر کے شائستہ کے کمرے کے پاس آئی پھر ایک وارڈ بوائے کو پانچ کا نوٹ اور پرچی دے کر کہا۔ ”یہ اٹھارہ نمبر کے کمرے کی مرلیضہ کو دو اور جواب لاؤ۔“ وارڈ بوائے نے کمرے میں آکر پرچی دی۔ شائستہ نے اسے پڑھا۔ کچھ سوچا۔ پھر کہا۔ ”وہ میری ممی ہیں آنے دو۔“

وارڈ بوائے چلا گیا۔ تھوڑی سی دیر میں ماں آگئی۔ دروازے کو بند کرتے ہوئے اور روتے ہوئے بولی۔ ”آج تو میں آدمی مر چکی ہوں۔ میری جان! تم مجھ سے نفرت کیوں کر رہی ہو؟“

وہ بستر پر آکر بیٹی سے لپٹ گئی۔ وہ بے حس و حرکت پڑی رہی۔ اپنا ایک ہاتھ بھی تسلی کے لیے ماں پر نہیں رکھا۔ اسے تھوڑی دیر رونے دیا۔ ماں خود ہی الگ ہو کر اپنے آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔ ”بیٹی! تجھے کوئی دکھ ہے تو بتا۔ میں برسوں سے پوچھتی آرہی ہوں۔ مگر تو غصہ دکھاتی ہے۔ الٹی سیدھی حرکتیں کرتی ہے۔ اس طرح تجھے کیا ملتا ہے؟“

وہ خاموش رہی۔ ماں نے سر سلاتے ہوئے پوچھا۔ ”میری چندا رانی! ایسا کرتے کرتے آج ہسپتال پہنچ گئی ہے۔ آخر تجھے کیا حاصل ہو رہا ہے؟“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ”سکون حاصل ہو رہی ہے۔“

”کیا گھر سے زیادہ سکون ہسپتال میں ہے؟“

”ہاں، اور ہسپتال سے زیادہ سکون قبرستان میں ہے۔ وہاں کوئی ملاقاتی نہیں آتا۔“

”کیوں ایسی باتیں کرتی ہے۔ آخر میں کیا کروں کہ تو ہمیشہ خوش رہے۔ تیرے پیٹ

بھی تجھے خوش رکھنے کے لیے سوچتے سوچتے تھک گئے ہیں۔“

”میرے کوئی پاپا نہیں ہیں۔“

”تو ایسا کیوں کہتی ہے؟“

”کیا غلط کہتی ہوں؟“

ماں چند ساعتوں تک سانس لینا بھول گئی۔ پھر لمبی سانس کھینچ کر بولی۔ ”کل تک بہن کو بدنام کرتی رہی۔ کیا اب ماں پر بھی الزام لگائے گی؟“

”ہاں“ میں الزام لگاتی ہوں کیونکہ میں ایب نارمل ہوں۔ ہماری دنیا میں سچ بولنے والوں کو پہلے مجذوب کہا جاتا تھا۔ آج ایب نارمل کہا جاتا ہے۔ جب میں جذبہ کے عالم میں سچ بولتی ہوں تو یہ سچ زہر بن کر ہمارے پورے خاندان کی رگوں میں دوڑنے لگتا ہے۔“

”تجھے ماں کے کردار پر شبہ ہے تو صاف صاف کہہ دے۔“

”میں نہ تو ماں کی گالی سنتی ہوں اور نہ ماں کو گالی دیتی ہوں۔“

”یا اللہ! میں کیا کروں؟ تیرا کہاں علاج کراؤں؟“

”ممی! آپ کو پتا ہے، میں کبھی ماہر نفسیات کے پاس جانے سے کیوں انکار کرتی ہوں؟“

”یہ تیری ضد ہے اور کچھ نہیں۔“

”ضد نہیں، انکار کر کے ایک بیٹی کا فرض ادا کرتی ہوں۔ ماہر نفسیات اندر کی باتیں اگلا لیتے ہیں۔ اگر میرے اندر کی بات باہر آئے گی تو آپ کی اور پاپا کی کیا عزت رہ جائے گی؟“

ماں کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ چہرہ یوں زرد پڑ گیا جیسے بدن کا سارا خون بیٹی نے نچوڑ لیا ہو۔ بڑی دیر تک ماں بیٹی کے درمیان خاموشی رہی پھر ماں نے اس سے منہ پھیر لیا۔ آہستگی سے پوچھا۔ ”تجھے کیسے معلوم ہوا؟“

”میں تیرہ برس کی تھی۔ نانی اماں کے پاس سو رہی تھی۔ پتہ نہیں کتنی رات کو آپ کمرے میں آئیں۔ آپ نے نانی اماں سے کہا۔ ”سرفراز نئی مشینیں لگوانا چاہتے ہیں۔ مل کے پیچھے والی زمین خرید لی ہے۔ کاروبار بڑھتا اور پھیلتا جا رہا ہے۔ اس لیے کم

از کم ایک کروڑ بیس لاکھ کی ضرورت ہے۔“

نانی اماں نے کہا۔ ”میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے۔ جب دیکھو منہ پھاڑ کر مانگنے چلی آتی ہو۔ کیا تمہاری دوسری بہن کو بیاہنا نہیں ہے؟“

”اس کا رشتہ تو ایک مل اونر سے لگ چکا ہے۔ اسے زیادہ دینا دلانا نہیں ہو گا۔ وہ زیادہ سے زیادہ ساٹھ ستر لاکھ کا چیز لے جائے گی۔“

”اگر تو اس ڈرائیور سے منہ کالا نہ کرتی اور شادی سے پہلے شائستہ پیٹ میں نہ آتی تو.....“

”اماں! کچھ تو خیال کرو، وہ ہمیں لیٹی ہے۔“

”یہ سو رہی ہے۔ میں اس کی عادت جانتی ہوں۔ مردوں سے شرط لگا کر سوتی ہے۔

اپنی بات کرو۔ تم جب بھی بڑی رقیب مانگ کر لے جاتی ہو، مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں بلیک میل کی جا رہی ہوں۔ تمہاری اور خاندان کی عزت رکھنے کے لیے جرمانہ بھر رہی ہوں۔“

”اماں! ایسی کوئی بات نہیں ہے اور سرفراز ہمیں بلیک میل نہیں کر رہے ہیں۔ یہ جومل کے اندر ایک اور مل بن رہی ہے اس کا فائدہ مجھے اور میرے بچوں کو ہی پہنچے گا۔“

”درست کہہ رہی ہو۔ مگر بیٹی کو ایک ہی بار دیا جاتا ہے۔ بار بار مانگنے والا داماد

ہڈ حرام اور بے غیرت کہلاتا ہے۔ چونکہ سرفراز ہڈ حرام نہیں ہے، اچھے منافع کے ساتھ مل چلا رہا ہے اس لیے اس بار میں رقم قرض دوں گی۔ کچے کانڈ پر لکھواؤں گی کہ سرفراز

مالانہ ایک لاکھ روپے قسط ادا کرے گا۔“ آپ تھوڑی دیر تک نانی اماں سے بحث کرتی رہیں پھر انہیں راضی کر لیا کہ نئی مشینوں پر کام شروع ہوتے ہی آپ پچاس ہزار روپے

مالانہ ادا کرتی رہیں گی۔ اس کے بعد آپ جانے کے لیے اٹھیں۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، یہ دیکھتی آئی ہوں کہ میری نیند کے دوران آپ آکر میری پیشانی چومتی ہیں۔

ایسے وقت نیند ٹوٹ جاتی تھی۔ میں آنکھ نہیں کھولتی تھی مگر آپ کی ممتا کو محسوس کرتے کرتے سو جاتی تھی۔

”اس رات بھی میں نے آنکھیں بند رکھیں۔ آپ میرے پاس آئیں اور میری پیشانی کو چوم کر چلی گئیں۔ وہ پہلی رات تھی، جب میں نے پیشانی پر ممتا کے ساتھ ملاوٹ بھی محسوس کی۔ تیرہ برس کی عمر کیا ہوتی ہے؟ کچھ بھی تو نہیں۔ کچا ذہن ہوتا ہے۔ میرے

ذہن میں اس وقت ماں کے اچھے برے کردار کی کوئی بات نہیں آئی۔ یہ شاک پنچا کہ ملک سرفراز خان میرے پاپا نہیں ہیں۔ شازیہ اور زبیر کے پاپا ہیں۔ وہ دونوں باپ والے ہیں، میرا کوئی باپ نہیں ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرنے لگا، یہ خیال پختہ ہوتا گیا کہ میں آدمی ہوں۔ صرف ماں والی ہوں، شازی اور زبیر مکمل ہیں۔ پورے ماں باپ والے ہیں۔ میرے اندر سے میری آدمی شخصیت چھن گئی تھی۔ وہ دونوں کوئی چیز خریدتے ہیں تو میں ضد کر کے ان سے دوگنی قیمت کی چیز خریدتی ہوں۔ شازیہ نے پچاس ہزار کے زیورات خریدے تو میں نے جو اب ایک لاکھ کے خرید لیے۔ یوں خود کو مطمئن کرنا چاہا کہ میں ایک لاکھ کی ہوں اور وہ پچاس ہزار کی۔ میں پوری ایک ہوں اور وہ مجھ سے آدمی ہے۔

”جو مکمل نہیں ہوتے، آدمے ہوتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ان کے سامنے والے آدمے سے بھی آدمے ہو جائیں۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ شازیہ اور زبیر میری آنکھوں کے سامنے آدمے رہیں۔ وہ مجھ سے پہلے کوئی چیز پالیتے ہیں تو میں اندر سے تنے لگتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں ہر چیز مجھے پہلے ملے۔ اگر بعد میں ملے تو دوگنی ملے تاکہ دوسرے میرے برابر نہ ہوں۔ لیکن محبوب تو ایک ہی ہوتا ہے۔ شازیہ نے جوانی میں پہلی بار جی کو بوائے فرینڈ بنایا۔ اب میں اسے کتر کرنے کے لیے دو بوائے فرینڈ نہیں بنا سکتی تھی۔ یہ شرمناک حرکت؟ قی حالانکہ ایک بوائے فرینڈ بھی بے شرمی ہے۔ ان حالات میں یہی کر سکتی تھی کہ جی کو اس سے چھین لوں۔ میں نے جی کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا۔ اس نے شازیہ کے مقابلے میں مجھ میں دلچسپی نہیں لی۔ میں نے بے عزتی محسوس کی۔ جو مجھے نہ ملے، وہ شازیہ کو مل جائے، یہ میں برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ جی نے میری طرف مائل نہ ہو کر جو توہین کی تھی اس کا میں نے انتقام لے لیا۔ مل کے ایک ٹرک ڈرائیور کو دس ہزار روپے دیے۔ جی کی تصویر دکھائی۔ اس کا پتہ بتایا پھر اسے حکم دیا۔ اسے ٹرک سے اڑا دو۔ ڈرائیور نے یہی کوشش کی۔ جی تو بچ گیا لیکن ایک ٹانگ سے محروم ہو گیا۔ شازیہ کسی لکڑے سے محبت جاری نہ رکھ سکی۔ اگر وہ لکڑا نہ بھی ہوتا تب بھی آپ اور پاپا اسے داماد نہ بناتے۔ میرے کلبجے میں ٹھنڈک پڑ گئی۔

”ہماری زندگی میں کیا نہیں ہے۔ ملک کے اندر اور باہر کروڑوں کا بینک بیلنس

ہے۔ کوٹھی میں لاکھوں کا ڈیکوریشن ہے۔ بے شمار کاریں اور ٹرکس وغیرہ ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ دو کروڑ کے بہرے جواہرات ہیں۔ مگر ایک باپ نہیں ہے۔ باپ نہ میرے پیدا ہونے سے پہلے تھا، نہ میرے پیدا ہونے کے بعد ہے، نہ میرے مرتے دم تک ہوگا۔ میرے اندر بیٹھ کر اس کرب کو محسوس کرو کہ مجھے دنیا جہان کی دولت دے کر میرے باپ کا نام مجھ سے چھین لیا گیا ہے۔ جب محسوس کر لو تو یہ بھی تسلیم کر لو کہ میں بھی دوسروں سے کچھ نہ کچھ چھین لینے کا حق رکھتی ہوں۔ اگر مجھے یہ حق حاصل نہیں ہے تو مجھے میرا چھیننا ہوا باپ واپس کر دو۔“

اتنا کہہ کر شانتی نے ماں کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے اس طرح پیشانی پر ہاتھ رکھے ہوئے تھی کہ بیٹی سے چہرہ چھپا رہے۔ باتیں ہوتی رہیں اور نظریں نہ ملیں۔ وہ شکستہ لہجے میں بولی۔ ”بیٹی! جو ہو چکا ہے، اسے بھول جانے میں ہم سب کی بھلائی ہے۔“

”ہم سب نہ کہیں، آپ سب کی بھلائی ہے۔ میں تو ٹوٹ پھوٹ گئی ہوں کہ آپ عمر بھر میرے کٹڑے اٹھا اٹھا کر مجھے جوڑتی رہیں گی، تب بھی میں مکمل نہیں ہو پاؤں گی۔“

”ذرا عقل سے سوچ، تو نے رائی کا پہاڑ بنا دیا ہے۔ دنیا میں ایسا ہوتا ہے۔ تیرے ساتھ ایسا ہوا ہے تو کوئی قیامت نہیں ٹوٹ پڑی ہے۔“

وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر بولی۔ ”آپ اپنی اس بات کو یاد رکھیں کہ دنیا میں ایسا ہوتا ہے۔ اسے گرہ میں باندھ لیں۔ ایسا پھر ہوگا۔ پھر میں کہوں گی کہ کوئی قیامت نہیں ٹوٹ پڑی ہے۔“

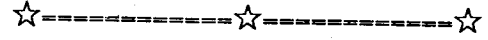
”کیا کوئی الٹی سیدھی حرکت کرے گی؟ کیا ارادہ ہے تیرا؟“

”ارادہ پھر بتاؤں گی۔ ابھی یہ سن لیں کہ چھ ماہ پہلے ثانی اماں کا انتقال ہوا تھا۔ آپ جانتی ہیں کہ ان کے آخری دنوں میں، میں ہی ان کے پاس رہتی تھی۔ میں نے ان سے کہا تھا، ثانی اماں آپ اللہ کے پاس جا رہی ہیں، میرا قرض اتار کر جائیں۔ بتائیں کہ میرا باپ کون ہے؟ آخری وقتوں میں ظالم کو بھی خدا یاد آتا ہے۔ ثانی اماں نے خوف زدہ ہو کر مجھے پوری روداد سنا دی۔“

ماں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”اماں نے تمہیں کیا بتایا ہے؟“

”آپ مجھ سے کیا پوچھتی ہیں؟ اپنا سر جھکائیں کہ سر جھکانے سے اپنے گریبان میں نظر پڑتی ہے۔“

اس نے سر کو جھکایا مگر جھکاتے جھکاتے آنکھیں بند کر لیں۔ اپنے گریبان میں جھانکنا کون پسند کرے گا!



اماں پہلے ہی خلاف تھیں کہ رشیدہ کالج نہیں جائے گی۔ اس پر اماں نے ایک نوجوان ڈرائیور رکھ لیا۔ کہنے لگے۔ ”کوٹھی سے اپنے میکے جاؤ یا شاپنگ کے ارادے سے نکلو، جوان ہر جگہ ملیں گے۔ بوڑھے کون سے پارسا ہوتے ہیں۔ بعض تو نوجوانوں سے زیادہ دل پھینک ہوتے ہیں۔ پھر ڈرائیور تو تابعدار ہوتا ہے۔ نظریں نیچی رکھتا ہے۔ بے بی کو گھر سے کالج لے جائے گا، کالج سے گھر لے آئے گا۔ راستے میں جنگل نہیں پڑتا ہے۔ بھرا پڑا شہر ہے۔ کالج بھی جوان لڑکیوں اور لڑکوں کا جنگل ہے۔ کہاں کہاں پہرا لگاؤ گی؟ اولاد پر اعتماد بھی کرنا چاہیے۔“

”میں پوچھتی ہوں، زیادہ پڑھانے کی ضرورت کیا ہے؟ کیا ہمارے پاس دولت کی کمی ہے؟ میری دونوں بیٹیاں بچی تھیں، تب سے ہی رشتے آرہے ہیں۔“

”میں مانتا ہوں، شادی کے لیے تعلیم ضروری نہیں ہے لاکھوں روپے کا جینز کافی ہے لیکن ہماری برادری کے صرف لڑکے ہی نہیں لڑکیاں بھی انگلینڈ اور امریکا جا کر تعلیم حاصل کر کے آرہی ہیں۔ تم محفلوں اور تقریبات میں جاتی ہو، وہاں تم نے دیکھا کہ لڑکیاں کیسے انگریزوں کی طرح فر فر بولتی ہیں۔ کیا ہماری بیٹیاں ان کا منہ دیکھتی رہیں گی؟“

اماں اپنی بیٹیوں کو برادری میں کسی سے کمتر نہیں دیکھنا چاہتی تھیں اس لیے رشیدہ کالج جانے لگی۔ انگریزی بول چال کے لیے ایک ٹیوٹر بھی رکھ لیا۔ اماں رشیدہ سے اس لیے مطمئن تھیں کہ وہ نہایت خشک طبیعت لڑکی تھی۔ کسی سے ہنستی بولتی نہیں تھی۔ تنہائی پسند تھی۔ کتابیں پڑھتی رہتی تھی یا چپ رہتی تھی۔ خیال تھا کہ یہ لڑکی کسی کو منہ نہیں لگائے گی۔

والدین کی یہ کمزوری ہے کہ وہ اولاد کی کمزوری کو نہیں سمجھ پاتے۔ وہ جوان ہو

جائیں، تب بھی انہیں معصوم سمجھتے ہیں۔ بچے رات کو لیپ جلا کر پڑھتے رہتے ہیں تو وہ خوش ہو جاتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھ پاتے کہ وہ جذبات میں الجھل پیدا کرنے والی کتابیں پڑھ رہے ہیں۔ رشیدہ چپ رہتی تھی، کسی سے بولتی نہیں تھی کیونکہ جاگتی آنکھوں سے کسی گھرو جوان کے خواب دیکھتی رہتی تھی۔ اماں نے ایک آدھ بار اسے مخاطب کیا تو وہ ناگواری سے بولی۔ ”اماں یوں ڈسٹرب نہ کیا کریں۔ میں دل ہی دل میں سبق یاد کرتی ہوں۔ آپ کے ٹوکے سے بھول جاتی ہوں۔“

اماں خوش ہو جاتی تھیں کہ بیٹی علم حاصل کرنے کی لگن میں ہے۔ اکثر خوابوں کی تعبیر دیر سے ملتی ہے۔ مگر ملتی ہے۔ بی اے سینڈ ایئر میں پہنچنے کے بعد وہ گھرو نوجوان آنکھوں کے سامنے آیا۔ وہ دیکھتے ہی ٹھک گئی۔ کالج جانے کے لیے جیسے ہی کوٹھی کے دروازے سے نکلی، اس پر نظر پڑ گئی۔ وہ کار کے پاس صاف ستھرے لباس میں کھڑا تھا۔ کسی تعلیم یافتہ اور بڑے خاندان کا لگتا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کار کے پاس آئی تو دل کو ذرا نہیں پہنچی۔ نوجوان نے اسے سلام کرتے ہوئے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا تھا۔ تب خیال آیا۔ باپ نے پچھلی رات ہی بتا دیا تھا کہ ایک نیا ڈرائیور رکھا گیا ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس بار کسی جوان کو رکھا گیا ہے۔ نصیب کی بات ہے، خواب میں آم دیکھو تو تعبیر میں اٹلی ملتی ہے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ تمام راستے سر اٹھا کر اگلی سیٹ کی طرف نہیں دیکھے گی۔ دل دکھ رہا تھا اور اسے دیکھنا بھی چاہتا تھا۔ وہ چند منٹ تک یونہی بیٹھی رہی پھر سوچنے لگی۔ ”میں نے کوئی جرم تو نہیں کیا ہے۔ سر کیوں جھکاؤں۔ یہ نوکر ہے، میں اسے صرف دیکھ ہی نہیں، گھور بھی سکتی ہوں۔“

اس نے ناگواری سے گھور کر دیکھا۔ وہ ہاف آستین کی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ بازو کی مچھلیاں ابھری ہوئی تھیں۔ ایک طرف کا آدھا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ چہرے پر نکھار اور کشش ہو تو وہ آدھے سے ہی پورا پہچانا جاتا ہے۔ اس نے نظریں جھکالیں، دیکھنے سے دل دھڑکنے لگا تھا۔ یوں تو دل دھڑکتا ہی رہتا ہے مگر اس وقت سینے میں دھڑکن بج رہی تھی۔ یہی حال اس وقت ہوا کرتا تھا جب وہ جذباتی ناول پڑھا کرتی تھی۔ ڈرائیور نے کالج کے کمپاؤنڈ میں گاڑی روکی۔ اس سے پہلے آکر وہ پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا، وہ خود ہی

کھول کر نکلی اور تیزی سے کالج کی عمارت کی سمت جانے لگی۔ پتہ نہیں کیوں اس کا سامنا کرتے ہوئے ہچکچاہٹ سی ہو رہی تھی۔

اس نے پیچھے سے آواز دی۔ ”بی بی جی! گاڑی کس وقت لاؤں؟“ وہ رک گئی۔ پلٹ کر دیکھے بغیر بولی۔ ”دو بجے۔“ پھر تیزی سے قدم بڑھاتی ہوئی عمارت کے اندر آئی اور کلاس میں آکر بیٹھ گئی۔ بیٹھتے ہی کلائی کی گھڑی دیکھی، جیسے دو بجتے والے ہوں۔

کلاس شروع نہیں ہوئی تھی اور جب شروع ہوئی تو پتہ نہ چلا کب ختم ہوئی۔ وہ کلاسیں اینڈ کرتی رہی اور بے اختیار بار بار گھڑی دیکھتی رہی۔ پونے بارہ بجے گھڑی بند ہو گئی۔ اس وقت پتہ نہ چلا۔ جب بار بار پونے بارہ بجے ہی بجتے رہے تو اس نے سوچا۔ آج وقت کیوں نہیں گزر رہا ہے؟ اس نے ناولوں میں پڑھا تھا کہ جب دو دل ملتے ہیں تو وقت ٹھہر جاتا ہے۔ جہاں ہوتا ہے، وہیں جم جاتا ہے اور وقت کی نبض بھی ہوتی ہے، وہ بھی ختم جاتی ہے۔ شاعروں اور ادیبوں نے وقت کو جس طرح روکا تھا، اسی طرح کلائی کی گھڑی رکی ہوئی تھی۔

اس نے آس پاس بیٹھی ہوئی لڑکیوں کو دیکھا۔ کسی کی کلائی میں گھڑی نہیں تھی۔ پروفیسر معاشیات پر لیکچر دے رہا تھا۔ اس نے اس سلسلے میں سوال کیا۔ ”رشیدہ! تم بولو؟“ وہ فوراً اٹھ کر بولی۔ ”سر! کیا وقت ہوا ہے؟“ تمام لڑکے ہنسنے لگے۔ ایک لڑکے نے کہا۔ ”یہی تو وقت ہے۔ گزر گیا تو نہیں آئے گا۔“

دوسرے نے کہا۔ ”سنو گجر کیا لگائے، وقت گزرتا جائے۔“ پروفیسر نے ڈانٹ کر کہا۔ ”خاموش رہو۔“ پھر اس نے رشیدہ سے کہا۔ ”میں نے تم سے سوال کیا ہے اور تم مجھ سے وقت پوچھ رہی ہو۔“ پیچھے سے کسی لڑکی کی آواز آئی۔ ”کسی سے وعدہ ہو گا۔“ ایک لڑکی نے کہا۔ ”گھڑی تو تم نے پن رکھی ہے۔“ ایک لڑکے کی آواز آئی۔ ”گھڑی پورے سولہویں سال میں رک گئی ہے۔“ پروفیسر نے کہا۔ ”رشیدہ! باہر جاؤ اور جب تک دماغ حاضر نہ ہو واپس نہ آنا۔“

وہ نوٹ بک اٹھا کر جانے لگی۔ اس کی چال میں پھل دار شاخوں کی سی چلک تھی۔ ایک لڑکے کی آواز آئی۔ ”کیا وقت کی چال ہے! چلتا ہے کہ لہراتا ہے!“ وہ کلاس سے باہر آگئی۔ دوپٹے سے چہرے اور گردن کا پسینہ پونچھنے لگی۔ دل کیس لگا ہو تو کیسی نادانی ہو جاتی ہے۔ ایک دل ہی ایسا ہے جس کی نادانی کا فوراً دنیا کو پتہ چل جاتا ہے۔ خود کو بعد میں خبر ملتی ہے۔

کالج کے باہر چار لڑکیاں کھڑی آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ ایک کی کلائی میں گھڑی نظر آرہی تھی۔ دور سے وقت نظر نہیں آرہا تھا۔ ویسے تو وقت کسی کو نظر نہیں آتا جبکہ بالکل قریب ہوتا ہے۔ ہر سانس کے ساتھ آتا ہے۔ ہر سانس کے ساتھ جاتا ہے۔ وہ اس لڑکی کے قریب رک گئی تاکہ گھڑی کی سوئیاں نظر آجائیں۔ لیکن وہ ہاتھ نچا کر باتیں کرنے کی عادی تھی۔ رشیدہ کی نظریں اس کے ہاتھ کے ساتھ کبھی اوپر نیچے، کبھی دائیں بائیں ہونے لگیں۔ وہ لڑکی باتیں کرتے کرتے رک گئی پھر رشیدہ سے بولی۔ ”تم مجھے سر ہلا کر کیوں دیکھ رہی ہو؟“

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ”وہ بات یہ ہے کہ میری گھڑی بند ہو گئی ہے۔ میں وقت معلوم کرنا چاہتی ہوں۔“

”تجربہ ہے۔ اتنی سی بات تم پوچھ سکتی تھیں۔ کیا لڑکیوں سے بھی شرماتی ہو؟“ پھر وہ اپنی گھڑی دیکھ کر بولی۔ ”گیارہ بج کر دس..... دس..... دس..... ارے یہ تو بند ہو گئی ہے۔ پتہ نہیں ہم کتنے گھنٹوں سے یہاں کھڑے ہوئے ہیں۔“ رشیدہ وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ سچ ایسا ہی لگ رہا تھا کہ وقت رک گیا ہے۔ وہ ایک درخت کے نیچے آکر کھڑی ہو گئی۔ سوچنے لگی۔ کیا آج شام تک دو نہیں بجیں گے؟ درخت کا سایہ بتا رہا تھا کہ دوپہر ہو چکی ہے۔ شاید سہ پہر ہو رہی ہے۔

بڑے تکلیف دہ انتظار کے بعد گاڑی آگئی۔ گاڑی تو روز ہی آتی تھی۔ وہ آگیا تھا۔ کار سے نکل کر مینار پاکستان کی طرح تن کر کھڑا ہو گیا تھا اور ادھر ادھر دیکھ رہا تھا یا اسے ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی آئی پھر پچھلی سیٹ کا دروازہ خود کھول کر بیٹھنے لگی۔ اس نے چونکتے ہوئے پلٹ کر دیکھا۔ ”اوہ بی بی جی! میں ادھر دیکھ رہا تھا۔ میں شرمندہ ہوں۔ آپ نے صبح جاتے وقت بھی خود ہی دروازہ کھول لیا تھا۔“

وہ اسٹیرنگ سیٹ پر آکر دروازہ بند کر کے گاڑی اشارت کرنے لگا۔ وہ بولی۔ ”تم نے آنے میں دیر کیوں کی؟“

”میں ٹھیک وقت پر دو بجے آیا ہوں۔“ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ وہ کتنا نہیں چاہتی تھی کہ گھڑی رک گئی۔ اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی اہمیت کم ہو جاتی۔ اس نے کہا۔ ”میں نے ایک بجے آنے کو کہا تھا۔“

”آپ نے دو بجے کہا تھا۔“ ”کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟“ ”جی..... جی نہیں۔ وہ..... وہ میرے سننے میں غلطی ہو گئی تھی۔“

وہ خاموش رہی۔ وہ ادب سے بولتا تھا مگر بڑی پاٹ دار آواز تھی۔ وہ آواز دل کے گنبد میں گونجتی ہوئی سی لگتی تھی۔ اس نے پریشان ہو کر سوچا۔ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ ہم ایسے عزت دار اور اونچے خاندان والے ہیں کہ ہاتھ سے کوئی چیز گر جائے تو جھک کر نہیں اٹھاتے۔ ملازم سے اٹھانے کو کہتے ہیں اور ادھر میرا دل جھک رہا ہے۔ اس کا انجام کیا ہوگا؟

وہ کھڑی سے باہر گزرتے ہوئے مناظر کو دیکھنا چاہتی تھی لیکن نظریں ہلک کر اسے دیکھنے لگتی تھیں..... اور دیکھنے سے ایک ڈرائیور کی اوقات نظر آتی تھی۔ وہ کیا تھا؟ کچھ بھی نہیں۔ کوئی نام؟ کوئی مقام؟ کوئی خاندانی پس منظر؟ کوئی اعلیٰ کارکردگی؟ کچھ بھی نہیں۔ کیا دیکھ کر چیز خریدنا چاہیے؟ کیا سوچ کر کسی کو پسند کرنا چاہیے۔ ٹھیک ہے کہ دیکھنے سے اچھا لگتا تھا اور سوچنے میں دل میں سماتا تھا لیکن دیکھنے اور سمجھنے کے اپنے خاندانی اصول اور اپنی سوسائٹی کے اعلیٰ معیار ہوتے ہیں۔ اس نے عزت اور نام کمانے والے ماحول میں پرورش پائی تھی۔ ایک دم ہی نام گنوانے والے ماحول میں نہیں جاسکتی تھی۔ سوچ رہی تھی اور گھبرا رہی تھی۔ وہ گھر آگئی مگر سکون باہر چھوڑ آئی۔ اماں کو صبح سے تشویش تھی کہ جوان بیٹی پہلی بار جوان ڈرائیور کے ساتھ گئی ہے۔ وہ بڑی بے چینی سے واپسی کا انتظار کر رہی تھیں۔ اس کے آتے ہی پہلے چہرے کو دیکھا، آنکھوں کو پڑھنا چاہا، کیس کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی لیکن بیٹی تو جوانی کے پچھلے چار برسوں سے چہرے پر

سجیدگی کا نقاب پڑھائے ہوئے تھی۔ اس کی آنکھیں خلا میں تکتے رہنے کی عادی تھیں اور یوں اپنے اندر جذباتی ناولوں کو چھپائے رکھنے کی کافی پریکٹس کر چکی تھی۔ اس لیے اماں تازہ بہ تازہ جذبوں کو اس کے چہرے اور آنکھوں سے نہ پڑھ سکیں۔

انہوں نے بیٹی سے پوچھا۔ ”وہ ٹھیک وقت پر کالج آگیا تھا؟“

”کون؟“ اس نے پوچھا۔

”میں ڈرائیور کو پوچھ رہی ہوں۔“

”ہاں وہ وقت کا پابند ہے۔“

”اس کا نام کیا ہے؟“

”نام؟“ اس نے اماں کو دیکھ کر کہا۔ ”کل ابا سے اس کا نام پوچھنا بھول گئی۔“

”اس سے پوچھ لیتا تھا۔“

اس نے نوٹ بک میز پر رکھی پھر دوپٹے کو اتار کر بستر پر پھیلتے ہوئے بولی۔ ”مجھے نوکروں سے بولنا اچھا نہیں لگتا۔ پھر نئے ملازم سے پہلے ہی دن سے ریزرو رہنا چاہیے۔ ذرا نرم ہو کر بولو تو تنخواہ سے پہلے ہی ایڈوانس مانگتے لگتے ہیں۔“

اماں خوش ہو گئیں۔ بیٹی کا مزاج ابتدا ہی سے ظاہر تھا کہ سنجیدہ اور مغرور ہے۔ ڈرائیور جوان ہو گا اپنے گھر میں۔ اپنی کوٹھی میں خطرہ نہیں ہے۔

اماں کمرے سے چلی گئیں۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں بستر پر لیٹ گئی۔ اسے بیٹھ کر اور لیٹ کر سوچتے رہنا اچھا لگتا تھا۔ خیالوں کی دنیا بڑی حسین اور آزاد ہوتی ہے۔ وہاں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہوتا۔ جب چاہو محبوب کو کمرے میں بلا لو۔ وہ دن کی روشنی میں ہی سب کے سامنے چلا آتا ہے اور اسے کوئی دیکھ نہیں پاتا۔

اس نے خیالوں میں اس جوان کو شام تک اپنے کمرے میں بند رکھا۔ اماں نے چائے کے لیے بلایا۔ وہ اسے کمرے میں چھوڑ گئی۔ اماں اور چھوٹی بہن کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی پھر اپنی خواب گاہ میں آگئی۔ وہ خوابوں کا شہزادہ موجود تھا۔ اس نے کہا۔ ”تم میرے کمرے سے نہیں جاؤ گے اور میں تمہیں جانے نہیں دوں گی لیکن ایسا کب تک ہوگا؟“

وہ بولا۔ ”جب تک تم ڈرتی رہو گی۔“

”ڈرنے کی بات تو ہے۔ تم ابھی وہاں بیٹھے ہو۔ یہاں تک آؤ گے تو بڑے ہنگامے دوں گے۔ مجھے کالج جانے اور باہر جھانکنے سے روک دیا جائے گا۔“

”تمہارے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر دو۔ رنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو۔“

وہ سوچنے لگی۔ سوچتے سوچتے رات کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ وہ پھر اسے کمرے میں چھوڑ کر کھانا کھانے چلی گئی۔ کوئی ایک گھنٹے بعد آئی۔ اسے دیکھ کر بولی۔ ”تم تو جم کر رہ گئے ہو۔ اب سونے کا وقت ہو گیا ہے۔ جاؤ صبح آجانا۔“

وہ خیال ہی کیا جو اندر سے چلا جائے۔ وہ جم کر بیٹھا رہا۔ وہ بستر پر لیٹ گئی۔ کبھی اس کمرٹ کبھی اس کمرٹ ہونے لگی۔ لیکن جس کمرٹ ہوتی وہ اسی طرف آ کر بیٹھ جاتا تھا اور آنکھوں سے نیند اڑا دیتا تھا۔ ساری رات یہی ہوتا رہا۔ دوسری صبح وہ کالج جاتے وقت کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی اور بار بار اونگھ رہی تھی۔ نیند کے جھونکے آرہے تھے۔ لیکن ابھی تو وہ صبح بچ سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ یہی تو آنکھیں کھلی رکھنے کا وقت تھا۔ مشکل یہ تھی کہ پہلے کبھی ایک رات جاگنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس لیے اب نیند برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے نیند بے لڑنے کی بہت کوششیں کیں لیکن کب آنکھ لگی یہ پتہ ہی نہ چلا۔

اس نے کالج کے کپاؤنڈ میں پہنچ کر گاڑی روکی۔ دروازہ کھول کر باہر آیا۔ پھر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ وہ باہر نہیں آئی۔ اس نے انتظار کیا۔ پھر آواز دی۔ ”بی بی جی۔“

جواب نہ ملا تو اس نے ذرا جھک کر دیکھا۔ پھر چند لمحوں تک دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ پچھلی سیٹ سے ٹیک لگائے سو رہی تھی۔ سانس لیتا ہوا خوابیدہ حسن بڑا ہی رومان پرور تھا۔ اسے اپنے فرض کا احساس تھا ورنہ وہیں کھڑا عمر بھرا سے دیکھتا رہ جاتا۔ اس نے ایک بار پھر آواز دی۔ جب جواب نہ ملا تو دروازے کو آہستگی سے بند کر دیا۔

اس نے اسٹرننگ سیٹ پر بیٹھ کر سوچا۔ کیا کروں؟ یہ اچھا ہے کہ کار کے شیشے کلرڈ ہیں۔ باہر والوں کو اندر کا منظر دکھائی نہیں دیتا ہے۔ ورنہ کالج میں آنے والی لڑکی کو کار میں سوتا دیکھ کر طباء و طالبات کی بھیڑ لگ جاتی۔ وہ کار ڈرائیو کرتا ہوا کپاؤنڈ سے باہر آیا۔

کار کی رفتار دھیمی کی۔ اسے آہستگی سے آواز دی۔ وہ تو جیسے قسم کھا کر سو رہی تھی۔ آنکھیں بند تھیں، کان بھی سننے سے انکاری تھے۔

اسے تشویش ہوئی، کہیں بی بی جی کی طبیعت تو خراب نہیں ہے؟ اس نے ایک کنارے گاڑی روک دی۔ یہاں برائے نام ٹریفک تھا۔ پیدل چلنے والے بھی زیادہ نہ تھے اور جتنے تھے، وہ پاس سے گزرتے ہوئے کار کے اندر ایک خوابیدہ لڑکی کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کار کے رنگین شیشوں کی یہی خوبی تھی کہ پردہ نہیں تھا مگر پردہ داری تھی۔

اس نے اگلی سیٹ سے گھوم کر دیکھا۔ حسن محو خواب تھا۔ دعوت دید دے رہا تھا۔ من و تو کا فرق مٹانے کی تحریک پیدا کر رہا تھا۔ اس نے سوچا، بی بی جی کو بخار تو نہیں ہے؟ کیا ہمو کر دیکھ لوں؟

نیند کے دوران اس کا ایک ہاتھ سیٹ پر تھا اور دوسرا ہاتھ ایک گھٹنے پر رکھا ہوا تھا۔ نیم دراز ہونے کے باعث اس کے پاؤں اگلی سیٹ کے نیچے تک آ گئے تھے۔ اس نے ہموٹے سے پہلے پھر آواز دی۔ ”بی بی جی! آنکھیں کھولیں۔ آپ کو کیا ہوا؟ طبیعت ٹھیک ہے نا؟“

وہ بڑے سکون سے سو رہی تھی جیسے اپنے آرام دہ بستر پر آرام سے لیٹی ہو۔ اس نے جھجکتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ کو ہمو لیا۔ اسے ہموٹے ہی ہاتھ پر ہاتھ تھم گیا۔ اس خوب صورت سے ہاتھ کی چمکانہٹ میں ہلکی ہلکی حرارت تھی۔ بخار نہیں تھا۔ اب تک پڑھے ہوئے ناولوں کی آج آ رہی تھی اور اسے سحرزدہ کر رہی تھی۔

اس نے فوراً ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ شرافت کے تقاضوں کو سب نہیں سمجھتے۔ وہ سمجھنے والوں میں سے تھا۔ وہ اسے مالک کی امانت سمجھتا تھا اور خیانت کرنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ منہ پھیر کر سیدھا اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ادھر دیکھنے سے ایمان ڈگمگاتا تھا۔ اس نے گاڑی اشارت کی۔ پھر تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا کوٹھی کے پورچ میں آ کر رک گیا۔ اس کا مالک ملک جان محمد کوٹھی سے باہر آ رہا تھا۔ اس نے کار سے نکل کر اسے سلام کیا پھر کہا۔ ”جناب! میں بی بی جی کو واپس لے آیا ہوں۔“

”کہاں ہے رشیدہ؟“

”وہ گاڑی میں سو رہی ہیں۔“

”کیا؟ وہ اس وقت سو رہی ہے اور وہ بھی گاڑی میں؟“

اس نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ ملک جان محمد نے جھک کر دیکھا پھر کہا۔ ”اوہ گاڑ! کیا یہ تیار ہے؟“

”پتہ نہیں جناب۔“

”تم نے اسے ہمو کر دیکھا تھا؟“

”کیسے ہمو سکتا ہوں، ایک ادنیٰ نوکر ہوں۔“

”اسے آوازیں دے کر جگا سکتے تھے۔“

اس نے پچھلی سیٹ پر آ کر آواز دی۔ ”بیٹی! تم سو رہی ہو؟ یہ کیا بے تکی نیند ہے؟ رشیدہ! اٹھو بیٹی!“

وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ باپ نے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے بلایا۔ ”رشیدہ اٹھو۔“

وہ ذرا کسمائی پھراؤں اور کہتی ہوئی جیسی بستر پر کروٹ بدلنا چاہتی تھی، بستر والا آرام اور کروٹ کی سہولت نہ ملی تو آنکھ کھل گئی۔ پہلے وہ جھکی جھکی نظروں سے سوچتی رہی پھر یاد آ گیا کہ کار میں بیٹھ کر کالج جا رہی تھی۔ وہ چونک کر سیدھی بیٹھ گئی۔ تب باپ دکھائی دیا۔ ”آ..... آپ؟ میں تو کالج جا رہی تھی۔“

”کیا کالج گئی تھیں؟“

”آں؟..... نہیں، پتا نہیں کب اور کیسے آنکھ لگ گئی۔“

”کیا تم نے خواب اور گولیاں کھائی تھیں؟“

”نہیں ابا! میں صبح پانچ بجے تک جاگتی رہی۔ نیند نہیں آ رہی تھی اس لیے کیمسٹری کی کتاب پڑھ رہی تھی۔“

اس نے کار سے نکل کر ڈرائیو سے پوچھا۔ ”سلامت! کیا اسے کالج تک لے گئے تھے۔“

”جی ہاں جناب! وہاں پہنچ کر میں نے دروازہ کھولا تو پتہ چلا، یہ سو رہی ہیں۔“ سلامت نے پوری روداد سنائی۔ رشیدہ کار سے باہر آئی، اماں بھی آ گئیں۔ انہیں بھی روداد سنائی گئی۔ ملک جان محمد نے سلامت سے کہا۔ ”یہ گاڑی لے جاؤ، میری گاڑی لے

آؤ۔ میں ابھی جاؤں گا۔

پھر ماں باپ اپنی بیٹی کے ساتھ اندر آئے۔ اماں نے کہا۔ ”اسی دن کے لیے کتنی تھی کہ جوان ڈرائیور نہ رکھو۔“

جان محمد نے پوچھا۔ ”سلامت نے کیا کیا ہے؟“

”اس نے کوئی چیز سونگھادی ہوگی۔ ورنہ یہ کبھی بے وقت نہیں سوتی ہے۔“

”بیگم! تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ رشیدہ کو ٹھیک نوبتیں یہاں سے لے گیا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی تھی۔ کالج یہاں سے آدھے گھنٹے میں پہنچا جاتا ہے۔ ٹریفک کی وجہ سے دس پندرہ منٹ زیادہ لگتے ہیں۔ گھڑی دیکھو سوا دس بجے ہیں وہ صبح وقت پر واپس آگیا ہے۔“

رشیدہ نے کہا۔ ”اماں! اسے کیا دشمنی ہے کہ وہ کچھ سونگھا کر مجھے سلا دے گا۔ دشمن ہوتا تو مجھے واپس کیوں لے آیا؟“

جان محمد نے کہا۔ ”وہ نہایت شریف ہے۔ وہ اسے ہاتھ لگا کر جھنجھوڑ کر بیدار کر سکتا تھا مگر کتا ہے کہ وہ نوکر ہے۔ اس لیے بی بی جی کو ہاتھ نہیں لگایا سیدھا یہاں لے آیا۔“

وہ بے قصور ثابت ہوا تو اماں رشیدہ کو باتیں سننے لگیں۔ وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ بستر پر گر پڑی۔ کل سے وہ بے تکی حرکتیں کر رہی تھی۔ کل کلاس میں اس کا مذاق اڑایا گیا۔ آج سوتی ہوئی گئی اور کلاس اٹینڈ کیے بغیر سوتی ہوئی واپس آئی۔ سلامت کی شرافت اور وفاداری نے اس کی عزت رکھ لی ورنہ والدین بیٹی کی پار سائی پر شبہ کرتے۔

سلامت کی ڈیوٹی صبح نوبت سے شام چھ یا سات بجے تک ہوتی تھی۔ اس دوران کوئی کام نہ ہوتا تو وہ آہنی پھانک کے پاس بنے ہوئے کیمین میں بیٹھا رہتا۔ اس وقت بھی جا کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے کئی بار آنکھوں کے سامنے سے خوابیدہ حسین کا منظر ہٹانے کی کوشش کی۔ دوسری طرف دھیان بٹانا چاہا لیکن شعوری کوششوں کے بعد بھی لاشعور پر مسلط رہنے والے خیالوں میں وہ آتی رہی اور تصور میں جھلکتی رہی۔

کوئی اچھی لگے اور دل میں سما جائے تو خوشی ہوتی ہے، وہ پریشان ہو رہا تھا۔ خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ اس کا دل پھیر دے۔ اس نے ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد خاص طور

پر دعا مانگی۔ ”کہ میرے معبود! میں غریب ہوں، مجھے میری اوقات میں رہنے دے۔ وہ بڑے گھر کی بیٹی ہے۔ آسمان اور زمین مل نہیں سکتے۔ وہ کبھی عزت آبرو سے حاصل نہیں ہوگی۔ اور حاصل نہیں ہوگی تو نیت خراب ہوتی رہے گی۔ مجھے بری نیت سے بچائے رکھ میرے مالک! میں تیرا گناہ گار بندہ کھانا نہیں چاہتا۔“

وہ ڈرتا تھا عزت سے اور سوچتا تھا، غریب کے پاس ایک عزت ہی ہوتی ہے۔ اگر وہ بھی نہ رہے تو کچھ نہیں رہ جاتا۔ دوسرے دن کالج جاتے ہوئے رشیدہ نے پچھلی سیٹ سے پوچھا۔ ”تمہارا نام سلامت ہے؟“

”جی بی بی جی!“

”کیا نہیں پتا ہے، تمہاری وجہ سے امی نے مجھے کتنی باتیں سنائی ہیں؟“

”میری وجہ سے؟“

”کیا تم مجھے نیند سے جگا نہیں سکتے تھے۔“

”میں نے کوشش کی تھی۔ آپ کو آوازیں دی تھیں۔“

”ہاتھ پکڑ کر ہلا نہیں سکتے تھے۔“

”میری ایک حد ہے بی بی جی! جب ڈرائیور اگلی سیٹ پر ہو تو مالکن اگلی سیٹ پر نہیں آتی۔ وہ صرف صاحب کے ساتھ بیٹھتی ہے اور ڈرائیور جو کار چلاتا ہے، اسے پچھلی سیٹ کی طرف ہاتھ بھی نہیں بڑھانا چاہیے۔ یہ مالک کو دھوکا دینے والی بات ہوتی ہے۔“

”صرف چھو کر بیدار کرتے تو کون سی دھوکا دہی والی بات ہو جاتی؟“

”پہلی غلطی چھونے سے شروع ہوتی ہے۔ آگے کیا کہوں، آپ مجھ سے زیادہ تعلیم

یافتہ اور سمجھدار ہیں۔“

چھونے کی بات پر رشیدہ نے دونوں ہاتھوں سے نوٹ بک پکڑ کر اپنے دھڑکتے ہوئے سینے پر رکھ لی۔ سلامت نے آگے نہیں کہا تھا مگر رشیدہ کو معلوم تھا چھونے کے بعد پکڑنے کی تحریک پیدا ہوتی ہے اور پکڑنے کے بعد جکڑنے کی ہوس غالب آتی ہے۔ وہ بولی۔ ”اگر میں کیچڑ میں گر پڑوں تو ہاتھ پکڑ کر نہیں اٹھاؤ گے؟“

”اس وقت تہذیب اجازت دے گی۔ آپ کا ہاتھ پکڑنا فرض بن جائے گا۔“

”اگر پھر کسی دن یہاں نیند آجائے تو پھر واپس لے جا کر مجھے باتیں سنواؤ گے؟“

”میں مجبور ہوں۔ مجھے مقررہ وقت کے مطابق آپ کو کالج پہنچا کر کوٹھی واپس پہنچنا ہوتا ہے۔ دیر ہو جائے تو حساب دینا پڑتا ہے کہ میں گاڑی کہاں لے گیا تھا۔ اگر یہ خیال نہ ہوتا تو میں آپ کو سوتا چھوڑ کر گاڑی لاک کر کے چلا جاتا۔ پھر دو بجے آکر کوٹھی پہنچا دیتا۔“

”اس کے سوا اور کوئی عقل کا کام نہیں کر سکتے؟ ہاتھ پکڑ کر جگا نہیں سکتے؟“
”ایسا کرنے کے لیے اگلی سیٹ سے آپ کی طرف ہاتھ بڑھانا ہوگا۔ اپنی حد سے آگے جانا ہوگا۔ ہاں ایک طریقہ ہے۔“

اس نے جلدی سے پوچھا۔ ”وہ کیا؟“
”جب آپ سوئیں گی تو میں پانی لا کر دور سے آپ پر چھڑک دوں گا۔“
وہ غصے سے بھڑک کر بولی۔ ”شٹ اپ! تم احمق ہو اور احمق ہی رہو گے۔“
کالج پہنچ کر وہ انجھی سی رہی۔ اس کی سادگی اور شرافت اچھی بھی لگی اور ناگوار بھی۔ جو چیز طلب کی جائے اور وہ نہ ملے تو اس چیز کی چاہت یا طلب کی ضد بڑھ جاتی ہے۔ وہ کلاس میں بیٹھ کر یہی سوچتی رہی۔ وہ ہاتھ نہیں پکڑے گا۔ کبخت باتوں کے دوران سر گھما کر دیکھتا بھی نہیں ہے۔ اس نے جیسے نہ بھوننے کی قسم کھالی ہے۔ کیا میں احموت ہوں؟ غلاظت کو نہیں بھوتے اور خوشبو کو کوئی بھون نہیں سکتا۔ خوشبو آپ ہی سانسوں میں چلی آتی ہے۔ مجھے آپ ہی ہاتھ بڑھانا ہوگا۔

دو بجے کالج سے واپسی پر وہ کراہ رہی تھی۔ سلامت نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تکلیف ہے بی بی جی؟“
”آہ ہائے کلاس میں میرے ہاتھ پر میز گر پڑی تھی۔ ہائے ہڈی میں درد ہو رہا ہے۔“

”میز کیسے گر پڑی تھی؟“

”تم پولیس والوں کی طرح سوال کرو گے، علاج نہیں کر سکتے؟“

”آپ بتائیں کیا علاج کروں؟“

”یہ قریب ہی میڈیکل اسٹور ہے وہاں سے آئیوڈیکس لے آؤ۔“

اس نے ایک میڈیکل اسٹور کے قریب کار پارک کی۔ رشیدہ نے اسے بیس روپے

دیے۔ وہ لے کر گیا۔ تھوڑی دیر بعد دوا لے آیا۔ دوا کا ٹیوب اور باقی روپے واپس کیے، وہ بولی۔ ”باقی رکھ لو۔“

اس نے کہا۔ ”آپ کی مہربانی۔ میں صرف تنخواہ لیتا ہوں۔“

وہ کار اشارت کرنا چاہتا تھا۔ وہ بولی۔ ”کیا کر رہے ہو؟ میں درد سے مری جا رہی ہوں اور تم منہ پھیر کر گاڑی چلانا چاہتے ہو۔“

”میں اور کیا کروں بی بی جی!“

”میں ایک ہاتھ سے دوا کیسے لگاؤں؟ ہاتھ پکڑو اور دوا لگاؤ۔“

اس نے اپنا ہاتھ پیش کیا۔ وہ بالکل ٹکا ہوں کے سامنے آگیا۔ کل اس نے اس آج دیتے ہوئے ہاتھ کی کشش کو بھوکر محسوس کیا تھا، آج نہیں بھونتا چاہتا تھا مگر فرض کا تقاضا تھا کہ آقا زادی کی تکلیف دور کی جائے۔

اس نے خوب صورت سی ہتھیلی کو تھام لیا۔ وہ بتا رہی تھی کہ ہتھیلی کی پشت پر تکلیف ہو رہی ہے۔ وہ ہاتھ کی چکنی سطح پر مرہم لگانے لگا۔ وہ ہولے ہولے ہائے کر رہی تھی۔ اس نے ذرا دیر مساج کے بعد پوچھا۔ ”بس؟“
”بس نہ کہو۔“

وہ پھر مساج کرنے لگا۔ ایک ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھا اور وہ دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے ہتھیلی پشت ہولے ہولے رگڑ رہا تھا۔ سنا تھا دو چیزوں کے ٹکرانے سے اور ایک دوسرے سے رگڑ کھانے سے چنگاریاں نکلتی ہیں۔ نکلتی ہوں گی، وہ نظر نہیں آرہی تھیں لیکن حرارت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بھی انسان تھا اور ایک مرد تھا۔ وہ بھی حرارت محسوس کر رہا تھا۔ پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے پھر پوچھا۔ ”بس؟“

”درد بے بس ہے۔ میں بس کیسے کہہ دوں؟ کیا تم کچھ محسوس نہیں کر رہے ہو؟“

”جی، میں کیا محسوس کروں؟“

”درد۔ وہ درد جو مجھ میں ہے اور تم میں نہیں ہے۔“

”بی بی جی! ڈاکٹر درد محسوس نہیں کرتا اس کی وجہ سمجھتا ہے اور اس کا علاج بتاتا ہے۔ میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔ مگر سمجھ رہا ہوں اور اس کا علاج بتانا چاہتا ہوں۔“

”جی؟“ وہ خوش ہو گئی۔ ”بتاؤ کیا علاج ہے؟“

”آپ جلد سے جلد شادی کر لیں۔“

اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ سلامت نے بھی گھوم کر گاڑی اشارت کی اور آگے بڑھا دی۔ وہ بولی۔ ”گھر میں کسی سے نہ کہنا مجھے چوٹ آئی ہے۔“

”گھر والوں کو اپنا دکھ درد بتانا چاہیے۔ اچھا ہوا زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ اگر ہڈی ٹوٹ جاتی تو؟“

”تو یہ ہاتھ تمہارے ہاتھوں میں نہ آتا۔ کسی ڈاکٹر کے پاس جاتا۔“

”آپ چاہتی تھیں کہ صرف میرے ہاتھوں میں آئے۔“

وہ خاموش رہی۔ وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔ ”بی بی جی! یہ اچھی بات نہیں ہوگی۔ میں مصیبت میں پڑ جاؤں گا۔“

”میں چاہوں تو مصیبت آسکتی ہے اور میں چاہوں تو مصیبت جاسکتی ہے۔“

”مصیبت تب جائے گی جب آئے گی۔ آپ مصیبت لانے والی باتیں ہی نہ کریں۔“

وہ چپ رہی۔ اسے غصہ آنے لگا کہ ایک معمولی شخص اسے نظر انداز کر رہا ہے۔ کیا ایسے شخص کے سامنے گرنا اچھی بات ہے؟ جس حد تک بات ابھی بڑھی تھی اس کے نتیجے میں تو بین کا احساس ہو رہا تھا۔

اس رات وہ کبھی سوئی رہی۔ کبھی جاگتی رہی۔ وہ خیالوں پر اس شدت سے چھایا رہا کہ پتا ہی نہ چلا کہ وہ سوئی رہی تھی یا سوچتی رہی تھی۔ دوسری صبح اس نے کوشی سے کالج کے راستے میں کہا۔ ”میں تم سے ناراض ہوں؟“

”آپ کی ناراضی سے مجھے تکلیف پہنچے گی۔“

”کیوں پہنچے گی؟ تمہارا کیا تعلق ہے مجھ سے؟“

”وہی تعلق ہے جو ایک امانت کا امین سے ہوتا ہے۔“

”مجھ سے فضول باتیں نہ کرو۔ کیا میں کالی چیلی بد صورت ہوں؟“

”یہ آپ سے کس نے کہہ دیا۔ آپ تو لاکھوں میں ایک ہیں۔“

”پھر مجھ میں کوئی ایسی بیماری ہوگی جو تمہیں لگ جائے گی۔“

”بڑے لوگوں کی بیماری لگ جائے تو غریب زندہ نہیں رہتا۔ محبت آپ کی ذات

تک محدود رہے گی تو رحمت ہے۔ میری ذات تک پہنچے گی تو قیامت آجائے گی۔“

”تم دنیا والوں سے ڈرتے ہو؟“

”صرف خدا سے ڈرتا ہوں۔“

”میں بھی خدا سے ڈرتی ہوں اور اس کے ایک بندے کو چاہتی ہوں۔ کسی کو چاہنا

گناہ نہیں ہے۔ چھوٹے بڑے کی بات نہ کرنا۔ میں اس فرق کو تسلیم نہیں کروں گی۔“

”خدا کے لیے آپ سوچیں۔ آپ کے ابا کو اور برادری والوں کو معلوم ہوگا تو کیا

انجام ہوگا۔“

”ابھی تم نے ایک مرد کی زبان سے کہا ہے کہ تم صرف خدا سے ڈرتے ہو۔“

وہ سوچ میں پڑ گیا، کیا جواب دے۔ کار کمپائونڈ میں داخل ہو کر رک گئی۔ وہ

دروازہ کھول کر کالج کی عمارت میں چلی گئی۔ وہ کشش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ آخر جوان تھا۔

دل کسی پر ضرور مائل ہوتا۔ پہلے ہی رشیدہ اسے مائل کر رہی تھی بلکہ کر چکی تھی۔ وہ

چاہتا تھا کہ وہی حسینہ ملے مگر عمر بھر کے لیے ملے اور یہ تقریباً ناممکن تھا۔

وہ دو بجے پچھلی سیٹ پر آگئی۔ راستے میں بولی۔ ”کہاں رہتے ہو؟“

”مل کے کوارٹرز میں۔ پہلے میں مل کی ایک گاڑی چلاتا تھا۔ صاحب نے میری سادگی

اور دیانت داری سے خوش ہو کر تنخواہ بڑھا دی ہے اور آپ کا ڈرائیو بنا دیا ہے۔“

”میں چاہتی تھی تمہارا گھر دیکھوں مگر وہاں تو سارے مزدور مجھے پہچانتے ہوں

گے۔ تم کوئی دوسرا مکان کیوں نہیں لے لیتے؟“

”مجھ اکیلے کے لیے ایک کمرے کا کوارٹر کافی ہے۔“

”فرض کرو تم اکیلے نہیں، میں بھی ہوں۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“

”تم نادان نہیں ہو۔ سب سمجھتے ہو۔ پچھلی دو راتوں سے نہ سوئی ہوں نہ جاگتی

ہوں۔ تم نے میرا سکون، میری نیندیں چھین لی ہیں، میرے اندر دھواں بھر دیا ہے۔ کسی

دن پھٹ پڑی تو پاگل ہو جاؤں گی۔“

پھر کار کی اسٹیرنگ بکتے بکتے رہ گئی۔ اس نے فوراً ہی کار کو سنبھال لیا۔ رفتار

دمی کر دی کیونکہ اس نے پیچھے سے گردن میں بانیں ڈال دی تھیں اور اس کے چہرے

پر اپنا چہرہ رکھ دیا تھا۔ اسے سانسوں کے موسم گرما میں لا رہی تھی۔ اس نے گاڑی ایک طرف روکی پھر گھبرا کر کہنے لگا۔ ”بی بی جی! مم..... میں آپ کی ہر بات مان لوں گا۔ جیسا کہیں گی ویسا ہی کروں گا۔ آپ آرام سے بیٹھ جائیں۔ ہم دیر سے پہنچیں گے تو بات بگڑ جائے گی۔“

وہ بات بگڑنا نہیں چاہتی تھی۔ دیر سے پہنچنے پر اماں جواب طلب کرتیں۔ آئندہ پھر سلامت کے ساتھ کالج جانا آنا نصیب نہ ہوتا۔ وہ آرام سے بیٹھ گئی۔ سلامت نے کہا۔ ”مجھے کل تک سوچنے کی مہلت دیں۔ یہ کوئی کھیل نہیں ہے کہ ہم کھیل کر گزر جائیں۔“

”تم کل تک ضرور سوچو۔ لیکن یاد رکھو اگر تم نے میری بات نہ مانی تو میں اپنی جان دے دوں گی۔“

”آپ نے یہ عزم کر لیا ہے تو میں بھی آخری بات کہہ دیتا ہوں کہ مرجاؤں گا مگر گناہ نہیں کروں گا۔ آپ مجھے دل و جان سے چاہتی ہیں تو پہلے مجھ سے نکاح پڑھوالیں۔“

”میں راضی ہوں مگر گھر والے جان کے دشمن ہو جائیں گے۔“

”کچھ بھی ہو۔ میں آپ کی بات سے انکار نہیں کر رہا ہوں۔ آپ بھی میرے بتائے ہوئے جائز راستے پر چلیں۔“

کوٹھی آگئی۔ بات ادھوری رہ گئی۔ اس نے اتر کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ رشیدہ نے باہر آ کر دیکھا۔ اماں سرفراز کے ساتھ دروازے پر کھڑی ہوئی تھیں۔ سرفراز ناگواری سے سلامت کو دیکھ رہا تھا۔ پھر رشیدہ کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ہیلو رشیدہ!“

وہ اماں کے پاس آ کر بولی۔ ”ہیلو کیسے ہو؟ ماموں کا کیا حال ہے؟“

”وہی حال ہے۔ میرے ابو اپنی روش نہیں بدلیں گے۔“

”سوئیڈ۔ اچھا میں پیچھے کر کے آتی ہوں۔“

وہ اندر چلی گئی۔ سرفراز نے کہا۔ ”پھوپھی جان! آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔ میں بچپن سے اسے چاہتا ہوں۔ آپ میرے سر پر ہاتھ نہیں رکھیں گی تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔ ابو نے تو پہلے ہی ڈبو دیا ہے۔“

”بیٹے! یہ میری دلی خواہش ہے کہ تجھے داماد بناؤں۔ مگر بھائی جان نے کوٹھے پر ساری دولت لٹا کر تمہیں کنگال بنا دیا ہے۔ ادھر کروڑ پتی اور ارب پتی گھرانوں سے میری دونوں بیٹیوں کے رشتے آرہے ہیں۔ تمہارے پھوپھا ان پر تمہیں ترجیح نہیں دیں گے۔“

”پھوپھا آپ کی بات نہیں ٹالیں گے۔ آپ کوشش تو کریں۔“

”ضرور کروں گی۔ میں تو چاہتی ہوں رشیدہ میرے بھائی کے گھر جائے۔“

وہ باتیں کرتے ہوئے لان پر چلے گئے۔ رشیدہ اپنے کمرے میں اپنے مستقبل کا فیصلہ کر رہی تھی۔ خاندان میں کتنے ہی گھروہ جوان تھے مگر دل آنے کی بات ہے اور دل سلامت پر آیا تھا۔ سرفراز نے کئی بار چاہت کا اظہار کیا تھا لیکن وہ اس کے آئیڈیل کے برعکس تھا۔ کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔ پھر اس کے ابو نفرت سے کہتے تھے۔ ”تمہارے ماموں نے شراب اور جوئے میں دولت لٹا دی۔ جو بچا تھا اسے ایک کوٹھے والی کے نام کر دیا۔ ایسے باپ کے بیٹے کے پاس دولت آجائے تو وہ بھی باپ کے نقش قدم پر چلے گا۔ کبھی کی نظر میری دولت پر ہے، میرا داماد بننا چاہتا ہے۔“

وہ اپنے ابو سے متفق تھی۔ اسی لیے سرفراز سے کتراتے تھی۔ اس رات اس کے کانوں میں سلامت کا فیصلہ گونجتا رہا۔ ”میں آخری بات کہہ دیتا ہوں کہ مرجاؤں گا مگر گناہ نہیں کروں گا۔ آپ مجھے دل و جان سے چاہتی ہیں تو پہلے مجھ سے نکاح پڑھوالیں۔“

نکاح کیسے ہو سکتا تھا۔ ایک ملازم سے تعلق کا علم ہوتے ہی گھر والے یہ ذلت برداشت نہیں کریں گے۔ وہ سلامت کو تو گولی مار ہی دیں گے، اس کی بھی خرابی ہوگی۔ تمام آنے والے اچھے رشتے منہ موڑ لیں گے۔ پھر برادری کے ہی کسی شرابی جواری سے اس کا نکاح پڑھا دیا جائے گا۔

یہ باتیں سمجھ میں آرہی تھیں لیکن جوانی کے تقاضے سمجھنا نہیں چاہتے تھے۔ جذبات شور مچا رہے تھے۔ بدن اسے ہی مانگ رہا تھا۔ دل اسی کے لیے چل رہا تھا اور دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ صبح ہونے تک اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ماں باپ کو اور دولت کو چھوڑ دے گی مگر سلامت کو نہیں چھوڑے گی۔

اس نے دوسرے دن سلامت سے کہا۔ ”تم میری بات مان رہے ہو میں تمہاری مانوں گی۔ لیکن ماں باپ سے چھپ کر نکاح ہو گا۔“

”میں بھی تمام رات سو نہ سکا۔ اسی پہلو سے سوچتا رہا کہ شادی لائل پور میں ممکن نہیں ہے۔ کسی دوسرے شہر میں ہو سکتی ہے۔“

”تم جہاں کو گے میں جاؤں گی۔“

”لاہور میں میری ایک خالہ ہیں۔ اگر میں ایک دن کے لیے چلا جاؤں تو خالہ کو راضی کر کے قاضی وغیرہ کا انتظام کر کے آسکتا ہوں۔“

”تم ابو سے ایک دن کی چھٹی لے کر چلے جاؤ۔ ہم پرسوں یہاں سے جائیں گے۔ میرے پاس جتنے زیورات اور نقد رقم ہے، میں لے آؤں گی۔“

”یہ مناسب نہیں ہے۔ آپ گھر سے کچھ نہ لے جائیں۔“

”دلہن بن کر جاتی تو لاکھوں کا جینز لے جاتی۔ میرے پاس جو ہے، وہی لے جاؤں گی۔ تم اعتراض نہ کرو۔“

وہ دونوں اس سلسلے میں بحث کرتے رہے۔ کالج سے واپسی میں بھی یہی بحث جاری رہی۔ سلامت کو دولت کا لالچ نہیں تھا۔ وہ صرف رشیدہ کو شریک حیات بنانا چاہتا تھا۔ لیکن رشیدہ نے اسے مجبور کر دیا۔ اسے ایک دن کی چھٹی مل گئی۔ وہ دوسرے دن لاہور چلا گیا۔ اس روز رشیدہ ٹیکسی میں کالج جانے کے لیے نکلی مگر پہلے بینک گئی اس کے اکاؤنٹ میں بیس ہزار روپے تھے۔ اس نے تیس ہزار نکالے پھر کالج گئی۔ شام سے سلامت کا انتظار کرنے لگی۔ اس نے کہا تھا۔ شام تک یا رات کے دس گیارہ بجے تک لوٹ آئے گا۔ وہ رات کو ہی آیا۔ اس لیے اسے نظر نہیں آیا۔

اس نے صبح اٹھ کر غسل کیا۔ اماں اور ابو کے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کیا۔ پھر اپنے کمرے میں آکر دروازے کو بند کیا۔ جو زیورات نکال رکھے تھے، انہیں لباس کے اندر چھپایا۔ آدھے گھنٹے بعد ماں نے دستک دے کر کہا۔ ”کالج کا وقت ہو گیا۔ کیا کر رہی ہو؟“

”آ رہی ہوں۔“ وہ باہر آئی۔ ماں باپ کو چھوڑتے ہوئے دل دکھ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا ماں سے پٹ کر روئے۔ لیکن یہ خلاف معمول بات ہوتی۔ اس لیے وہ صرف سلام کر کے کار کی پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔ گاڑی اشارت ہو کر چلنے لگی۔ اماں اور ابا بڑے اعتماد سے بیٹی کو جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے اولاد کے لیے برسوں خون چھوڑا تھا۔ دوسری نے نوماہ تک دیکھے بغیر اس کی چاہت کی تھی۔ موت سے لڑتے

ہوئے اسے جنم دیا تھا۔ اسے دودھ پلایا تھا اور اب تک نمازوں میں اس کی بہتری اور سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی تھی۔

ماں باپ کیا جرم کرتے ہیں، جس کی سزا انہیں اولاد سے ملتی ہے؟ انہیں پیدا کرنے کا جرم؟ انہیں دودھ پلانے کا جرم؟ سانپ کو دودھ پلاؤ وہ نہیں کاٹے گا، اولاد ڈس لیتی ہے۔ اس دنیا میں کسی جرم کے بغیر اگر کسی کو سزا ملتی ہے تو وہ والدین کو اولاد سے ملتی ہے۔

انہوں نے گوجرانوالہ پہنچ کر جنرل پوسٹ آفس کے سامنے کار پارک کر دی۔ رشیدہ نے وہاں سے فون کے ذریعے رابطہ کیا۔ رابطہ ہونے پر ماں کی آواز سنائی دی وہ بولی۔ ”اماں میں ہوں، آپ کی بیٹی رشیدہ۔“

”بیٹی تم کہاں ہو؟ سلامت ابھی تک گاڑی لے کر واپس نہیں آیا ہے۔“

”گاڑی گوجرانوالہ کے جنرل پوسٹ آفس کے سامنے ہے آپ منگوائیں۔“

”کیا کہہ رہی ہو؟ گوجرانوالہ؟ کیا سچ کہہ رہی ہو؟“

”اماں! آپ کو یہ سن کر دکھ ہو گا کہ ابھی میرا نکاح سلامت سے ہونے والا ہے۔“

ماں کی چیخیں سنائی دیں۔ ”نہیں! تم جھوٹ کہہ رہی ہو۔ ماں سے ایسا بے ہودہ مذاق نہ کرو۔ کہہ دو یہ جھوٹ ہے۔ فوراً گھر چلی آؤ۔“

”میں فون پر زیادہ دیر باتیں نہیں کر سکتی۔ میں نے یہ کہنے کے لیے فون کیا ہے کہ جہاں بھی رہوں گی خوش رہوں گی۔ آپ لوگ مجھے تلاش نہ کریں۔“

پھر اس نے کچھ سنے بغیر فون بند کر دیا۔ دوپٹے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ اس نے فون پر ماں کی چیخیں سنی تھیں لیکن تصور میں آنسو اور ماتم دیکھ رہی تھی۔ اب وہ ماں کے لیے جوابا کیا کر سکتی تھی؟ رسی طور پر آنسو ہی بہا سکتی تھی۔ اگرچہ اب بھی واپسی کا راستہ کھلا تھا۔ ماں باپ بھیانک خواب سمجھ کر بھول جاتے اور اسے گلے لگا لیتے۔ لیکن وہ مکان سے نکلا ہوا تیر بن گئی تھی۔ سلامت کے ساتھ چلی گئی۔

کوٹھی میں سناٹا چھا گیا تھا۔ باپ نے سنا تو چکر کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔ ”رشیدہ کی ماں! یہ ہو نہیں سکتا۔ ہماری بیٹی ایسی نہیں تھی۔ یہ خواب ہے۔ ہم غ خواب دیکھ رہے ہیں۔ آنکھ کھلے گی تو وہ ہمارے سامنے ناشتے کی میز پر ہوگی۔“

ملک جان محمد نے ایسا کہتے ہوئے اپنے بازو میں زور سے چٹکی لی تو تکلیف کے احساس سے یقین ہو گیا کہ خواب نہیں ہے، جو پیش آرہا ہے، وہ جیتی جاگتی زندگی کا زہریلا سچ ہے اس کڑوے سچ کو نگلنا ہی ہوگا۔

وہ دونوں ہاتھوں سے سر پر گھونے مارنے لگے۔ بیگم اور چھوٹی بیٹی سعیدہ نے ان کے ہاتھوں کو پکڑ لیا۔ سعیدہ رو رو کر بولی۔ ”ابو! ایک بیٹی نے آپ کے اعتماد کو زبردست دھوکا دیا ہے۔ اب میں اس قابل نہیں رہی کہ آپ کو بیٹی کی زبان سے تسلیاں دوں۔ پھر بھی کہتی ہوں، زیادہ وقت نہیں گزرا ہے۔ اپنی اور خاندان کی عزت بچانے کے لیے انہیں کہیں سے ڈھونڈ لائیں۔“

باپ نے اٹھ کر گرختے ہوئے کہا۔ ”میں خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔ اپنی رائفل لے کر جاؤں گا۔ جہاں نظر آئے گی، اسے گولی مار دوں گا۔ مگر وہ کہاں ملے گی؟“

بیگم نے کہا۔ ”خدا نے چاہا تو مل جائے گی لیکن آپ اس طرح غصہ دکھائیں گے تو دنیا کو اس کے گھر چھوڑنے کی خبر ہو جائے گی۔ ہمیں جہاں تک ممکن ہو، اس بات کو چھپانا کی کوشش کرنا چاہیے۔“

”کیسے چھپے گی یہ بات؟ گھر سے ایک سوئی گم نہیں ہوئی ہے۔ پوری ایک جوان بیٹی غائب ہوئی ہے۔ ہر آنے جانے والا رشتہ دار اسے پوچھے گا۔ ہم کب تک باتیں بنائیں گے۔“

”جب تک ممکن ہو گا اسے راز رکھا جائے گا۔ میں ابھی سعیدہ کو لے کر گوجرانوالہ جاتی ہوں۔ وہاں سے اپنی کار لے کر پنڈی آپا کے پاس چلی جاؤں گی۔ وہ بیوہ ہیں، تمہاری بیٹی ہیں انہیں رازدار بناؤں گی۔ آپ یہاں کہہ سکتے ہیں کہ میں دونوں بیٹیوں کو لے کر گئی ہوں۔“

”ٹھیک ہے چلو۔ میں گوجرانوالہ تک ساتھ چلوں گا۔ میرا دل کتا ہے کہ وہ اس بد معاش کے ساتھ لاہور گئی ہے۔“

ماں بیٹی ایک اٹیچی میں اپنے کپڑے اور ضرورت کی چیزیں رکھنے لگیں۔ جان محمد سر پکڑے بیٹھا ہوا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ”آج میں خود کو بہت تنہا محسوس کر رہا ہوں۔ اگر ایک جوان بیٹا ہوتا تو بہن کو کہیں سے بھی پکڑ کر لے آتا۔ میں اکیلا اسے کہاں تلاش کروں

؟“

بیگم نے کہا۔ ”مجھے سرفراز پر نگے بیٹے جیسا بھروسہ ہے مگر آپ اسے پسند نہیں کرتے ہیں۔ یونہی خدا واسطے کا بیر ہے۔ دیکھیے مجھے آپ کی نیک نامی کو ہر حال میں سلامت رکھنا ہے۔“

اس نے گرج کر کہا۔ ”اس کہنے بد معاش کا نام میرے سامنے نہ لو۔ تم سلامت کو کیوں یاد کر رہی ہو؟“

”کیا پاگل ہو رہے ہیں۔ میں آپ کی نیک نامی کو سلامت رکھنے کی بات کہہ رہی تھی۔ اس بد معاش کو بھی اپنا ہی نام رکھنا تھا۔“

”مجھے ایسا ہی لگتا ہے کہ عزت نہ رہی تو پاگل ہو جاؤں گا یا خودکشی کر لوں گا۔“

”خودکشی کریں آپ کے دشمن۔ آپ میری ایک بات مان لیں۔ ایسے وقت میرا سرفراز آپ کے بہت کام آئے گا۔ وہ رشیدہ کو ڈھونڈ نکالنے کے لیے دن رات ایک کر دے گا۔“

ملک جان محمد سوچنے لگا۔ ”مجھے معلوم ہوتا کہ وہ ڈرائیور کے ساتھ بھاگنے والی ہے تو میں سرفراز سے اس کا نکاح پڑھا دیتا۔ وہ جیسا بھی ہے اپنی برادری کا ہے، ڈرائیور تو نہیں ہے۔“

”آپ کہیں تو میں اسے فون کر کے ابھی بلاتی ہوں۔“

سرفراز کی آواز سنائی دی۔ ”پھوپھی جان! آپ کسے بلا رہی ہیں؟“

وہ دروازے پر کھڑا تھا۔ بیگم نے کہا۔ ”میرے بیٹے کی بڑی لمبی حیات ہے، نام لیتے ہی پہنچ گیا۔“

ملک جان محمد نے کار کی چابی دیتے ہوئے کہا۔ ”سرفراز! میری گاڑی نکالو۔“

وہ چابی لے کر چلا گیا۔ ملک جان محمد نے آہنی الماری کھول کر نوٹوں کی گڈیاں نکالیں۔ ایک چھوٹی اٹیچی میں رکھیں پھر سب باہر آ کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ بیگم نے کہا۔

”بیٹے! ہم پنڈی جا رہے ہیں، چلو گے؟“

”آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ ضرور چلوں گا۔ لیکن رشیدہ کہاں ہے؟“

”تم گاڑی چلاؤ۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا، وہ کہاں ہے۔“

وہ کو بھی کو اچھی طرح متفصل کرنے کے بعد وہاں سے چل پڑے۔ راستے میں بیگم نے سرفراز کو رشیدہ کی روداد سنائی۔ اس نے کہا۔ ”مجھے رشیدہ پر افسوس ہو رہا ہے بہر حال وہ ہمارے گھر کی عزت ہے اس کی ہزار غلطیوں کو معاف کیا جاسکتا ہے لیکن میں اس کیلئے سلامت کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

ملک جان محمد نے کہا۔ ”سرفراز! میں نے کبھی تم سے زیادہ بات نہیں کی۔ آج بھی صرف اتنا کہوں گا کہ ہماری بدنامی سے پہلے رشیدہ کو ڈھونڈ لاؤ گے تو مجھ سے جو انعام مانگو گے، دوں گا اور اس بد معاش کو گولی مار دو گے تو تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا۔“

”پھوپھا جان! آپ انعام و اکرام کی بات کر کے مجھے شرمندہ نہ کریں۔ وہ دونوں زمین کی تہ میں چھپے ہوں گے تب بھی انہیں کھود کر نکال لاؤں گا۔ اس کم ظرف نے ہماری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ میں اسے کتے کی موت ماروں گا۔“

”کوئی بھی کام ہو۔ اتنی رازداری سے کرنا کہ برادری والوں کو بھی یہ سن گن نہ ملے کہ رشیدہ کہاں تھی اور کہاں سے لائی گئی ہے؟“

”وہ کہیں نہیں گئی پھوپھا جی! گھر ہی میں ہے۔ ابھی پھوپھی جان نے کہا ہے کہ خاندان کے ہر فرد سے لے کر ملازموں تک کو یہی معلوم ہو گا کہ رشیدہ پنڈی میں اپنی خالہ کے پاس گئی ہے۔ آپ اطمینان رکھیں۔“

گو جرنالہ پہنچ کر انہیں جرنل پوسٹ آفس کے پاس اپنی کار مل گئی۔ سرفراز نے کہا۔ ”انہوں نے گاڑی سیال چھوڑی ہے اس لیے اس شہر میں رہنے کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔“

بیگم نے کہا۔ ”وہ جہلم یا پنڈی کی طرف بھی نہیں جائیں گے۔ رشیدہ جانتی ہے وہاں ہمارے رشتے دار اور شناسا کافی ہیں، وہ ان کی نظروں میں آسکتی ہے۔“

ملک جان محمد نے کہا۔ ”وہ ضرور لاہور گئے ہیں۔“

”پھوپھا جی! میں لاہور جاؤں گا۔ یہ آپ لوگوں نے اچھا کیا کہ رشیدہ کی تصویریں لے آئے۔ ایک مجھے دے دیں۔“

جان محمد نے اسے ایک تصویر اور بیس ہزار روپے دے کر کہا۔ ”اور جتنی رقم کی ضرورت ہو، مجھے فون کرنا۔ میں لاہور کے ایجنٹ کو کہہ دوں گا، تمہیں مطلوبہ رقمیں ملتی

رہیں گی۔ مل کے دفتر میں ملازموں کے نام پتے اور ان کی تصاویر ہوتی ہیں۔ ان میں سلامت کی تصویر بھی ہوگی۔ میں کل وہ تصویر لے کر لاہور آؤں گا۔ تم آج رات فون پر اپنا پتہ ٹھکانہ بتا دینا۔“

بیگم چھوٹی بیٹی سعیدہ کے ساتھ پنڈی چلی گئیں۔ ملک جان محمد لاکل پور (فیصل آباد) واپس چلے گئے۔ سرفراز ایک کار لے کر لاہور آگیا۔ بھائی گیٹ کا تراب علی پہلوان بچپن کا یار تھا۔ پہلوانی پنپ نہیں رہی تھی اس لیے وہ علاقے کا دادا بن گیا تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے سرفراز کا استقبال کیا۔ ”آؤ یار، آؤ۔ کدھر کو راستہ بھول گئے ہو؟“

”یار تراب! بہت ضروری کام ہے اور وہ کام تو ہی کر سکتا ہے۔“

”پھر یار کے لیے جان حاضر ہے۔ آرام سے منجی پر بیٹھو۔ اوکا کے، دولی پھڑکے لے آ۔ مٹھا زیادہ اور ملائی پوادیں۔“

سرفراز بیٹھ گیا۔ تراب علی سامنے والی منجی پر بیٹھ کر بولا۔ ”ہاں بول میرے یار!“

اس نے کہا۔ ”یہ میرا خاندانی اور گھریلو معاملہ ہے۔ بات میرے اور تیرے درمیان رہے گی؟“

”اویار! بے اعتباری نہ کرو۔ ایک بار آزما کے دیکھو۔“

وہ جھک کر آہستگی سے بولا۔ ”ایک بد معاش ڈرائیور میری پھوپھی کی بیٹی کو بھگا کر لے گیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ لاہور آئے ہیں۔“

”اگر یہاں آئے ہیں تو انہیں چوہے کے بل سے نکال لاؤں گا۔ تم فکر نہ کرو۔ لڑکی کا فوٹو شوٹو ہے؟“

اس نے رشیدہ کی تصویر دکھائی۔ پہلوان نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”اور اس ڈرائیور کا فوٹو؟“

”فی الحال نہیں ہے۔ شاید کل تک اس کی تصویر بھی مل جائے۔ اس کا نام سلامت ہے۔ لڑکی کو ایسے ڈھونڈ نکالنا ہے کہ پولیس اور اخبار والوں تک بات نہ پہنچے۔ ورنہ ہماری بڑی بدنامی ہوگی۔“

”کیا لڑکی بہت زیادہ مال لے کر آئی ہے؟“

”زیادہ تو نہیں، ہاں معقول رقم اس کے پاس ہوگی۔ وہ تعلیم یافتہ ہے ڈرائیور جاہل

ہے۔ وہ کسی ہوٹل میں قیام نہیں کریں گے۔ یہاں ڈرائیور کا کوئی رشتہ دار یا دوست ضرور ہوگا۔

پہلوان نے کہا۔ ”اور ایسے جاہل ڈرائیور کے دوست یا رشتہ دار کسی چھوٹے علاقے میں رہتے ہوں گے۔“

ایک لڑکا لسی سے بھرے ہوئے دو گلاس لے آیا۔ پہلوان نے ایک گلاس سرفراز کو دیا۔ ایک خود لیا۔ پھر لڑکے سے بولا۔ ”دوڑ کر جا۔ بلے اور چٹے سے بول میرے جتنے پٹھے ہیں سب کو ابھی اور اسی وقت بلا کر لے آئیں۔ دیر نہ کریں۔“

لڑکا چلا گیا۔ پہلوان نے سرفراز کو لسی کا گلاس دکھاتے ہوئے کہا۔ ”رج کے پیو“ کچھو کچی مل گئی ہے۔“

وہ دو چار گھنٹہ خلق سے اتار کر بولا۔ ”کچھ معلوم تو ہو“ وہ کیسے مل جائے گی۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”ادھر سے دہلی دروازے تک اور ادھر لاری اڑے تک میرے چار پٹھے جائیں گے۔ اتنے ایریے میں جتنے قاضی ہیں ان سے معلوم کریں گے کہ آج رات کتنے نکاح پڑھائے گئے ہیں اور نکاح پڑھوانے والوں کے نام کیا ہیں؟“

”ہم بد معاشوں کی بد معاشیوں خوب جانتے ہیں۔ لڑکی کو تو لے گیا اب اس کے ماں باپ کو مجبور کرنے کے لیے نکاح پڑھوائے گا۔ اس طرح قانونی گرفت سے بچ جائے گا۔ لڑکی کو پابند بھی کر لے گا۔ تم لوگ بدنامی سے بچنا چاہو گے۔ وہ نکاح نامہ دکھا کر بدنامی کی دھمکی دے گا اور وہ انگریزی میں کیا کہتے ہیں..... ہاں بلیک مبل کرے گا۔“

تھوڑی دیر میں دس بارہ گھڑے جوان آ گئے۔ تراب علی نے پوچھا۔ ”اور بندے کہاں ہیں؟“

ایک نے کہا۔ ”آ رہے ہیں پہلوان! خبر دے دی ہے، حکم کرو۔“

اس نے سب کو قریب بٹھا کر رشیدہ اور سلامت کے متعلق بتایا۔ رشیدہ کی تصویر دکھا کر کہا۔ ”اس کی صورت اچھی طرح یاد کر لو اور یہ بھی یاد رکھنا کہ بڑے گھر کی عزت کا معاملہ ہے۔ کوئی شور شرابا نہ کرنا۔ چپ چاپ کے لڑکی کو لانے کی کوشش کرنا۔ یہ کسی بڑے علاقے میں نہیں ہوگی۔“

وہ انہیں سمجھانے لگا کہ اسے کس طرح تلاش کرنا ہے اور جس کا بھی نام سلامت سنائی دے اس سے چھیڑ نہ کرنا۔ پہلے یقین کر لینا کہ وہ لائل پور سے آیا ہے اور یہ کہ وہ کہاں رہتا ہے؟ پھر اپنے گھر کی کسی عورت کو اس گھر میں بھیج کر معلوم کرنا کہ یہ فوٹو والی کڑی وہاں ہے یا نہیں؟ اگر ہو تو خاموشی سے چلے آنا۔ پھر مجھے اور میرے یار کو وہاں لے جانا۔ باقی معاملہ ہم نمٹالیں گے۔

☆-----☆-----☆

وہ دلہن بن کر سلامت کی بیچ پر آگئی۔ اتنی جلدی دلہن کا سرخ جوڑا تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ سلامت کی خالہ ریڈی میڈ سرخ جوڑا خرید لائی تھی۔ جو زیورات کوٹھی سے لائے گئے تھے، انہیں پہن لیا تھا۔ ماں باپ کے سائے میں رخصت ہوتی تو بدن پر ہزاروں کا قیمتی لباس اور لاکھوں کے زیورات ہوتے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ عزت اور مان مرتبے کے ساتھ بزرگوں کی دعائیں لے کر آتی۔ لیکن اس نے سہاگ کی بیچ تک پہنچنے کے لیے ایک شارٹ کٹ راستہ اختیار کیا تھا۔

کچھ لوگ فطرتاً غلبت پسند ہوتے ہیں۔ منزل تک پہنچنے کے لیے لمبے اور سیدھے راستے پر نہیں چلتے۔ کوئی ٹیڑھا میزھا پیچیدہ سا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ ایسا کوئی بھی راستہ غیر قانونی اور غیر انسانی ہوتا ہے۔ رشیدہ کے دل میں چھپا چھپا خوف اور بچھتاوا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی اماں پر غشی کے دورے پڑ رہے ہوں گے۔ ابو بدوق لیے ڈھونڈ رہے ہوں گے اور برادری و خاندان والے تھو تھو کر رہے ہوں گے۔

وہ خود کو تسلیاں دے رہی تھی کہ دو چار دنوں کی بات ہے پھر والدین صبر کر لیں گے۔ دوسری بیٹی سعیدہ کو دلہن بنا کر ارمان پورے کر لیں گے۔ مجھے اپنے آئیڈیل تک پہنچنا تھا۔ آج پہنچ گئی ہوں۔ سلامت نے کمرے میں آ کر دروازے کو اندر سے بند کیا۔ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ محل میں رہنے والی محسن محسوس کر رہی تھی۔ فی الحال وہ جذبات کے سامنے خاک ہو رہی تھی۔ ابھی وہ خاک کی بیچ پر بھی رات گزار سکتی تھی۔ سلامت نے پاس بیٹھ کر کہا۔ ”رشیدہ! میں تمہاری محبت کو مذاق سمجھ رہا تھا۔ لیکن تم نے مجھ غریب کی شریک حیات بن کر ثابت کر دیا ہے کہ مجھے دل و جان سے چاہتی ہو۔ میں جانتا ہوں، یہ جگہ تمہارے قابل نہیں ہے۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ دن رات محنت کروں گا اور اتنا

کھاؤں گا کہ تمہاری ہر خواہش پوری کر سکوں۔“

وہ محبت سے بول رہا تھا اور محبتیں دے رہا تھا۔ ایسی محبتیں ماں باپ کو دھوکا دے کے، دولت کو ہار کر اور بہترین مستقبل کو ٹھکرا کر ملتی ہیں۔ وہ رات کے پچھلے پہر تک سحرزدہ سی رہی پھر تھک ہار کر سو گئی۔ صبح دیر سے آنکھ کھلی۔ سلامت اس کے چہرے پر جھکا اسے بڑے پیار سے دیکھ رہا تھا۔ وہ پھر پیار میں کھو گئی۔

کبھی تنہائی میں سوچنے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ دن رات سوچتی رہتی تھی۔ اب وہ سوچنے کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ دن رات اتنی محبت مل رہی تھی کہ اب سوچنے کی فرصت نہیں مل رہی تھی۔ دھیان کسی طرف نہیں جاتا تھا۔ وہ ساری دنیا کو بھلا چکی تھی۔ سلامت نے کہا۔ ”ایک ہفتہ گزر چکا ہے۔ میں روزانہ اخبار پڑھتا ہوں اور چھپ کر پولیس والوں کو دیکھتا ہوں کوئی ہمیں تلاش نہیں کر رہا ہے۔ اخبار میں تمہاری تصویر نہیں چھپی ہے اور نہ ہمارے متعلق کوئی خبر ہے۔“

وہ بولی۔ ”ابو بدنام ہونا نہیں چاہتے۔ اس لیے اتنی خاموشی ہے۔ وہ بڑی رازداری سے ہمیں تلاش کر رہے ہوں گے۔“

”پتہ نہیں کیا کر رہے ہوں گے۔ لیکن ہم ساری زندگی چھپے نہیں رہ سکتے۔ اب مجھے محنت مزدوری کے لیے باہر نکلنا چاہیے۔“

”نہیں سلامت! پکڑے گئے تو مصیبت آجائے گی۔“

”ہم نے باقاعدہ نکاح پڑھوایا ہے۔ تم میری شریک حیات ہو۔ تمہارے خاندان کا کوئی فرد تمہیں یہاں سے نہیں لے جاسکے گا۔ ہمیں قانونی تحفظ حاصل ہے۔“

”لیکن ابھی کام دھندے کی فکر کیوں کرتے ہو۔ ہمارے پاس اتنا ہے کہ دو برس تک عیش کر سکتے ہیں۔“

”نہیں رشیدہ! تم اپنی پونجی بچا کر رکھو۔ میں مرد ہوں۔ جب تک محنت کا پسینہ نہیں نکالوں گا، روٹی پھینکی اور بے مزہ لگے گی۔“

”مگر تم کیا محنت کرو گے؟ زیادہ سے زیادہ کسی بڑے آدمی کے ڈرائیور بن جاؤ گے۔ اس سے بہتر ہے اپنی ٹیکسی چلاؤ۔ میرے پاس پچیس ہزار نقد ہیں اور تقریباً چالیس ہزار کے زیورات ہیں۔ انہیں بیچ کر ایک ٹیکسی خرید لو۔“

”ایسی باتیں نہ کرو۔ میری غیرت گوارا نہیں کرے گی کہ تم سے رقم لوں۔“

”مجھے پتہ ہے، تم غیرت مند ہو۔ مگر قرض لے سکتے ہو۔ ٹیکسی چلا کر میری رقم ادا کر سکتے ہو۔“

بات معقول تھی۔ وہ راضی ہو گیا۔ یہ طے پایا کہ وہ کل برقع پہن کر اس کے ساتھ صرافہ بازار جائے گی اور زیورات فروخت کرے گی پھر وہ آدھی رات سے پہلے ہی سو گئی۔ ساگ کی پہلی اور دوسری رات تین چار بجے تک جاگتی رہی تھی چونکہ دن رات کا ساتھ تھا اس لیے رات بچے میں پہلی جیسی جاہلیت نہ رہی، کوئی صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک ایک ہی منظر نہیں دیکھ سکتا، بے زاری سی ہو جاتی ہے۔ ایک ہی دُش مسلسل نہیں کھا سکتا۔ ہفتے بھر تک ایک ہی مشروب نہیں پی سکتا۔ ہر عمل کا ایک فطری طریقہ کار ہوتا ہے۔ اسی لیے قدرت مسلسل نہیں ہنساتی۔ ورنہ ہنسنے والا دن رات ہنسنے ہنسنے مر جاتا۔ اور قدرت مسلسل نہیں رلاتی کہ رونے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اس کے بعد آنسو ختم ہو جاتے ہیں اور آپ ہی آپ صدمات کو سہتا اور برداشت کرنا آ جاتا ہے۔

رات کے تین بجے اچانک رشیدہ کی آنکھ کھل گئی۔ کسی حد تک غبارے سے ہوا نکل گئی تھی۔ اس لیے ابھی ابھی اس نے اماں کو خواب میں دیکھا تھا۔ وہ رو رہی تھیں اور دونوں بازو پھیلائے اسے آغوش میں بلا رہی تھیں۔ ایسے ہی وقت آنکھ کھلی تو وہ سلامت کی آغوش میں لیٹی ہوئی تھی۔ پھول اپنی ڈالی سے ٹوٹ کر گرا۔ گرنے کے بعد سوچنے لگا کہ گلدان میں آیا ہے یا اگلدان میں؟

وہ آغوش سے نکل کر چپٹ لیٹ گئی۔ پرانی سی چھت نظر آئی۔ دیواروں کے پلاسٹر ادھڑے ہوئے تھے۔ چھت اتنی پرانی تھی کہ پٹکھا لگانے کا آہنی ہک ٹوٹ گیا تھا۔ دس فٹ کے جھوٹے سے کمرے میں پیڈسل فین شور مچا رہا تھا۔ اس کمرے سے بڑا کونٹھی کا ہاتھ روم تھا۔ فرش کہیں کہیں سے ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ کئی بار چلتے وقت ڈگمگا گئی تھی، سوچ رہی تھی کہاں آگئی ہے؟ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس نے خوابوں اور خیالوں میں جو آئیڈیل دیکھا تھا، وہ ایسے ہی کھنڈر میں آیا کرتا تھا یا شیش محل میں؟

وہ اس کھنڈر کے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ جب جوش اور جذبے سرد پڑتے ہیں تو عقل سوچنے کے کام آتی ہے۔ اب وہ سوچ رہی تھی شاید میں نے جلدی کی ہے۔ اگر

تھوڑا انتظار کر لیتی اور سلامت کو کسی اور طریقے سے حاصل کرتی تو گھر بھی رہتا، ماں باپ بھی ساتھ ہوتے اور سلامت سے چھپ چھپ کر عشق بھی جاری رہتا۔

اس نے پریشان ہو کر سلامت کو دیکھا۔ وہ گہری نیند میں تھا۔ وہ اپنے سگوں سے نہیں بچھڑا تھا اس لیے بے فکری سے سو رہا تھا اور وہ دولت، شان و شوکت، اپنی جائے پیدائش اور ماں باپ کو چھوڑ کر آئی تھی اس لیے اب نیند ٹوٹنے لگی تھی۔

یہ سوال پریشان کر رہا تھا، کیا وہ سب کچھ دوبارہ حاصل کر سکے گی، جو اپنے پیچھے چھوڑ آئی ہے؟ اہم انسانی تقاضوں میں جسم کی بھوک مثالی۔ پیٹ کی بھوک بھی کسی نہ کسی طرح پوری ہوتی رہے گی لیکن پہلے جیسی عزت، شان و شوکت اور عیش و آرام، کوٹھی کاریں اور بینک بیلنس حاصل کرنا آسان تو نہیں ہے۔ یہ سب کچھ حاصل کرنے کے لیے وہ کون سا شارٹ کٹ اختیار کرے گی؟

یہ درست تھا کہ اس نے نکاح پڑھوایا تھا۔ قانون ان کے ساتھ تھا۔ اب کوئی ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن راہ چلتے اپنی برادری والوں سے سامنا ہوگا۔ ان کی لڑکیاں کاروں میں ہوں گی اور وہ فٹ پاتھ پر پیدل چلتی ہوگی تو کیا عزت رہ جائے گی۔ وہ تو نظریں نہیں ملا سکے گی۔ جن تقاریب میں لڑکیاں شاہانہ شان سے جائیں گی وہاں اس کا شوہر ڈرائیور بن کر جائے گا۔ اب وہ حیران اور پریشان ہو رہی تھی کہ جلد بازی میں یہ باتیں سمجھ میں کیوں نہیں آئیں۔ جلد بازی یوں تو بعض افراد کی عادت ہوتی ہے لیکن حقیقتاً دنیا کا ہر فرد چیختے ہوئے جذبات سے مغلوب ہوتا ہے عقل کتنی ہے کوئی جلدی نہیں ہے پھر کبھی..... اور سرکش جذبے کہتے ہیں جو ہوتا ہے ابھی اور اسی وقت، ایک دم ابھی۔

اس نے دوسری صبح سلامت سے کہا۔ ”کیوں نہ ہم ایسا راستہ اختیار کریں کہ تمہیں ڈرائیور بن کر نہ رہنا پڑے اور میں اپنے والدین کو منالوں۔ پھر ان کے سائے میں رہنے لگوں۔“

وہ تھوڑی دیر تک سر جھکا کر سوچتا رہا پھر بولا۔ ”یہ فطری بات ہے لڑکیوں کو سسرال میں ماں باپ یاد آتے ہیں۔ پھر جن حالات میں تم آئی ہو، اس کے نتیجے میں تھوڑا بچھڑاوا بھی ہوتا ہے۔“

”میں تمہارے ساتھ آکر بچھڑتا نہیں رہی ہوں۔ اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنے کی تدبیر کر رہی ہوں۔“

”مجھے یقین ہے، وہ تمہیں قبول کر لیں گے لیکن مجھے کبھی برداشت نہیں کریں گے۔“

”تم کو شش کرنے سے پہلے مایوس ہو رہے ہو۔“

”میری مایوسی کو چھوڑو۔ اپنے طور پر کرنا چاہتی ہو کرو۔ میں خواہ مخواہ روکنے لڑنے والا شوہر نہیں ہوں۔“

وہ غسل کرنے چلی گئی۔ ارادہ تھا کہ غسل کرنے، لباس بدلنے پھر ناشتا کرنے کے بعد برقع پہن کر سلامت کے ساتھ جزل پوسٹ آفس جائے گی وہاں فون پر باتیں کرنے کے لیے الگ بوتھ بنے ہوتے ہیں۔ رازداری سے باتیں ہو سکتی تھیں۔ سلامت اس کے باپ سے یعنی اپنے مالک سے سامنا کرنے کے خیال سے گھبرا رہا تھا اور رشیدہ سے اپنی گھبراہٹ چھپا رہا تھا۔ وہ بڑا جی دار تھا۔ کسی سے ڈرتا نہیں تھا لیکن اس کے اندر بیٹھا ہوا نمک حرام خوفزدہ تھا کہ باپ بیٹی میں صلح ہو گئی تو ایک نمک حرام کس خانے میں فٹ ہوگا۔

☆=====☆=====☆

سرفراز کرائے کے بندوں کو ساتھ لیے دن رات اسے تلاش کر رہا تھا۔ ملک جان محمد دوسرے تیرے دن لاہور آتے تھے پھر چلے جاتے تھے۔ رشیدہ اور سلامت اگر گھر سے نکلتے تو شاید کہیں دیکھ لیے جاتے۔ لیکن وہ تو ایک ہفتہ سے ایک چھوٹے سے کرائے کے مکان میں چھپے ہوئے تھے۔ کھڑکی سے باہر جھانکتے بھی نہیں تھے۔ ملک جان محمد نے کہا۔ ”مل کے ایک مزدور سے معلوم ہوا ہے کہ سلامت کی خالہ بیس لاہور میں رہتی ہے۔ اس کی خالہ کے گھر کا پتہ کسی کو معلوم نہیں ہے۔ بہر حال یہ تو یقین ہو گیا کہ وہ دونوں اسی شہر میں ہیں۔“

”چھوپا جی! وہ کب تک چھپے رہیں گے۔ میں صبح ناشتا کرتا ہوں اور رات کو کھانا کھاتا ہوں۔ جب تک اسے ڈھونڈ نہیں نکالوں گا تمام دن بھوکا پیاسا رہوں گا۔“

جان محمد نے دیکھا تھا کہ واقعی وہ ایک گلاس پانی بھی نہیں پیتا تھا۔ رشیدہ کے لیے

بہت پریشان رہتا تھا۔ اس کا باپ شرابی جواری تھا، جس کی وجہ سے جان محمد بیٹے سے بھی نفرت کرتا تھا۔ لیکن اس ایک ہفتے میں پتہ چلا کہ شراب تو دور کی بات ہے وہ سگریٹ بھی نہیں پیتا۔ پان بھی نہیں چباتا ہے، نہایت تابعدار بندہ ہے۔ اگر رشیدہ کو اس سے منسوب کر دیا جاتا، اسے اپنا داماد بنا لیا جاتا تو آج وہ گھر سے بے گھر نہ ہوتی۔

انہوں نے سرفراز سے کہا۔ ”بیٹے! وہ مل بھی جائے گی تو کیا ہوگا۔ اگر ایک ملازم کے ساتھ بھاگنے والی بات کھلے گی تو برادری میں اس کا رشتہ نہیں ہو سکے گا۔“

”کیوں نہیں ہوگا۔ یہ بات ہم کھلنے نہیں دیں گے۔ پھوپا جی! کیا آپ اس ناچیز کو سلامت پر ترجیح نہیں دیں گے؟ میں قسم کھا کر کہتا ہوں یہ راز دنیا والوں کو معلوم نہیں ہوگا۔“

انہوں نے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”خوش رہو بیٹے! تم میرے داماد بنو گے۔ میں نے..... بہت بڑی زمین خریدی ہے۔ وہاں پانچ کروڑ کی لاگت سے ٹیکسٹائل مل قائم کروں گا۔ وہ مل تمہاری اور رشیدہ کی ہوگی لیکن ایک اندیشہ ہے۔“

”وہ کیا پھوپا جی؟“

”سلامت نے اس سے نکاح پڑھایا ہوگا۔ اس کے اس نکاح نامہ ہوگا۔ اس کے ذریعے وہ اپنے حقائق بتائے گا۔ رشیدہ کو آزاد نہیں کرے گا۔“

”آپ فکر نہ کریں۔ ایک گولی چلے گی اور سب آزاد ہو جائیں گے۔ رشیدہ سے یہ نہیں کہنا ہوگا کہ وہ طلاق لے اور سلامت سے طلاق دلانے کے لیے اس سے سودا نہیں کرنا ہوگا۔ جب وہ بیوہ ہو جائے گی تو طلاق اور سودے بازی کے تمام جھیلے خود ہی ختم ہو جائیں گے۔“

”ہاں۔ وہ پاؤں کا جوتا ہے اس سے کچھ نہ بولیں تو بہتر ہوگا۔ جو کرنا ہے وہ خاموشی سے کر گزرو۔“

ٹیلی فون کی گھنٹی بجتے گئی۔ سرفراز نے اٹھا کر پوچھا۔ ”ہیلو! کون؟“

”بھائی جان! میں سعیدہ بول رہی ہوں۔ ابھی آپ کا فون آیا تھا۔“

اس نے چونک کر پوچھا۔ ”کیا رشیدہ کا فون؟“

ملک جان محمد نے ریسپور چھین کر کان سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا رشیدہ کا فون“

آیا تھا؟ وہ کہاں ہے؟ کیا کر رہی ہے؟“

”ابو! آپ ذرا تھل سے میری باتیں سنیں۔ ابھی فون پر آپ کی آواز سن کر میں نے پوچھا، وہ کہاں ہیں؟ انہوں نے کہا وہ لاہور میں ہیں۔ جنرل پوسٹ آفس سے بول رہی ہیں۔ یہاں منٹ کے حساب سے باتیں کی جاتی ہیں اس لیے اماں کو جلدی بلائیں۔ وہ ضروری باتیں کرنا چاہتی ہیں۔ میں نے جھوٹ کہہ دیا کہ اماں پڑوس والی کوٹھی میں گئی ہیں۔ وہ پانچ منٹ کے بعد فون کر لیں، جب تک میں اماں کو بلا کر لے آؤں گی۔“

”میری بیٹی! تم نے بہت عقلمندی کا ثبوت دیا ہے۔ اسے باتوں میں الجھاؤ۔ ہم جی پی او جا رہے ہیں۔“

جان محمد نے ریسپور رکھ کر کہا۔ ”اٹھو سرفراز! اس وقت رشیدہ جنرل پوسٹ آفس میں ہے، اپنی ماں سے فون پر باتیں کرے گی۔“

وہ دونوں تیر کی طرح ہوٹل کے کمرے سے نکل گئے۔ دوسری طرف سعیدہ نے کچن میں آکر اماں سے کہا۔ ”جلدی آئیں، آپ کا فون آنے والا ہے۔“

وہ خوشی سے بھاگی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئیں۔ سعیدہ نے کہا۔ ”پہلے یہ سن لیں کہ ابھی آپ کی میری بات ہوئی تھی۔ وہ آپ سے باتیں کرنا چاہتی ہیں۔ میں نے جھوٹ کہہ دیا کہ آپ پڑوس میں گئی ہیں۔ اس لیے وہ پانچ منٹ بعد فون کریں۔“

”تم نے ایسا کیوں کہہ دیا۔ اگر وہ مایوس ہو کر چلی گئی اور فون نہیں کیا تو؟“

”ضرور کریں گی۔ اتنے دنوں بعد آپ کو یاد کیا ہے تو ضرور کوئی خاص بات ہوگی۔ بس آپ فون پر کہہ دیں کہ پڑوس میں گئی تھیں۔“

”تمہیں فون بند کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ تم نے میری بیٹی سے میری بات کیوں نہیں کروائی؟“

اسی وقت فون کی گھنٹی بجتے گئی۔ سعیدہ نے جل کر کہا۔ ”لیں۔ بیٹی سے بات کریں۔“

وہ ریسپور اٹھا کر جلدی سے بولیں۔ ”ہیلو۔ رشیدہ، میں تمہاری ماں بول رہی ہوں۔“

ذرا خاموشی رہی۔ پھر رونے اور سسکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ”کیا ہوا میری“

جان! رو رہی ہو؟ بیمار ہو؟ پریشان ہو؟ کیا تکلیف ہے، جلدی بولو۔ تم کہاں ہو؟“

وہ رو رو کر بولی۔ ”اماں! مجھے معاف کر دیں۔“

”کر دیا بیٹی! تم ماں کو نہیں سمجھتیں۔ جس لمحے تمہیں پیدا کیا تھا اسی لمحے تمہاری آئندہ ہونے والی تمام غلطیوں کو معاف کر دیا تھا۔ ماں باپ وہ ہوتے ہیں جو اولاد کی صرف اچھائیوں سے ہی نہیں ان کی برائیوں سے بھی پیار کرتے ہیں اور پیار سے برائیاں دور کرتے ہیں۔ مجھے بتاؤ تم کہاں ہو؟ میں ابھی آؤں گی۔“

”اماں! میں کس منہ سے ابو کا سامنا کروں گی؟“

”وہ تمہارے ابو ہیں۔ دشمن نہیں ہیں۔ وہ تو تمہیں دیکھتے ہی کیچے سے لگا لیں گے۔“

”کیا وہ سلامت کو قبول کر لیں گے۔“

”آں؟ کیا تم نے اس سے.....“

”ہاں! ایک ہفتہ پہلے ہمارا نکاح ہو چکا ہے۔ ہم میاں بیوی ہیں۔“

”آہ رشیدہ! میرا دل ڈوب رہا ہے۔ یہ تو نے ہمیں بہت بڑی گالی دی ہے۔“

”گالی تو اسی دن پڑ گئی تھی جب میں نے گھر چھوڑا تھا۔ اب تو پوری

برادری.....“

”نہیں بیٹی! ابھی کسی کو معلوم نہیں ہے۔ گھر کے ملازم بھی نہیں جانتے۔ سب

سے کہا گیا ہے کہ تم پنڈی میں خالد کے پاس ہو۔ بیٹی! اس سے پہلے کہ رسوائی کی ایک ذرا

سی آج کہیں سے آئے۔ تم فوراً چلی آؤ۔ یا مجھے پتہ بتاؤ میں ابھی آتی ہوں۔“

”آپ اتنی دور لاہور کہاں آئیں گی۔ میں آجاؤں گی۔“

”تم لاہور میں ہو؟ یہ تو اچھی بات ہے۔ تمہارے ابو اور سرفراز وہاں ہیں۔ میں

انہیں فون کرتی ہوں۔ وہ تمہیں لینے آجائیں گے، اپنا پتہ بتاؤ۔“

”نہیں اماں! میں ان کا سامنا نہیں کروں گی۔ پہلے آپ سے ملوں گی۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ ابھی وہاں سے چل پڑو۔“

”لیکن سلامت کے سلسلے میں کچھ حوصلہ دیں۔ میری اچھی اماں! اس کا کوئی قصور

نہیں ہے۔ میں اپنی مرضی سے آئی ہوں۔ اب تو وہ میرا شوہر ہے۔“

”ایسا نہ کہو بیٹی، یہ سن کر ہی منہ پر جوتا لگتا ہے۔“

”یعنی اسے قبول نہیں کیا جائے گا؟“

یہ اندیشہ تھا کہ ابھی اس کی بات سے انکار کیا جائے گا تو وہ پھر گم ہو جائے گی۔ ہاتھ نہیں آئے گی۔ وہ بولیں۔ ”تم ایسا کرو کہ پہلے تنہا آؤ۔ اسے مل کے کوارٹر میں جانے کو کہہ دو۔ جب ہم آپس میں ایک دوسرے کو قائل کر لیں گے تو اسے کوٹھی میں بلایا جائے گا۔“

”اچھی بات ہے۔ میں تنہا آؤں گی۔ لیکن یہ آپ سب اچھی طرح سمجھ لیں کہ ہمارا نکاح ہو چکا ہے۔ مجھ سے یا سلامت سے کوئی زیادتی کی جائے گی تو آپ لوگوں کو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ خواہ مخواہ بدنامی پھیل جائے گی۔“

”میری جان! ہم نے تمہیں پھولوں کی طرح پالا ہے۔ کوئی تمہیں انگلی بھی نہیں

لگائے گا۔ تم فوراً آؤ۔ جب تک نہیں آؤ گی میں دروازے پر کھڑی رہوں گی۔“

اس نے آنے کا وعدہ کر کے ریسور رکھ دیا۔ ماں کی آواز میں اور باتوں میں متا

کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس کا دل کھنچا جا رہا تھا۔ اماں سامنے ہوتیں تو ان کے سینے

پر سر رکھ کر خوب روتی۔ اس کے اندر کشمکش پیدا ہو گئی تھی۔ محبت کا زور ماں کی طرف

تھا۔ سلامت کے لیے محبت تھی لیکن محبت سے زیادہ ہمدردی تھی کہ بے چارے کو بلندی

پر آنے کی اجازت دی جائے گی یا نہیں؟ محبت اور فرض میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ وہ فرض

کچھ کر سلامت کے حق میں سوچ رہی تھی، اس کے ساتھ بھاگ آنے اور شادی کر لینے

کے بعد وفا کی ایک رسم ہوتی ہے۔ اس رسم کو بھی نباہنا تھا اور یہ واضح تھا کہ لعن طعن کا

سامنا بھی کرنا تھا۔ ساری عمر زلت اور رسوائی کے پل صراط پر چلنا تھا اور مشکل ہی نظر آ

رہا تھا۔

ماں کی یہ بات دماغ میں چبھ رہی تھی کہ سلامت کو شوہر نہ کہو منہ پر جوتا لگتا

ہے۔ گویا نکاح کے حوالے سے شوہر اور سوسائٹی کے معیار کے مطابق جوتا تھا۔ پاؤں سے

اوپر نہیں آسکتا تھا۔

اس نے بوتھ سے نکل کر دیکھا۔ وہ سامنے کھڑا ہوا تھا۔ پتہ نہیں کیوں کچھ کمتر سا

لگ رہا تھا۔ بالکل بے چارہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ اور رشیدہ کے خاندان میں کوئی مرد بے

چارہ نہیں تھا۔ سب سیر پر سوا سیر تھے۔ سینہ تان کر رہتے تھے۔ وہ آہستگی سے بولی۔
”ٹرک کال کا بل ادا کر دو۔“

اس نے جا کر ادا کر دیا۔ پھر رشیدہ نے اس کے ساتھ باہر نکلنے سے پہلے چہرے پر
برق کا نقاب ڈال لیا۔ وہ بولا۔ ”تم نے بتایا نہیں کیا بات ہوئی؟“
”گھر چل کر بتاؤں گی۔“

وہ جہز پوسٹ آفس کی عمارت سے باہر آئے۔ پھر ایک دم ٹھنک گئے۔ سامنے
ملک جان محمد کھڑے ہوئے تھے۔ باپ کو دیکھ کر آدمی جان نکل گئی۔ سلامت نے سر جھکا
لیا۔ ہاتھ یوں باندھ لیے جیسے نماز کی نیت کر رہا ہو۔ باپ نے قریب آ کر پوچھا۔ ”تم نے تو
برقعہ میں خود کو چھپا لیا۔ میں دنیا والوں سے کیسے منہ چھپاؤں۔ میرے سامنے تو ایک
خود کشی کا راستہ ہے۔ مجھے زندہ دیکھنا چاہتی ہو تو کوئی بحث نہ کرو۔ میرے ساتھ آؤ۔“
وہ پلٹ کر جانے لگے۔ وہ بھی پیچھے چلنے لگی۔ جان محمد نے چند قدم چلنے کے بعد
رک کر سلامت سے پوچھا۔ ”کیا تم رشیدہ کا ساتھ چھوڑ رہے ہو؟ اگر نہیں تو پھر وہاں
کیوں کھڑے ہو؟“

وہ جلدی سے آگے بڑھ کر رشیدہ کے پیچھے آ گیا۔ باپ بیٹی کے پیچھے چلتا ہوا ایک
کار کے پاس آیا۔ باپ نے بیٹی سے پوچھا۔ ”ماں سے باتیں ہو گئیں؟“
”جی ہاں۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ میں گھر واپس آ رہی ہوں۔“
”تم نے بڑی جلدی واپسی کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟“
”مجھے غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ میں چاہتی ہوں مجھے سلامت کے ساتھ قبول کیا
جائے۔“

انہوں نے گھوم کر سلامت کو دیکھا پھر بیٹی سے پوچھا۔ ”شادی کر چکی ہو یا کرنا
چاہتی ہو؟“

”ایک ہفتہ پہلے نکاح ہو چکا ہے۔“

جان محمد نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اس زہر کو پی رہے تھے کہ بیٹی نے ایک ملازم
کو ان کا داماد بنا دیا ہے۔ وہ بڑے صبر و ضبط سے کام لیتے ہوئے بولے۔ ”پھر تو باقاعدہ
اعلان کرنا ہو گا۔ برادری والوں کے لیے ایک بڑی دعوت کا اہتمام کرنا ہو گا لیکن ہمارے

بزرگ نکاح نامہ دیکھنا چاہیں گے، کیا یہ تم لوگوں کے پاس ہے؟“
سلامت نے کہا۔ ”جی ہاں، گھر میں ہے۔“

”گھر چلو۔ وہاں سے نکاح نامہ اور ضروری سامان لو۔ ہم ابھی لائل پور جائیں
گے۔ گاڑی میں بیٹھو۔“

باپ نے گاڑی کی چابی سلامت کی طرف بڑھائی۔ اس نے چابی لے کر ایک
ڈرائیور کی طرح پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ وہاں باپ بیٹی بیٹھ گئے۔ سلامت اسٹیرنگ
سیٹ پر آ گیا۔ وہی آقا اور غلام کا فاصلہ قائم ہو گیا۔

راستے میں ملک صاحب نے مخاطب کیا۔ ”سلامت!“
”جی جناب۔“ اس نے عادتاً ”جناب“ کہا جبکہ وہ ڈرائیور نہیں تھا۔ داماد بن گیا
تھا۔

ملک صاحب مسکرائے پھر بولے۔ ”اپنے گھر سے دو سو گز دوری پر گاڑی روکنا۔
میں اس محلے میں جانا پسند نہیں کروں گا۔“
”جی جناب!“

”میں رشیدہ سے باتیں کرتا رہوں گا۔ تم جا کر نکاح نامہ لے آنا۔ کیا نقدی اور
زیورات بھی ہیں؟“

رشیدہ نے کہا۔ ”جی ہاں، میں اپنے زیورات اور تیس ہزار نقد لائی تھی۔ پانچ ہزار
خرچ ہو گئے۔ پانچ میرے پاس ہیں اور باقی.....“

”میں حساب نہیں پوچھ رہا ہوں۔ سلامت تم بولو۔ وہ نقدی اور زیورات اس گھر
میں محفوظ رہیں گے؟“

”جی جناب! لوہے کی الماری ڈبل لاک والی ہے۔ گھر کے دروازے مضبوط ہیں اور
محلے پڑوس والے بڑا خیال رکھتے ہیں۔ ہمارے محلے میں کبھی چوری نہیں ہوئی۔“

”پھر تو ٹھیک ہے۔ نقدی اور زیورات وہیں رہنے دو۔ میں چاہتا ہوں۔ دو چار روز
بعد تم دونوں اسی شہر میں آ کر رہائش اختیار کرو۔ یہاں ایک کوٹھی خرید لیتا۔“

وہ دونوں خوش ہو گئے۔ ملک صاحب اور سرفراز کے درمیان طے پایا تھا کہ وہ
اپنے کرائے کے غنڈوں کو لے کر آئے گا۔ ملک صاحب بیٹی کے ساتھ جہز پوسٹ آفس

کے سامنے اس کا انتظار کریں گے۔ اگر وہ کسی کام سے جائیں گے تو سرفراز واپس آکر اسی جی پی او کے سامنے ان کا انتظار کرے گا۔

سلامت نے گاڑی روک کر کہا۔ ”گھر یہاں سے کافی دور ہے۔ پھر بھی میں تیزی سے جاؤں گا اور تیزی سے واپس آؤں گا۔“

وہ پلٹ کر تیزی سے جانے لگا۔ ملک صاحب نے کہا۔ ”اس پیدل چلنے والے شخص کو دیکھو۔ ایسے لوگ لاکھوں کی کار میں بیٹھ کر بھی ساری عمر ڈرائیور دکھائی دیتے ہیں۔ بیٹی! میں نے تمہیں تعلیم دی، عقل دی کیا اپنے مستقبل کا ایسا ہی تھرڈ کلاس فیصلہ کرنے کے لیے؟“

اس نے سر جھکا لیا۔ دوپٹے سے منہ چھپانے لگی۔ باپ نے کہا۔ ”میں برادری والوں کے سامنے کس منہ سے اس ڈرائیور کو داماد کہوں۔ کیا تم میرے شرم سے مرنے کا تماشا دیکھو گی؟“

وہ رونے لگی۔ باپ اپنے طور پر درست کہہ رہا تھا۔ وہ اپنی برادری میں کیسے جیئے گا۔ جبکہ اپنی ہی بیٹی اس کی گردن جھکا رہی تھی۔ ”میری بچی! تمہارے آنسو بتا رہے ہیں کہ تم خود غرض اور سرکش نہیں ہو۔ تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہے۔ تم ہلاری اور خاندان کی عزت رکھنا چاہتی ہو۔ مگر شاید کشمکش میں ہو، ایسے میں عقل پکارتی ہے اور احمقانہ جذبے اپنی طرف کھینچتے ہیں۔“

وہ روتے روتے بولی۔ ”ہاں میں کچھ ایسی ہی کشمکش میں ہوں۔ میں اماں کے پاس رہنا چاہتی ہوں لیکن سلامت کو دھوکا نہیں دینا چاہتی۔“

”یہ کیوں بھولتی ہو کہ اس نے تمہارے باپ کے اعتماد کو دھوکا دیا ہے۔“

”ابو! میں نے اسے مجبور کیا تھا۔“

”تمہارے مجبور کرنے سے اس نے مجھے دھوکا دیا۔ کیا تم میری التجا پر اسے چھوڑ

سکتی ہو؟ اسے چھوڑنا دھوکا نہیں ہو گا دانشمندی ہو گی۔“

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ باپ نے کہا۔ ”تم ہزار باتیں کہہ سکتی ہو مگر میری ایک بات پر خاموشی سے غور کرنا۔ ابھی کوٹھی کے کسی ملازم کو تو کیا کوٹھی کے کتے کو بھی نہیں معلوم کہ تم ہماری عزت خاک میں ملا چکی ہو۔ اگر دانشمندی سے اسے چھوڑنے کا فیصلہ

کر لو گی تو گھر پہنچ کر وہی کنواری بن بیاہی بیٹی سمجھی جاو گی۔“

”لیکن ابو! ہمارا نکاح ہو چکا ہے۔“

”وہ نکاح نامہ نہیں رہے گا اور سلامت تمہارے راستے سے ہمیشہ کے لیے ہٹ جائے گا۔ پھر کوئی تمہیں منکوح، مطلقہ یا بیوہ نہیں کہے گا؟“

وہ گھبرا کر بولی۔ ”بیوہ؟“

”ہاں، اب تو عزت کا معاملہ ہے۔ تم نے دانشمندی نہیں دکھائی تو دو میں سے کوئی ایک بات ہو گی۔ بیوہ ہو جاو گی یا یتیم۔ دیکھو، وہ آ رہا ہے۔ آنسو پونچھ لو اور دل ہی دل میں کسی نتیجے پر پہنچو۔ لائل پور پہنچنے تک فیصلے کا بڑا وقت ہے۔“

وہ آنسو پونچھنے لگی۔ سلامت نے آکر رشیدہ کو ایک گٹھڑی دیتے ہوئے کہا۔ ”اس میں میرے اور تمہارے دو جوڑے ہیں۔ صاحب کے حکم سے میں نے نقدی اور زیورات منقل کر دیے ہیں۔“

وہ اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھ کر کار اشارت کرنے لگا۔ ملک صاحب نے پوچھا۔ ”نکاح نامہ!“

”لے آیا ہوں جناب! گاڑی میں ہے۔“

گاڑی آگے بڑھ گئی۔ جی پی او کے سامنے ملک صاحب نے سرفراز کی گاڑی اور غنڈوں کو دیکھا۔ سرفراز نے ہاتھ سے اشارہ کیا پھر ان کی گاڑی کے پیچھے گاڑی لگا دی۔ وہ خاموشی سے آگے پیچھے چلتے رہے۔ ملک صاحب نے اپنے منصوبے کے مطابق شیخوپورہ سے آگے جانے کے بعد اپنی کار ایک کچے راستے پر موڑنے کو کہا۔ سلامت نے پوچھا۔ ”جناب! ادھر تو کھیت ہی کھیت ہیں۔ آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟“

”آگے نانک صاحب کے قریب ہماری برادری کے ایک بزرگ رہتے ہیں، ہم انہیں ساتھ لے جائیں گے۔ وہ تمہاری حمایت میں فیصلہ سنائیں گے۔“

وہ کچے پر چلنے لگے۔ راستے کے اطراف کھیت جو بن پر تھے۔ فصلیں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ کچھ دور جانے کے بعد سرفراز کی گاڑی بالکل قریب آکر ہارن دینے لگی۔ ملک صاحب نے کہا۔ ”اس گاڑی کو آگے جانے کا راستہ دو۔“

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ کار ایک طرف کرتے ہوئے راستہ دیا۔ پیچھے والی گاڑی

نے اسے اور ٹیک کیا۔ پھر آگے آکر ترچھی کھڑی ہو گئی۔ آگے جانے کا راستہ روک دیا۔ سلامت نے اپنی کار سے نکلنے ہوئے کہا۔ ”اے“ یہ کیا حرکت ہے؟ گاڑی یہاں سے ہٹاؤ۔“

اگلی گاڑی کا دروازہ کھلا۔ سب سے پہلے سرفراز باہر آیا۔ اس کے بعد ہاتھوں میں ہاکیاں لیے ہوئے غنڈے باہر آئے۔ سلامت نے سرفراز کو دیکھ کر حیرانی سے کہا۔ ”آپ؟“

”ہاں، تمہارا باپ۔“ وہ قریب آتے ہوئے بولا۔ ”نالی کے کیڑے! تمہیں ہمارے خاندان کی عزت تک پہنچنے کی جرات کیسے ہوئی؟“

وہ پلٹ کر ملک صاحب کے پاس آنا چاہتا تھا۔ ایک غنڈے نے اس کی گردن پر زور سے ہاکی ماری۔ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ وہ لڑکھڑایا۔ سرفراز نے کہا۔ ”جان بچانا چاہتے ہو تو ادھر کھیتوں میں بھاگو۔“

اسے چار غنڈوں نے گھیرا تھا۔ سب کے ہاتھوں میں ہاکیاں تھیں اور سرفراز کے ہاتھ میں ریوالمور دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے پکارا۔ ”رشدہ۔“

کمر پر ایک ہاکی پڑی۔ وہ اپنے بچاؤ کے لیے کھیتوں میں گھس گیا۔ سب اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے گئے۔ فصلیں اتنی اونچی تھیں کہ اندر جانے والے چھپ گئے تھے۔ نظر نہیں آ رہے تھے۔ فصلوں کے ہٹنے، ایک دوسرے سے رگڑا کھانے اور شور مچانے سے سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ کھیت کے کس حصے میں ہیں..... اور ایک بندے نے اپنی بتا کے لیے جنگ جاری رکھی ہوئی ہے۔

رشدہ بار بار کہہ رہی تھی۔ ”ابو! یہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ لوگ اسے مار ڈالیں گے۔ سرفراز کو روکیے۔“

”بیٹی! میں نے کہا تھا۔ عقل سے سوچتی رہو کہ لائل پور میں داخل ہوتے ہی تم میری کنواری بن بیباہی بیٹی پھر سے بن جاؤ گی۔ وقت، حالات اور دانشمندی کا یہی تقاضا ہے۔“

”میں آپ کی بات مان رہی ہوں۔ آپ اسے چھوڑ دیں۔“

”کیسے چھوڑ دیں؟ وہ راضی خوشی طلاق نہیں دے گا۔“

”میں اسے طلاق دینے پر مجبور کر دوں گی۔“

”وہ فی الحال تمہاری بات شاید مان لے۔ لیکن جو ملازم اتنا کم ظرف ہو کہ مالک کی بیٹی کو بھگا کر لے جائے، وہ کسی محفل میں ہماری عزت کی دھجیاں بھی اڑا سکتا ہے۔ ہمارے دشمنوں کا آلہ کار بن کر تمہارے بارے میں ایسی شرمناک باتیں کرے گا کہ پھر تمہارے ساتھ تمہاری چھوٹی بہن کی بھی زندگی برباد ہو جائے گی۔ ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔“

”ابو! وہ ہمیں بدنام نہیں کرے گا۔“

”جو ایک بار چوری کرتا ہے وہ بار بار کر سکتا ہے۔ تم اپنی ناقص عقل سے نہ سوچو۔ کھیتوں کی طرف نہ دیکھو۔ وقت اور حالات کے مطابق سر جھکا لو۔ ماں باپ کا ساتھ دو۔ صرف اپنی خاندانی عزت اور برتری کے متعلق سوچو۔“

وہ کچھ اور کہنا چاہتے تھے۔ لیکن رشیدہ فائرنگ کی آواز سن کر چیخ پڑی۔ اس نے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ گندم کے خوشے ہلٹے ہلٹے تھم رہے تھے۔ شانت ہو رہے تھے۔ وہ منہ کھولے کھیتوں کی طرف یوں تک رہی تھی جیسے سانس لینا بھول گئی ہو۔ تھوڑی دیر بعد سرفراز نظر آیا۔ وہ اپنے حواریوں کو نوٹوں کی گڈیاں دے رہا تھا۔ حواری دوسری گاڑی کی طرف جا رہے تھے۔ سرفراز ملک صاحب کی گاڑی میں اسٹیرنگ سیٹ پر آکر بیٹھ گیا پھر ریوالمور دیتے ہوئے بولا۔ ”یہ لیجئے، بدنامی کا تمام قصہ ختم ہو چکا ہے۔“

وہ کار اشارت کے واپس موڑنے لگا رشیدہ رو رہی تھی، چیخ رہی تھی۔ ”یہ ظلم ہے! وہ بے قصور تھا۔ خطاوار میں ہوں۔ مجھے بھی گولی مارو۔ میں دنیا والوں سے چیخ چیخ کر کہوں گی کہ سرفراز نے سلامت کو قتل کیا ہے۔“

باپ نے ریوالمور کو رومال سے صاف کیا۔ پھر اسے مٹھی میں جکڑ کر کہا۔ ”وہ اس ریوالمور کی گولی سے ہلاک ہوا ہے اور اب اس پر میری انگلیوں کے نشانات ہیں۔ اگر تم اس قتل کا ذکر ریوالمور سے بھی کرو گی اور بدنامی سراٹھائے گی تو میں تمہارے میں یہ ریوالمور ٹپس کر کے اعتراف کروں گا کہ میں نے ایک عیاش بد معاش سے بیٹی کو بچانے کے لیے اپنے ہاتھ سے گولی ماری ہے۔“

وہ پریشان ہو کر باپ کا منہ تکتے لگی۔ ”بیٹی! میں لاہور سے سمجھاتا آ رہا ہوں۔ لائل

پور پہنچنے تک بھی تمہاری سمجھ میں نہ آیا تو میں گھر پہنچتے ہی ایک گولی تمہاری ماں کو دوسری تمہاری بہن کو ماروں گا اور خود بھی مر جاؤں گا۔ اس سے پہلے کہ تم عزت کی دھجیاں اڑاؤ، ہم سب عزت سے مرجائیں گے۔“

وہ منہ چھپا کر رونے لگی۔ باپ نے اسے رو رو کر اندر کا غبار نکالنے دیا۔ وہ گھر پہنچ کر ماں سے پلٹ کر روتی رہی۔ ان سب کی سلامتی کے لیے سلامت کی کوئی بات نہیں کی۔ اس نے ہمیشہ کے لیے اپنے ہونٹ سی لیے۔ یوں اس کی خاموشی سے بات بن گئی۔ کسی کو پتہ ہی نہ چلا کہ وہ اپنی عزت خاک میں ملا کر آئی ہے۔ پوچھنے والوں کو یہی بتایا گیا کہ وہ ایک ہفتے کے لیے اپنی خالہ کے پاس رہنے گئی تھی۔

ملک جان محمد نے علاقے کے تھانیدار کو خاصی رشوت دے کر ایک ہفتہ پہلے کی تاریخ میں رپورٹ درج کرائی کہ ڈرائیور سلامت کو بھٹی سے چالیس لاکھ روپے نقد اور تقریباً ایک لاکھ کے زیورات چرا کر بھاگ گیا ہے۔ رشیدہ نے گھر سے بھاگنے کے بعد اتنی عقلمندی کی تھی کہ سلامت کی خالہ وغیرہ کے سامنے خود کو ملک جان محمد مل اونر کی بیٹی ظاہر نہیں کیا تھا۔ سلامت نے بھی اس کے خاندان کی عزت رکھی تھی۔ نکاح نامہ میں بنت جان محمد لکھوایا تھا اور جان محمد سیکڑوں ہزاروں ہوتے ہیں۔

ملک صاحب نے بیگم سے کہا۔ ”ایک ماہ کے لیے رشیدہ کو لے کر پنڈی چلی جاؤ۔ اس وقت پولیس والے اپنی کارروائی مکمل کر لیں گے۔ سلامت لاپتا قرار دیا جائے گا اور محلے والے تھانے پکھری کے ڈر سے کوئی بیان نہیں دیں گے۔“

تھانیدار نے لاہور پولیس کے تعاون سے سلامت کے گھر پہنچ کر الماری کا تالا توڑا۔ بیس ہزار نقد اور زیورات برآمد کیے۔ ملک صاحب نے ان سے کہا یہ رقم اور زیورات آپس میں بانٹ لو اور اس کیس پر مٹی ڈال دو۔ اب سلامت کی طرف سے کوئی آواز نہیں اٹھائے گا۔

خیال تھا کہ رشیدہ کو رفتہ رفتہ منا کر سرفراز سے بیاہ دیا جائے گا لیکن ایک ماہ بعد ہی انکشاف ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اس نئی افتاد سے سب پریشان ہو گئے۔ ماں نے کہا۔ ”رشیدہ! تو نے ایک بار ہماری خاک میں ملنے والی عزت کو بچا لیا۔ یہ آخری بدنامی کا کٹنا بھی نکال دے۔ ابھی ابتدا ہے، اسقاط ہو سکتا ہے۔“

اس نے کہا۔ ”نہیں۔ آپ لوگوں نے اسے مار ڈالا۔ میں اسے مارنے نہیں دوں گی۔ وہ کسی غریب کا بیٹا تھا۔ میں نے زیادہ ماتم نہیں کیا۔ صبر کر لیا۔ لیکن یہ ایک امیر زادی کا بچہ ہے۔ اسے کچھ ہو گا تو میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گی۔“

اسے بڑا سمجھایا گیا۔ وہ راضی نہ ہوئی۔ ماں نے پوچھا۔ ”تمہارا بچہ سلامت رہے گا مگر تم ہماری عزت رکھنے کے لیے کیا کر سکتی ہو؟“

”میں جان دے سکتی ہوں۔ آپ جو کہیں گے وہ کروں گی۔“

”تو پھر اس بچے کو سرفراز کا نام دے دے۔ ہم ایک ہفتے کے اندر تیری شادی کر دیں گے۔ وہ میرا فرمانبردار بھتیجا ہے، تجھے بچے کے ساتھ قبول کر لے گا۔“

رشیدہ نے بہت غور کیا۔ جو غلطی ہو گئی تھی اسے چھپانے کا یہی دوسرا اور آخری راستہ رہ گیا تھا۔ وہ اپنے ہونے والے بچے کی سلامتی کے لیے راضی ہو گئی۔

☆-----☆-----☆

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ بڑے دکھ سے بیٹی کو دیکھا۔ پھر کمرے سے نکل کر بیڑیوں سے اترتی ہوئی کاؤنٹر پر آگئی۔ ریسپور ایک طرف رکھا ہوا تھا۔ اس نے اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ ”ہیلو، کون؟“

”میں ہوں سرفراز، ہماری بیٹی کیسی ہے؟“

”وہ بالکل نارمل ہے۔ مگر شاید ہم نارمل نہیں رہ سکیں گے۔“

”کیا کہہ رہی ہو؟“

”آپ اسے پیدائش کے وقت بیٹی مانتے آ رہے ہیں۔ لیکن وہ آپ کو باپ تسلیم

کرنے سے انکار کر رہی ہے۔ اسے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ راز صرف مجھے اور تمہیں معلوم ہے یا اس کے نانا نانی کو

معلوم تھا۔ مگر اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔ پھر اسے کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟“

”اس نے تیرہ برس کی عمر میں ایک رات میری اور اماں کی کچھ باتیں سن لی

تھیں۔ پھر چھ ماہ پہلے اماں کی بیماری کے دوران وہ ان کے پاس رہتی تھی۔ اس نے آخری

وقت اماں کو خدا کا خوف دلا کر ان سے ساری باتیں اگلا لیں۔“

”اوہ گاڈ! یہ تو بہت برا ہوا۔ اسی لیے وہ انتقاماً الٹی سیدھی حرکتیں کرتی ہے۔“

”ہو سکے تو آپ ابھی آجائیں۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ آپ کی موجودگی میں مجھے

وصلہ رہے گا۔ ہم دونوں مل کر اسے اپنی بھرپور محبت کا یقین دلائیں گے۔“

”میں ابھی آ رہا ہوں۔“

وہ ریسپور رکھ کر سوچنے لگی۔ کیا کروں؟ بیٹی کے پاس جاؤں؟ دل تو اسے سینے سے

لگا کر رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن بات کرو تو وہ کانٹے کو دوڑتی ہے۔ مگر اور پایا کہنے والی ہمیں

دشمن سمجھ رہی ہے۔ وہ کھڑی رہی اور سوچتی رہی۔ پھر ایک صوفہ پر بیٹھ گئی۔ ایک خیال

دل میں آرہا تھا کہ اسے کسی پہاڑی مقام پر لے جائیں۔ دل بہل جائے گا۔ غصہ کم ہو

جائے گا اس کے اندر کی نفرت رفتہ رفتہ محبت میں بدل سکتی ہے۔ کوششیں جاری رہیں تو

کامیابی کی توقع رہتی ہے۔

وہ ایک گھنٹے بعد آیا۔ رشیدہ نے صوفہ سے اٹھ کر کہا۔ ”کب سے انتظار کر رہی

ہوں؟“

ہسپتال کے کمرے میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ شائستہ بستر پر بیٹھی ہوئی تھی

اور اس کی ماں رشیدہ بیگم سر جھکائے ہوئے تھی۔ دیکھا گیا ہے کہ سر جھکانے سے اپنا

گرہبان نظر آتا ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اپنے گریبان کو نہیں دیکھ رہی

تھی۔ اس کے باوجود اپنے شرمناک اور المناک ماضی میں دور تک جا کر واپس آگئی تھی

اور اب سوچ رہی تھی۔ کیسے آنکھیں کھولے؟ بیٹی سے کیسے نظریں ملائے؟ اس کے نانا

ملک جان محمد نے نانی نے اور سرفراز نے بڑی ہیرا پھیری سے تمام راز پر پردہ ڈال دیا تھا۔

قل چھپ گیا تھا لیکن پچیس برس کے بعد اچانک سلامت کا لبو بول پڑا تھا۔

شائستہ نے کہا۔ ”مئی! آپ ہمیشہ آنکھیں بند نہیں رکھ سکیں گی۔ کیا دو آنکھیں بند

کرنے سے پورا انسان چھپ جاتا ہے؟“

ماں نے ایک گہری سانس لے کر آنکھیں کھول دیں لیکن نظریں چراتی رہی۔ وہ

بولی۔ ”اب آپ کو یقین ہو گیا ہو گا کہ میں ایب نارمل نہیں ہوں۔ ذہنی مریضہ نہیں

ہوں۔ میں صرف اندر سے خالی ایک لڑکی ہوں۔ اب آپ اور ملک سرفراز سر جوڑ کر

سوچیں کہ یہ خلا کیسے پورا ہو سکتا ہے۔“

”بیٹی! اپنے پایا کا نام لے رہی ہو؟ انہیں ملک سرفراز کہہ رہی ہو؟“

”جب بھی میں پایا کہتی ہوں میرے اندر سے منفی رد عمل ابھرتا ہے اور میں کوئی

الٹی سیدھی حرکت کرنے لگتی ہوں۔ لہذا آج سے میں آپ کے شوہر کو نہ پایا کہوں گی اور

نہ ہی نام لوں گی۔“

ماں کچھ کہنا چاہتی تھی۔ ایک وارڈ بوائے نے آکر کہا۔ ”مسز سرفراز کے لیے فون

ہے، کاؤنٹر پر جائیں۔“

ماضی میں ایک جرم کیا۔ لیکن اس کے بعد ایک اچھا انسان، ایک اچھا شوہر اور ایک ذمہ دار باپ بن کر رہنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہم سب اچھائیوں اور برائیوں کے مرکب ہیں۔ کسی بھی شخص کے اندر جھانک کر اس کی گہرائی میں اتر کر دیکھو تو وہ اندر ہی اندر شعوری یا غیر شعوری طور پر خدا سے خوف زدہ نظر آئے گا۔ یہی خوف ایک برے آدمی کو بھی نیکیاں کرنے پر مائل کرتا رہا ہے۔ میں بھی ایک غلطی کر کے پچیس برس سے اس کی تلافی کرتا آ رہا ہوں۔ تمہیں اپنے جگر کا ٹکڑا سمجھ کر گود میں کھلایا ہے۔ تمہاری پیاریوں میں راتوں کو جاگتا رہا ہوں اور تمہیں.....

شائستہ نے کہا۔ ”بس کریں۔ آپ نے ایک باپ کا رول اچھی طرح ادا کیا ہے۔ میرے نانا جان کسی بھی ایرے غیرے کو پانچ کروڑ کی لاگت سے ٹیکسٹائل مل قائم کر کے دیتے تو وہ بھی میری اسی طرح خدمت کرتا۔ آپ نے پانچ کروڑ کے عوض میری خدمت کی ہے، احسان نہیں کیا ہے۔“

سرفراز کو ایک دم سے چپ لگ گئی۔ رشیدہ نے سخت لہجے میں کہا۔ ”تمہیں ایسی بات کہتے ہوئے شرم آتی چاہیے۔ یہ کیوں بھولتی ہو کہ انہوں نے تمہاری ماں کی شرم رکھ لی۔ ہمارے خاندان کو بدنامی سے بچایا۔ یہ جو مل ہے، کاروبار کی آمدنی ہے، یہ کروڑوں روپے میرے اور بچوں کے لیے ہیں۔ یہ تو ایک منظم یا منجری حیثیت سے ہمارا کاروبار سنبھال رہے ہیں۔ کروڑوں روپے ان کی جیب میں یا اکاؤنٹ میں نہیں جا رہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے ممی! آپ اپنے شوہر کو عدالت میں لے جا کر درخواست کریں کہ یہ بڑے نیک بندے ہیں۔ پچیس برس سے نیکیاں کرتے آ رہے ہیں لہذا سلامت علی کا قتل معاف کر دیا جائے۔ آپ بتائیں کیا آپ عدالت میں ایسا کہہ سکیں گی؟ کیا قانون انہیں معاف کر دے گا؟ اور اگر کر دے گا تو ایک بیٹی اپنے باپ کے قاتل کو کیسے معاف کرے گی؟ نہیں کبھی نہیں، کبھی نہیں معاف کرے گی۔“

”خدا کے لیے جوش میں نہ آؤ۔ آہستہ بولو۔ کیا تم چاہتی ہو کہ دنیا والے مجھ پر تھوکتا شروع کر دیں؟“

”صرف آپ کی خاطر، ایک ماں خاطر اب تک اس معاملے کو اپنے اندر دبائے

”تم جانتی ہو۔ مل سے یہاں تک آنے میں کتنا وقت لگ جاتا ہے۔ پھر ایک جگہ کار میں خرابی پیدا ہو گئی تھی، کیا اب تک یہیں بیٹھی ہو؟“

”ہاں اس کا سامنا کرتے ہوئے کچھ شرم آتی ہے۔ کچھ خوف سا محسوس ہوتا ہے۔ ہم نے اسے ذہنی مریضہ بنا دیا ہے۔“

”وہ ذہنی مریضہ نہیں ہے۔ صرف انتقامی کارروائی کے طور پر الٹی سیدھی حرکتیں کرتی ہے۔ آؤ! ہم اسے سمجھائیں گے۔“

وہ شائستہ کے کمرے میں آئے۔ شائستہ نے سرفراز کو دیکھتے ہی منہ پھیر لیا۔ وہ بڑی خوش دلی سے بولا۔ ”ہماری بیٹی ہم سے ناراض ہے۔ بھی، ہم سے جو بھی غلطی ہوئی ہے اس کی سزا پانے کے لیے بیٹی کی عدالت میں حاضر ہو گئے ہیں۔“

وہ بولی۔ ”ممی! ان سے کہہ دیں، یہ مجھے بیٹی نہ کہیں۔ میرا نام شائستہ ہے۔“

”چلو، میں شائستہ کوں گا اور چاہوں گا کہ تم میری چند باتیں توجہ سے سن لو۔“

وہ ٹہلنے کے انداز میں ذرا قریب آیا پھر دور ہوتے ہوئے بولا۔ ”حقیقت یہ ہے کہ کوئی انسان صرف خوبیوں کا حامل نہیں ہے۔ ہر شخص میں بہت سی خوبیوں کے ساتھ ایک آدھ خرابی بھی ہوتی ہے۔ مجھ میں بھی ہے، تمہاری ماں میں بھی ہے، تم میں بھی ہے، سارے انسانوں میں ہے۔ ایک جھوٹ بولنے والی عورت لاکھ جھوٹی سہی، لیکن وہ اپنی اولاد کے لیے جان نچھاور کرنے والی ماں ہوتی ہے۔ میں نے شراب پینے والوں کو دیکھا ہے، بڑے بندہ پرور ہوتے ہیں۔ دوسروں کا دکھ نہیں دیکھ سکتے۔ میں نے ایک شرابی کو دیکھا تھا۔ وہ سڑک کے کنارے کار روک کر اترا اور اپنا قیمتی کوٹ اتار کر ایک بوڑھے پر ڈال دیا تھا۔ کیونکہ وہ بوڑھا سردی سے تھر تھرا کانپ رہا تھا۔“

وہ ٹہلتا ہوا قریب آیا۔ اس نے شائستہ پر ایک نظر ڈالی پھر کہا۔ ”تمہیں بہت غصہ آتا ہے۔ تم مغرور کھلتا ہو۔ لیکن ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ تمہارے سینے میں ایک محبت بھرا دل ہے۔ تم ملازموں کو جھڑکتی ہو مگر انہیں اچھی خاصی رقیں دے کر ان کے دکھ سکھ میں کام آتی رہتی ہو۔ اگر تمہاری ماں نے کوئی غلطی کی ہے تو اس غلطی سے قطع نظر وہ ایک بہترین بیوی اور اولاد کا مستقبل سنوارنے والی ماں ہے۔ ماں کی ایک غلطی کا حوالہ دے کر اس کی تمام نیکیوں اور اچھائیوں پر پانی نہیں پھیرنا چاہیے۔ میں نے بھی

وہ تھوڑی دیر تک سر جھکائے سوچتی رہی پھر بولی۔ ”آپ کا مشورہ اچھا ہے۔ لیکن میں تنہا جاؤں گی، ایک ہفتے تک مری میں بالکل تنہا رہوں گی۔“

”مگر بیٹی! تمہارا تنہا جانا مناسب نہیں ہے۔“

سرفراز نے کہا۔ ”کیوں مناسب نہیں ہے؟ کیا ہماری شائستہ نادان بچی ہے۔ رشیدہ! اگر تم بیٹی کو ذہنی طور پر صحت مند دیکھنا چاہتی ہو تو اس پر بھروسہ کرو۔ اسے ایک ہفتے تنہا رہنے دو۔ لیکن یہ بھی ایک بات مان لے۔ ایک ہفتہ بعد تم اس کے پاس مری جاؤ گی اور تم ماں بیٹی وہاں کچھ روز ساتھ رہو گی۔“

رشیدہ نے پوچھا۔ ”کیوں بیٹی! منظور ہے؟“

”آپ میری خوشی پوری کر رہی ہیں پھر میں آپ کی بات کیسے نہیں مانوں گی۔ مجھے منظور ہے۔ اب اسپتال سے چھٹی لیں اور گھر چلیں۔“

”تم بیٹھو، ہم بل ادا کر کے آتے ہیں۔“

وہ کمرے سے باہر آئے۔ رشیدہ نے کاؤنٹر کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ”میرا دل نہیں مانتا کہ وہ تنہا مری جائے۔“

”میرا دل کب مانتا ہے کہ وہ ایسی ذہنی حالت میں اکیلی جائے۔ میں نے اس کی دلجوئی کے لیے کہہ دیا ہے۔“

”لیکن وہ تو ضرور جائے گی۔“

”ضرور جانے دو۔ میں چھپ کر اس کے پیچھے جاؤں گا۔ وہ مری پہنچ کر ہمارے کانچ میں رہے گی۔ میں کسی قریبی کانچ میں رہ کر اس کی نگرانی کروں گا۔“

”سرفراز! تم بہت اچھے ہو۔ تم میری بیٹی کو سگی بیٹی کا پیار دیتے رہے ہو، آج تک تم نے کسی کو شبہ نہیں ہونے دیا کہ وہ تمہاری بیٹی نہیں ہے۔“

”میں نے تمہیں دل و جان سے اپنایا ہے اس لیے شائستہ بھی بالکل اپنی لگتی ہے۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ انشاء اللہ وہ بالکل نارمل ہو جائے گی۔“

شائستہ اپنے کمرے میں بیٹھی سوچ رہی تھی۔ میرے باپ کے قاتل نے می کو راضی کر لیا ہے کہ میں تنہا مری جاؤں۔ وہ کیوں چاہتا ہے کہ میں تنہا جاؤں۔ میرے ابو اوتے تو کیا مجھے اتنی دور تنہا جانے دیتے؟ نہیں، ہر باپ کو بیٹی کی عزت اور سلامتی کی فکر

ہوئے ہوں۔ میرے اندر لاوا پکتا ہے اور میں چیخ چیخ کر اپنے باپ کے قتل کا مجرا بیان نہیں کر سکتی تو ایب نارمل ہو جاتی ہوں۔ اب بھی یہی ہو گا اب میں اپنی معصوم بہن شازیہ کے خلاف کوئی حرکت نہیں کروں گی۔ آپ کی خاطر اپنے باپ کے قاتل کا گریبان بھی نہیں پکڑ سکوں گی۔ اس لیے آئندہ اپنے ہی خلاف حرکتیں کرو گی اور خود کو تباہی کی انتہا تک پہنچا دوں گی۔“

”بیٹی! کیا اس طرح میں تیرے بھائی بہن کے ساتھ سکون سے رہ سکوں گی۔ کیا تیری غلط حرکتوں سے دنیا والے باتیں نہیں بتائیں گے؟“

”مئی! صرف باتیں نہیں بتائیں گے۔ بدنام بھی کریں گے۔ آپ کو نہیں مجھے بدنام کریں گے۔ آپ اپنی بدنامی پر پردہ ڈال چکی ہیں۔ میں کبھی یہ پردہ نہیں اٹھاؤں گی۔ تنہا بدنامی کماؤں گی۔“

”یہ کیسی باتیں کر رہی ہو؟ کیا تمہاری بدنامی سے ہماری بدنامی نہیں ہو گی؟“

”نہیں، دنیا کسے گی، ماں باپ نہایت شریف اور نیک ہیں۔ بیٹی آوارہ ہو گئی ہے۔“

”کیا تم آوارہ ہو گئی؟ کیا آوارگی کرنا چاہتی ہو؟“

سرفراز نے کہا۔ ”رشیدہ! خاموش رہو۔ اپنی بیٹی کی ذہنی الجھنوں کو سمجھو۔ اس نے اپنے باپ کے حق میں جو کچھ کہا ہے، وہ حرف بہ حرف درست ہے۔ ہم اپنے بچاؤ کے لیے خواہ کتنی ہی باتیں بتائیں، سچائی اپنی جگہ اٹل رہے گی۔ تم صرف ماں ہی نہیں ایک سچی سیہلی بن کر اسے کہنی دو۔ اس کی ہر جائز بات تسلیم کرو۔ تب یہ تم پر بھروسہ کرے گی اور تمہارے تعاون سے کسی ایسے نتیجے پر پہنچے گی کہ پھر اسے بھی دلی سکون پہنچے گا اور ہمارا خاندان ایک بار پھر بدنامی کی دلدل سے نکل آئے گا۔“

شائستہ نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں مئی! سچ پوچھیں تو میں سکون چاہتی ہوں۔ دلی سکون۔“

”بیٹی! میرا ایک مشورہ مانو۔ میرے ساتھ مری یا سوات چلو، وہاں برف باری میں خوب انجوائے کرو گی۔ یاد ہے تم ہم سب کو برف کے گولے بنا کر مارتی تھیں اور ہم بھاگتے پھرتے تھے۔ چلو بیٹی! بڑا مزہ آئے گا۔“

ہوتی ہے۔ سرفراز کو میری فکر نہیں ہے۔ وہ جیسے نچاتا ہے، می ویسے ناچتی ہیں۔ انہوں نے بھی جانے کی اجازت دے دی ہے۔

میں نادان نہیں ہوں۔ خوب سمجھتی ہوں اسے خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ میں اسے عدالت میں پہنچاؤں گی۔ اسے قاتل ثابت نہ کر سکی تو اس پر اور می پر کچڑا چھالوں گی۔ ایک بیٹی کا یہی کہہ دینا بہت ہو گا کہ وہ بہت سرفراز نہیں، بہت سلامت ہے۔

میں جانتی ہوں۔ ایک بار پھر بدنامی کا اندیشہ پیدا ہوا تو اس نے میرے ابو کو قتل کر دیا۔ آج میں می کے لیے، اس کے لیے، اس کی بیٹی شازیہ کے لیے اور پورے خاندان کے لیے ایک دھمکی بن گئی ہوں۔ اس لیے وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میں تنہا می جاؤں گی تو وہ چھپ کر آئے گا اور ابو کی طرح مجھے بھی قتل کر دے گا۔

میں خوب سمجھتی ہوں مگر وہ نہیں سمجھ رہا ہے کہ ایک غریب ڈرائیور کو ہلاک کرنا آسان تھا۔ لیکن ایک مل اور ملک جان محمد کی نوای کو ہلاک کرنا اتنا ہی دشوار ہو گا۔ میں اسے بتاؤں گی کہ میرے باپ کا خون پانی نہیں تھا۔ ہاں پانی نہیں تھا..... اس لیے پچیس برس کے بعد بھی بول رہا ہے۔

☆-----☆-----☆

بشارت ایزی چنبر پر آدھا بیٹھا، آدھا لیٹا ہوا تھا۔ ڈاکٹر اس کی ایک ایک آنکھ کھول کر منہ سی ٹارچ کے ذریعے معائنہ کر رہا تھا۔ ”تمہاری آنکھیں بظاہر ٹھیک ہیں لیکن ان میں موتیا اتر آیا ہے۔ تم نے کسی اور ڈاکٹر سے کنسلٹ کیا تھا؟ کیسے علاج کرایا تھا؟“

”جی نہیں، پہلی بار آپ کے پاس آیا ہوں۔“

”تم لوگ پہلے مرض کو پالتے رہتے ہو۔ جب پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے تو ڈاکٹر کے پاس آتے ہو۔ ڈاکٹر کوئی جادوگر نہیں ہوتا۔ میں تمہیں آنکھوں میں ڈالنے اور کھانے کی دوائیں لکھ دیتا ہوں۔ انہیں استعمال کرو اور اپنی بینائی کے لیے دعا کرتے رہو۔“

”آپ مایوس نہ کریں۔ اندھوں کو بھی بینائی مل جاتی ہے اور ابھی تو میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔“

”دیکھ رہی ہیں مگر کسی وقت بھی بینائی جاسکتی ہے۔ موتیا بند کے علاوہ تمہارے دماغ کو بھی سخت چوٹ پہنچی ہے جس کا یہ رد عمل کبھی کبھی ہوتا ہے کہ بالکل اندھے ہو

جاتے ہو۔ موتیا بند کے مریضوں کی بینائی رفتہ رفتہ ختم ہوتی ہے مگر تمہارا کیس کچھ مختلف ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ کسی آئی بینک میں اپنا نام درج کرا لو۔ وہاں آنکھوں کے عطیے موصول ہوتے رہتے ہیں اور بینائی سے محروم ہونے والوں کو نمبر شار کے مطابق دوسری آنکھیں لگادی جاتی ہیں۔ تمہارا نام بھی وہاں شمار میں رہے گا۔“

اسے یاد آیا، جب وہ دس برس کا تھا تو سپارہ پڑھتے وقت غلطی کی تھی۔ مولوی صاحب نے اس کی پیٹھ پر ڈنڈا مارا مگر وہ سر پر لگا۔ وہ چیخ پڑا تھا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ پھر اسے ہوش نہیں رہا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد معلوم ہوا سر سے بہت خون بہہ گیا تھا۔ باپ اسے بھوئے آصل نامی گاؤں کی ایک ڈپنسری میں لایا تھا وہیں اس کی مرہم پٹی ہوئی تھی۔ تب ہی سے کبھی کبھی اس کا سر چکراتا تھا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا تھا۔

وہ ڈاکٹر سے آئی بینک کا پتا اور ایک خط لے آیا۔ آئی بینک کے ڈاکٹر نے بھی اس کا معائنہ کیا۔ پھر اس کا نام رجسٹر میں درج کر کے اسے نمبر کی ایک پرچی دے دی۔ وہ کوٹھی کی طرف واپس جاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ پیش آنے والی تباہی کے آثار پہلے سے نظر آتے ہیں۔ لیکن اکثر لوگ اس پر توجہ نہیں دیتے۔ اس نے بھی توجہ نہیں دی تھی اور مرض کو بڑھا لیا تھا۔ وہ اندھا ہونے کے خیال سے ہی نیم مردہ سا ہو جاتا تھا۔ توجہ کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ سے معافیاں مانگتا تھا ایسے میں اپنے اعمال یاد آتے تھے۔

اور ایسے میں اسے شائستہ یاد آ رہی تھی۔ وہ پچھل رات سے ہی پچھتا رہا تھا۔ اسے اچھی طرح احساس ہو گیا تھا کہ اس نے ایک دماغی مریضہ کو اور زیادہ تکلیف پہنچا کر پاگل بنا دیا ہے۔ اب کوئی موقع ملے گا تو اس سے معافی مانگے گا اور جو غلطی کی ہے اس کی تلافی کی طرح کرے گا۔

کوٹھی پہنچ کر پتہ چلا، شائستہ بی بی اسپتال سے آگئی ہے۔ ملک سرفراز خان لان میں ایک کرسی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ مالک کے پاس آکر بولا۔ ”جناب! بڑی بی بی جی کی طبیعت کیسی ہے؟“

”وہ ٹھیک ہے، تم کہاں گئے تھے؟“

”ڈاکٹر کے پاس گیا تھا۔ آپ سے ایک گزارش ہے۔ میں بڑی بی بی جی کے پاس جا

کر معافی مانگنا چاہتا ہوں۔“

سرفراز نے سراٹھا کر اسے دیکھا۔ ”کس بات کی معافی مانگنا چاہتے ہو؟“

”میری باتوں سے انہیں غصہ آیا تھا۔ وہ اپنی جگہ درست تھیں۔ کار کے ڈیش بورڈ

سے لفافہ انہوں نے نہیں نکالا تھا۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”جناب! کسی نے انہیں لفافہ نکالتے نہیں دیکھا بس یہ فرض کر لیا گیا کہ انہوں نے

یہ حرکت کی ہے۔ آج صبح اٹھ کر میں کوٹھی کے پیچھے گیا تو وہ لفافہ اور خط ایک پودے کے

پاس پڑا ہوا تھا۔“

”کہاں ہے وہ لفافہ؟“

”میں ابھی اسے پوسٹ کر کے آیا ہوں۔ جناب! یہ کسی ملازم کے چھوٹے بچے کی

شرارت ہو سکتی ہے۔ بی بی جی جھوٹے الزام کے باعث غصے سے پاگل ہو گئیں۔“

”تمہاری تصویر شازیہ کے کمرے میں کیسے پہنچ گئی؟ تم نہیں جانتے وہ بددماغ اور

نیم پاگل ہے۔ دوسروں کو بدنام کرنے کے لیے بے ہودہ حرکتیں کرتی رہتی ہے۔“

”پھر بھی ان کی تسلی اور دلجوئی کے لیے جھوٹ کہا جاسکتا ہے کہ ڈیش بورڈ سے

انہوں نے لفافہ نہیں نکالا تھا۔ میں معافی مانگوں گا تو انہیں ذہنی طور پر اطمینان حاصل

ہو گا۔“

”زیادہ ماہر نفسیات نہ بنو۔ جاؤ یہاں سے۔“

اس نے سر جھکا لیا۔ پھر جانے لگا۔ سرفراز اسے سوچتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پھر بولا۔

”ٹھہرو، ادھر آؤ۔“

وہ واپس آکر سامنے ادب سے کھڑا ہو گیا۔ سرفراز نے پوچھا ”تم شائستہ بی بی کی

بھلائی کے لیے کیا کر سکتے ہو؟“

”آپ جو بہتر سمجھ کر حکم دیں گے، اس پر عمل کروں گا۔“

”میں ایک خاص گھریلو معاملے میں تمہیں رازدار بننا رہا ہوں۔ میری باتیں غور سے

سنو۔ شائستہ بظاہر نارمل ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے رازداری سے بتایا ہے کہ وہ کسی وقت بھی

ایک خطرناک پاگل بن سکتی ہے۔“

بشارت کو اپنا ڈاکٹر یاد آیا۔ اس نے بھی یہی کہا تھا کہ وہ کسی وقت بھی بینائی سے

محروم ہو سکتا ہے۔ اس حوالے سے اس نے شائستہ کے لیے بے حد ہمدردی محسوس کی۔

سرفراز کہہ رہا تھا۔ ”ڈاکٹر نے مشورہ دیا ہے کہ اسے ناراض نہ کیا جائے۔ اسے خوش رکھا

جائے۔ اس کی کسی بات سے انکار نہ کیا جائے۔ وہ جو خواہش کرے، اسے پورا کیا جائے۔

اب اس کی خواہش ہے کہ وہ تنہا رہے۔ ہم اس کی ذہنی حالت کے پیش نظر اسے

تنہا جانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اور یہ بھی لازم ہے کہ اس کی خواہش کا احترام

کریں ورنہ پھر اس پر پاگل پن کا دورہ پڑے گا۔“

”جی جناب! ایسا ہو سکتا ہے۔ آپ حکم دیں، کیا میں کچھ کر سکتا ہوں؟“

”بہت کچھ کر سکتے ہو۔ ہم نے اسے جانے کی اجازت دی ہے اس لیے وہ ہماری یہ

بات مان لے گی کہ کل خود ڈرائیو نہ کرے، ڈرائیور کو ساتھ لے جائے گا۔ گے وہاں کی

برف باری میں نہیں رہ سکے گا لہذا تم جاؤ گے۔“

”میں حاضر ہوں جناب! بی بی جی کا پورا خیال رکھوں گا۔“

”کیسے خیال رکھو گے؟ اس پر دورہ پڑے گا، وہ کوئی ایسی ضد کرے گی جسے تم پورا

نہ کر سکو یا وہ مری کے بجائے دوسری طرف کہیں جانے کو کہے تو تم کیا کرو گے؟“

”واقعی ایسے وقت میں کیا کر سکوں گا؟ آپ ہی بتائیں مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”میں تمہیں ایک واک ٹاکی دوں گا۔ اسے آپریٹ کرنا سکھا دوں گا۔ تم اسے کار

میں کہیں چھپا کر رکھو گے۔ جب بھی موقع ملے گا مجھ سے رابطہ کر کے اس کے حالات

بتاتے رہو گے۔ میں تمہیں مشورے دیتا رہوں گا کہ تمہیں کن حالات میں کیا کرتے رہنا

چاہیے۔“

”جناب! یہ تو تدبیر اچھی ہے۔ میں عمل کروں گا لیکن سنا ہے کہ واک ٹاکی کے

ذریعے سویا دو سو گز کے فاصلے تک رابطہ ہوتا ہے۔“

”میں ہمیشہ تم سے سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر رہوں گا لیکن اس طرح کہ شائستہ

مجھے دیکھ نہ سکے۔ کیا تم اسے بتاؤ گے کہ میں چھپ کر اس کی نگرانی کر رہا ہوں؟“

”نہیں جناب! میں ایسا احمق نہیں ہوں۔ بی بی جی کو یہی یقین دلانا ہے کہ وہ مری

میں قیام کرنے بالکل تنہا آئی ہیں۔“

”تم نے اگر کامیابی سے یہ فرض ادا کیا تو انعام دوں گا اور اگر اس پاگل کی باتوں میں آکر کوئی حماقت کی تو نوکری سے نکال دوں گا۔“

”میں فرض ادا کروں گا جناب! آپ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔“

”کل تمہیں واک ٹاکی مل جائے گا۔ وہ پرسوں صبح چھ بجے یہاں سے روانہ ہوگی،

اب جاؤ۔“

شائستہ نے اپنی دو سیلیوں کے ساتھ کوٹھی سے نکل کر کہا۔ ”بشارت! گاڑی

لاؤ۔“

بشارت نے سرفراز کو دیکھا۔ وہ کڑک کے بولی۔ ”ادھر کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا میرا

حکم سنائی نہیں دیا؟“

سرفراز نے آہستگی سے کہا۔ ”میں نے ابھی تمہیں سمجھایا ہے کہ اس کی ہر بات

مان لیا کرو۔ جاؤ، فوراً حکم کی تعمیل کرو۔“

وہ تیزی سے گیراج کی طرف چلا گیا۔ شائستہ نے ناگواری سے سرفراز کو دیکھا پھر

مسکرا کر سیلیوں سے باتیں کرنے لگی۔ وہ دور تھی اس کی باتیں سنائی نہیں دے رہی

تھیں۔ وہ سننا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس کے اندر چھپی ہوئی نفرت کو بہت اچھی طرح سمجھ

چکا تھا۔

اس نے اسپتال میں کہا تھا۔ ”آپ نے ایک باپ کا رول اچھی طرح ادا کیا ہے۔

میرے نانا جان نے پانچ کروڑ کی لاگت سے ٹیکنیکل مل قائم کر کے دی ہے۔ آپ نے پانچ

کروڑ کے عوض باپ بن کر میری خدمت کی ہے، مجھ پر احسان نہیں کیا ہے۔“

ان سچی باتوں میں جو زہر تھا وہ سرفراز کی رگوں میں لہو کی طرح پھیل رہا تھا۔ یہ

درست تھا کہ اس نے دولت، شان و شوکت اور عیش و آرام کے لیے رشیدہ سے شادی

کی تھی اور ایک ڈرائیور کی بیٹی شائستہ کو بڑی کامیاب اداکاری سے باپ کا پیار دیتا رہا تھا۔

یہ بھی درست ہے کہ مل کی آمدنی رشیدہ کے اکاؤنٹ میں جاتی تھی لیکن ہیرا

پھیری کے لاکھوں روپے کا حساب رشیدہ نہیں جانتی تھی۔ پھر کوئی بھی شخص جائز یا ناجائز

طریقوں سے کما رہا ہے تو دولت اپنے ساتھ قبر میں نہیں لے جاتا ہے۔ اپنی اولاد کے لیے

چھوڑ جاتا ہے۔ سرفراز اپنی بیٹی شازیہ اور زبیر کو بہت چاہتا تھا اور اب یہ اندیشہ پیدا ہو گیا

تھا کہ شائستہ اپنے باپ کا انتقام لینے کے لیے کوئی ایسی سیدھی حرکت کرے گی۔ اسے

جمل ثابت کرنے میں ناکام رہے گی تو اس کی بیٹی شازیہ اور زبیر کو ضرور نقصان پہنچائے

گی۔

اس نے سوچتے سوچتے دیکھا۔ شائستہ اپنی سیلیوں کے ساتھ کار میں بیٹھ کر جاری

تھی۔ اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے ڈرائیور سلامت واپس آگیا ہے۔ یا اس کی روح اپنی

بیٹی کے اندر سما گئی ہے اور اب اپنے قاتل سے اور قاتل کے بچوں سے پرانا حساب چکانے

والی ہے۔

شائستہ نے اسپتال میں کہا تھا کہ شاید قانون معاف کر دے لیکن بیٹی اپنے باپ کے

قاتل کو کبھی نہیں، کبھی نہیں معاف کرے گی۔

یہ کھلا چیلنج تھا کہ وہ کسی وقت بھی قاتل کو یا اس کے بچوں کو نقصان پہنچانے کی ہر

تذییر آزمائے گی۔ اگرچہ وہ اس کے سامنے دودھ پیتی بچی تھی لیکن وہ بچپن سے تیز طرار

اور ضدی تھی۔ ماں باپ کی دھونس میں رہنے والی نہیں تھی۔ پھر ماں باپ کی ہسٹری

معلوم ہونے کے بعد وہ باغی اور خود سر ہو گئی تھی۔ ایسا ہوتا آیا ہے کہ بغاوت کو چکانا با

سکے تو باغی کو کچل دیا جاتا ہے۔ وہ اپنی ازدواجی اور گھریلو زندگی کے لیے اور خاص طور پر

شازیہ اور زبیر کی سلامتی، سکون اور خوشحالی کے لیے اس ایک سنپولی کو کچل دینے کا ارادہ

کر چکا تھا۔

☆————☆————☆

بشارت نے شائستہ کی سیلیوں کو اقبال ٹاؤن پہنچا دیا۔ وہاں سے واپسی پر شائستہ

بچھلی سیٹ پر تنہا رہی۔ وہ بولا۔ ”بی بی جی! میں بہت شرمندہ ہوں۔ کل سے میرا ضمیر مجھے

ملامت کر رہا ہے۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔“

شائستہ نے اسے گہری سنجیدگی سے دیکھا پھر کہا۔ ”شرمندہ ہونے اور معافی مانگنے کی

ضرورت نہیں ہے۔ میں ایک بد دماغ اور پاگل لڑکی ہوں۔ میرے ساتھ یہی سلوک ہونا

چاہیے تھا۔“

”نہیں بی بی جی! آپ بہت اچھی ہیں۔ شازیہ بی بی آپ کو پاگل بنانا چاہتی ہیں۔ ان

کے حکم پر میں نے کل جھوٹ کہا تھا کہ ڈیش بورڈ سے تصویر اور خط والا لفافہ گم ہو گیا

ہے۔ شازیہ بی بی نے چال ایسی چلی تھی کہ آپ کو ضرور غصہ آتا اور غصہ آگیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ کو اس قدر دماغی صدمہ پہنچے گا۔ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں، کل رات سو نہ سکا۔ آپ کی صورت نگاہوں میں گھومتی رہی اور میں خود کو لعنت ملامت کرتا رہا۔

وہ جیسے دور خلا میں تکتے ہوئے بولی۔ ”میں بہت مغرور ہوں شاید مجھے غرور کی سزا مل رہی ہے۔ تم نہیں جانتے، میں بہت سے رشتوں کی بھیڑ میں اکیلی ہوں۔ میرا سب سے رشتہ ہے اور کسی سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ یہ ایسا دکھ ہے جسے کوئی سمجھ نہیں پائے گا۔“ ”بی بی جی! میں ایک معمولی سا بندہ ہوں مگر دل سے آپ کے کام آنا چاہتا ہوں۔ آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتی۔ جس پر بھی اعتبار کروں گی، وہ مجھے پاگل سمجھ کر میرا کام کر دے گا۔ اور میں کسی کی ہمدردی نہیں چاہتی۔“ ”آپ مجھے بتائیں، کس طرح مجھ پر بھروسہ کر سکتی ہیں۔“ ”اس پر کر سکتی ہوں، جو مجھ سے ہمدردی نہیں بلکہ محبت کرے گا۔“

وہ ذرا پریشان ہوا کیونکہ دل سے اس کا دکھ محسوس کر رہا تھا۔ اس کی آواز میں بلا کا درد تھا۔ سرفراز نے سمجھایا تھا کہ وہ پاگل ہے لیکن بشارت کا دل نہیں مان رہا تھا۔ پھر کوئی بھی ہو، وہ محبت اور نرم رویے سے قائل ہوتا ہے۔ سرفراز کے رویے میں مالکانہ رعب و دبدبہ تھا۔ اس کے برعکس شائستہ محبت اور دکھ بھرے لہجے میں بول رہی تھی اور کسی بھی غریب کو ایسا ہی انداز متاثر کرتا ہے۔

اس نے کہا۔ ”آپ محبت کرنے والے پر بھروسہ کریں گی۔ اگر میں آپ کے برابر ہوتا تو.....“

وہ بولی۔ ”محبت میں سب برابر ہوتے ہیں۔ کوئی امیر، کوئی غریب، کوئی آقا، کوئی غلام نہیں ہوتا۔ لیکن میرے لیے ایک بڑی مشکل ہے۔“

”کیسی مشکل؟“

”یہی کہ اگر میں کسی غریب کو یا کسی ملازم کو ایک اچھا انسان سمجھ کر محبت کروں تو صرف دنیا والے ہی نہیں، وہ ملازم بھی مجھے پاگل سمجھے گا۔“

وہ فوراً ہی سڑک کے کنارے گاڑی روک کر پچھلی سیٹ کی طرف گھوم کر بولا۔ ”آپ کو پاگل سمجھنے والے خود پاگل ہوں گے۔ ابھی صاحب کہہ رہے تھے کہ آپ پاگل ہیں مگر میرا دل میرا دماغ کہتا ہے کہ آپ نارمل ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا وہ آپ کے والد ہو کر آپ کے متعلق ایسی رائے کیوں رکھتے ہیں۔“

شائستہ نے اگلی سیٹ کی طرف جھک کر اس کے قریب ہو کر پوچھا۔ ”ایک راز کی بات بتاؤں؟ تم پر بھروسہ کروں؟“

”آپ ایک بار بھروسہ کریں پھر میری وفاداری کا یقین ہو جائے گا۔“ ”میں اپنے خاندانی رشتوں کی ایسی بات کہہ رہی ہوں، جو ماں باپ کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے۔ یہ ملک سرفراز میرا سوتیلا باپ ہے۔“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا واقعی؟“ ”تم خود عقل سے سوچو۔ کیا سگا باپ کسی ملازم سے کہے گا کہ اس کی بیٹی پاگل ہے؟“

”واقعی یہ عقل سے سوچنے کی بات ہے۔ اپنا باپ عیب چھپاتا ہے، سوتیلا ظاہر کرتا ہے۔“

”صرف ظاہر نہیں کرتا ہے، اندر ہی اندر دشمنی بھی کر رہا ہے۔ میرا رشتہ کہیں سے بھی آئے وہ چپ چاپ لڑکے والوں سے کہہ دیتا ہے کہ میں نیم پاگل ہوں۔ بظاہر نارمل دکھائی دیتی ہوں۔“

”بی بی جی! صاحب نے ابھی مجھ سے بھی یہی کہا تھا کہ آپ بظاہر نارمل ہیں لیکن ڈاکٹر نے انہیں بتایا ہے کہ آپ کسی وقت بھی خطرناک پاگل بن سکتی ہیں۔“ شائستہ کو اندر سے آگ لگ گئی۔ وہ برداشت کرتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں ایسا کہنے کی وجہ ہوگی؟“

”جی ہاں۔ اب میں آپ سے نہیں چھپاؤں گا۔ وہ آپ کے خلاف مجھ سے جاسوسی کرنا چاہتے ہیں۔“

”جاسوسی؟“ اس نے فوراً دروازہ کھولا۔ پچھلی سیٹ سے نکل آئی پھر اس دروازے کو بند کر کے اگلا دروازہ کھولا۔ وہ حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ شائستہ نے اس کے

برابر بیٹھے ہوئے دروازے کو بند کیا۔ بشارت نے شدید حیرانی سے کہا۔ ”آ..... آپ یہاں؟ کک..... کوئی دیکھے گا تو.....“

”مجھے کسی کے دیکھنے کی پرواہ نہیں ہے۔ تم بولو کیا میں تمہارے پاس بیٹھنے کے قابل نہیں ہوں؟“

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں تو آسمانوں میں اڑ رہا ہوں۔ مجھے تو سارے جہاں کی دولت مل رہی ہے مگر آ..... آپ بدنام ہو جائیں گی۔“

”بدنام نہیں ہوں گی۔ پاگل کلاؤں گی اور تمہارے برابر بیٹھ کر پاگل کھلانے میں فخر محسوس کروں گی۔“

وہ بدحواس سا ہو کر آنکھیں پھاڑے، منہ کھولے اسے دیکھ رہا تھا۔ دیکھ اور سن کر بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ آسمان زمین کی گود میں آ گیا ہے۔ خواب سا لگ رہا تھا۔ وہ بولی۔ ”میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں، محبت میں سب برابر ہوتے ہیں۔ نہ کوئی غلام ہوتا ہے نہ کوئی آقا زادی۔“ وہ اپنا ہاتھ پیش کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ خواب نہیں ہے، چھو کر دیکھ لو۔“

اس نے جھجکتے ہوئے اسے چھو لیا۔ گورا گورا چمکنا چمکنا ہاتھ نہایت ہی حرارت بخش اور پُرکشش تھا۔ چھونے کی اجازت ملی تھی اس نے پکڑ لیا۔ شائستہ نے اعتراض نہیں کیا۔ اس سے پوچھا۔ ”صاحب! کس قسم کی جاسوسی کر رہے ہیں؟“

وہ ریکارڈ کی طرح بولنے لگا۔ سرفراز نے جو کہا تھا، وہ ساری باتیں بتاتا گیا۔ اس نے خوبصورت سے ہاتھ کو تھام رکھا تھا۔ پھر خوبصورت سے ہاتھ نے اس کے ہاتھ کو تھام کر کہا۔ ”بشارت! تم نے یہ ساری باتیں بتا کر ثابت کر دیا ہے کہ تم قابل اعتماد ہو۔ اب میں آنکھیں بند کر کے تم پر بھروسہ کروں گی۔“

”اور میں مرتے دم تک آپ کے اعتماد کو قائم رکھوں گا۔“

”تم میرا اس طرح ساتھ دو کہ صاحب بھی تم سے خوش رہیں اور ہماری محبت بھی قائم و دائم رہے۔“

محبت۔ وہ اپنی زبان سے اس کے لیے محبت کا لفظ ادا کر رہی تھی۔ ایک غریب کی دنیا میں چاروں طرف پھول ہی پھول کھل رہے تھے۔ وہ بولا۔ ”آپ جیسا کہیں گی، ویسا ہی

کروں گا۔“

”گاڑی چلاؤ اور لمبے راستے پر لو، گھر جانے کی جلدی نہیں ہے۔“

اس نے کار اشارت کر کے آگے بڑھا دی۔ شائستہ نے کہا۔ ”صاحب تمہیں بیسہ کہہ رہے ہیں ویسا ہی کرتے جاؤ۔ پرسوں صبح تم ہی ڈرائیور بن کر میرے ساتھ مری جاؤ گے اور واکا ٹاکی کے ذریعے میرے متعلق رپورٹ دیتے رہو گے۔“

”بی بی جی! وہ سوتیلے ہیں۔ مجھے تو ان کے ارادے اچھے نہیں لگتے۔“

”ہم نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا ہے۔ مجھے بی بی جی نہ کہو۔ میرا نام شائستہ ہے، مجھے پیار سے شائی کہا کرو۔ شائی کے معنی معلوم ہیں۔“

”جی ہاں۔ شائی معنی شرمیل۔“

”ارے واہ! تم تو خاصی انگریزی جانتے ہو۔“

”اب میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ آپ اور آپ کے والدین پچھلی سیٹ پر جتنی انگریزی بولتے رہے تھے، اتنی میں سمجھ لیا کرتا تھا۔“

وہ انگریزی میں بولی۔ ”پھر تو ہم انگریزی میں گفتگو کر سکتے ہیں۔“

وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ ”میں سب سمجھ لیتا ہوں۔ سی این این والوں کی باتیں بھی سمجھ میں آ جاتی ہیں لیکن بول نہیں سکتا۔ بولتے وقت جھجکنے لگتا ہوں۔“

”کوئی بات نہیں۔ میں چند دنوں میں فر فر بولنا سکھا دوں گی۔“

”وہ تو سیکھ لوں گا لیکن آپ کو مری نہیں جانا چاہیے، خطرہ ہے۔“

”کیا تمہارے جیسے باڈی بلڈر کے سائے میں محفوظ نہیں رہوں گی؟“

”آپ نے مجھے صاحب کا وفادار رہنے کو کہا ہے۔ آپ یہ شرط ختم کر دیں پھر دیکھیں کہ صاحب کا باپ بھی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ ابھی وفادار رہو، جب مناسب سمجھوں گی، وفاداری کی شرط ختم کر دوں گی۔ مجھے پینترے بدلنے آتے ہیں۔ اب گھر چلو۔“

اس نے کار دوسرے راستے پر موڑ دی۔ شائستہ کے دماغ میں بہت سی باتیں ایک دوسرے سے الجھ رہی تھیں۔ سگی ماں، سوتیلہ باپ اور اسی باپ کی سازشیں۔ پھر زندگی کی اس اہم بازی میں ڈرائیور بشارت شامل ہو گیا تھا۔

اس کی شمولیت میں اس بات کی اہمیت تھی کہ وہ ڈرائیور تھا۔ شائستہ نے اس پہلو سے نہیں سوچا تھا کہ اس کا باپ ڈرائیور تھا۔ اس لیے وہ ایک ڈرائیور پر بھروسہ کر رہی ہے اور اسے سرفراز سے توڑ کر اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہی ہے۔ یہ سب کچھ وہ غیر شعوری طور پر کر رہی تھی۔ اس نے سوچا محبت کا ٹانگ کرے گی۔ اسے بے وقوف بنا کر اپنا کام نکالتی رہے گی۔ لیکن جب بشارت نے اپنے سخت اور مضبوط ہاتھوں سے اس کا ہاتھ پکڑا تو ایک دم سے اپنا مقتول باپ یاد آگیا۔ یہ سحر طاری ہوا کہ وہ اپنی ماں کی جگہ لے رہی ہے۔ اب سے پچیس برس پہلے اس کی ممی اسی طرح کار میں بیٹھی ہوں گی اور اس کے ابو ڈرائیور نے اسی طرح ممی کا ہاتھ پکڑا ہوگا۔ ان لمحات میں اس نے بشارت میں اپنے باپ کی جھلک دیکھی۔ یہ نفسیاتی حقیقت ہے کہ لڑکیاں باپ سے بے انتہا محبت کرتی ہیں اور اپنے محبوب میں کسی نہ کسی پہلو سے باپ کی جھلک پاتی ہیں۔ اسی لیے محبوب سے متاثر رہتی ہیں۔ ان لمحات میں اس حقیقت نے بھی اسے بشارت سے متاثر کیا کہ وہ کسی مل اونر کی نہیں، ایک ڈرائیور کی بیٹی ہے اور وہ خیر اسے اپنی ہی خاک کی طرف کھینچ لایا ہے۔

پہنچی دیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

☆=====☆=====☆

خواب گاہ میں گہری خاموشی تھی۔ سرفراز صوفہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے سنٹر ٹیبل پر بوتل کھلی ہوئی تھی۔ گلاس آدھا خالی ہو گیا تھا۔ بوتل بھی آدھی خالی ہو چکی تھی۔ رشیدہ بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ اسے بھی نیند نہیں آرہی تھی۔ آخر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر بولی۔ ”بس کریں، آپ اتنی تو نہیں پیتے ہیں۔“

”اتنا زہر بھی پہلے کبھی نہیں پیا تھا۔“

وہ بستر سے اٹھ کر آئی۔ اس کے سامنے صوفہ پر بیٹھ کر بولی۔ ”شائستہ کی بات مجھے بھی تیر کی طرح لگی تھی۔ وہ سمجھتی ہے کہ آپ کروڑوں کی مل کے مالک بننے کے عوض باپ بن کر اس پر کوئی احسان نہیں کر رہے ہیں۔ وہ پاگل ہے، جنونی ہے آپ اسے سچے دل سے اپنی بیٹی سمجھتے رہے ہیں، ایک باپ کے دل سے اسے معاف کر دیں۔“

اس نے ایک گھونٹ پی کر کہا۔ ”تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میں اس سے ناراض نہیں ہوں۔ وہ ہماری بیٹی ہے۔ میں تو کچھ اور سوچ رہا ہوں۔“

”کیا سوچ رہے ہیں مجھے بھی بتائیں۔“

”ہم اب تک یہی سمجھتے رہے ہیں کہ وہ ذرا ایب نارمل ہے۔ وقتی طور پر اس کے مزاج میں گرمی آتی ہے۔ پھر وہ نارمل ہو جاتی ہے۔ اس کے جنون کی بنیادی وجہ ہمیں معلوم نہیں تھی۔ آج وہ اسپتال میں کھل گئی۔ آج حقیقت معلوم ہوئی کہ وہ اپنے باپ سلامت کے متعلق بہت کچھ جانتی ہے اور مجھے باپ نہیں باپ کا قاتل مان چکی ہے۔“

”ہاں یہ برا ہوا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ املا اسے یہ راز بتا دیں گی۔“

”شائستہ بہت چالاک ہے۔ اس نے اپنی نانی کو آخری وقت میں خدا کا خوف دلایا۔ انسان جب موت کو اپنے سامنے دیکھتا ہے تو جھوٹ بولنا بھول جاتا ہے۔ جتنا سچ ہوتا ہے وہ سب اگل دیتا ہے۔ اس لڑکی نے موقع سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے اور ہمارے لیے مسائل پیدا کر دیے ہیں۔“

”سوچو تو مسائل پہاڑ لگتے ہیں، کوشش کرو تو رفتہ رفتہ حل ہو جاتے ہیں۔ آپ بہت ذہین ہیں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ ہم دونوں مل کر اسے سمجھائیں گے۔“

”اس کے تیور بتا رہے ہیں، وہ ہماری بات نہیں سمجھے گی۔ تم جواب دو، اگر کوئی مجھے یا شائستہ کو یا زبیر اور شازیہ کو قتل کرے تو کیا تم اسے معاف کرو گی؟“

”خدا نہ کرے ہمارے خاندان میں اور کوئی قتل ہو۔ آپ ایسی باتیں نہ کریں۔“

”تم نے جواب نہیں دیا۔ مگر میں جانتا ہوں، تم قاتل کو نہ معاف کرو گی نہ اس سے کوئی رشتہ رکھو گی۔ خواہ تمہیں کتنا ہی سمجھایا منایا جائے۔ یہی حال شائستہ کا ہے۔ تم اس پہلو سے نہ سوچو کہ وہ مجھے کبھی معاف کر دے گی۔ وہ اپنی آخری سانس تک مجھ کو، شازیہ کو اور زبیر کو ختم کر دینے کی تدبیر کرتی رہے گی۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ شازیہ اور زبیر اس کے اپنے ہیں۔ میں نے انہیں پیدا کیا ہے۔“

”اس تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ شازیہ اور زبیر اس کے باپ کے قاتل کے بچے ہیں۔“

کے لیے مری جا رہی ہے۔ دعا کرو کہ وہ تہا اور پُرسکون رہ کر منفی خیالات سے نجات حاصل کر لے۔ اگر ایسا نہ کر سکی تو صاف ظاہر ہے وہ نارمل نہیں رہے گی۔ اشتقامی کارروائی کے لیے جوش اور جنون کا مظاہرہ کرے گی تو اسے مینٹل اسپتال پہنچانا ہی ہو گا۔

”کیا وہاں علاج ہو جائے گا؟“

”علاج ہو سکتا ہے۔ لیکن خطرناک مریضہ ثابت ہو گی تو اسے پاگل خانے میں رکھا جائے گا۔“

”نہیں، میں اپنی بیٹی کو پاگل خانے نہیں جانے دوں گی۔“

”تو پھر اس خطرناک مریضہ کو تم اپنے پاس یہاں رکھو۔ میں اپنے دونوں بچوں کو لے کر ملک سے باہر چلا جاؤں گا۔“

”آپ مجھے آزمائش میں ڈال رہے ہیں۔“

”نہیں، تم ایک بیٹی کے لیے اپنے شوہر اور دو بچوں کو خطرات میں ڈالنا چاہتی ہو۔ اپنی ممتا سے پوچھو، کیا اس وقت تم اپنے دو بچوں کو نظر انداز نہیں کر رہی ہو اور اپنی عقل سے سوچو ایک خطرناک پاگل کو گھر میں رکھنا کہاں کی دانشمندی ہے؟“

”ابھی وہ پاگل نہیں ہے اور آپ اسے خطرناک پاگل کہہ رہے ہیں۔“

”میں نے کب کہا کہ وہ ابھی خطرناک ہے۔ ہم تو اس کی بہتری کے لیے دعا بھی کریں گے، دوا بھی کریں گے اگر وہ نارمل نہ ہوئی اور مینٹل اسپتال کی میڈیکل رپورٹ اسے خطرناک قرار دے گی تب تمہیں فیصلہ کرنا ہو گا کہ اسے پاگل خانے بھیجنا دانشمندی ہو گی یا اسے گھر میں رکھ کر ہمیں گھر سے نکلنے پر مجبور کر دو گی۔“

”میرا دل نہیں مانتا کہ اسے ایک ہفتے کے لیے جانے دوں۔“

”اسے جانے دو۔ یہ بھی علاج کا ایک طریقہ ہے۔ اسے پُرسکون رہنے کا موقع دینا چاہیے۔ مجھ پر بھروسہ کرو۔ میں چھپ کر اس کی نگرانی کرتا رہوں گا۔ میں نے ڈرائیور بشارت کو رازدار بنا لیا ہے۔ وہ اسے مری لے جائے گا۔ اس کے پاس ایک واک ٹاکی ہو گی، اس کے ذریعے وہ مجھے شائستہ کی ذہنی حالت اور اس کی مصروفیات کے بارے میں اطلاع دیتا رہے گا۔ میرے پاس اپنا موبائل فون ہو گا۔ اس کے ذریعے میں تم سے رابطہ رکھوں گا اور ہر چار گھنٹے بعد تمہیں شائستہ کے حالات بتاتا رہوں گا۔“

رشیدہ کا منہ حیرانی اور پریشانی سے کھلا رہ گیا۔ سرفراز نے کہا۔ ”ذرا غور کرو۔ وہ اب تک شازیہ اور زبیر سے کس طرح لڑتی جھگڑتی اور انہیں کتہربانے کی کوششیں کرتی آئی ہے۔ کل شازیہ کو بد چلن ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی۔ وہ ایسی ہی حرکتیں کرتی رہے گی تو کیا کبھی شازیہ کا رشتہ آئے گا۔ رشتہ لانے والے میری بیٹی کو بد چلن سمجھ کر لوٹ جایا کریں گے۔“

”آپ درست کہہ رہے ہیں۔ اس کا کوئی حل سوچنا چاہیے۔“

”میں شائستہ کی آنکھوں سے سلامت کو جھانکتے دیکھ رہا ہوں۔ تم مانو یا نہ مانو میں اور میرے دونوں بچے محفوظ نہیں ہیں۔ تم نے دیکھا ہے وہ کیسی جنونی ہو جاتی ہے۔ کسی کے قابو میں نہیں آتی۔ جبراً قابو میں کیا جائے تو بے ہوش ہو جاتی ہے، کبھی اس کے جنون کے وقت میں موجود نہیں رہوں گا تو وہ شازیہ یا زبیر پر ضرور قاتلانہ حملے کرے گی۔“

”میرا کلیجہ کانپ رہا ہے۔ خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کریں۔“

”کیا ایسی باتیں نہ کرنے سے حقیقت بدل جائے گی؟ شازیہ اور زبیر کو تم نے پیدا کیا ہے۔ کیا ان کے سروں پر منڈلانے والے خطرے کو تم تسلیم نہیں کرو گی اور شائستہ کی خاطر باقی بچوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لو گی؟“

”میری سمجھ میں نہیں آتا، میں کیا کروں۔ سب میرے اپنے ہیں۔ پھر آپ یہ تو سوچیں، شائستہ ایک کمزور لڑکی ہے۔ وہ قتل جیسا اقدام نہیں کر سکے گی۔“

”یاد کرو رشیدہ! تمہارے ابو نے سلامت کو خود قتل نہیں کیا تھا، مجھ سے قتل کرایا تھا۔ شائستہ کو ایک نہیں درجنوں کرائے کے قاتل مل سکتے ہیں۔“

وہ سر پکڑ کر سوچنے لگی۔ سرفراز نے کہا۔ ”اس کا ایک ہی حل ہے کہ شازیہ اور زبیر کو یہاں سے کہیں دور بھیج دیا جائے یا شائستہ کو ان سے دور رکھا جائے۔“

”میں بچوں کو نظروں سے دور نہیں کروں گی۔“

”ان کی سلامتی کے لیے ایسا ہی کرنا ہو گا۔ میرا مشورہ ہے، شائستہ کو مینٹل اسپتال میں داخل کر دو۔“

”لیکن وہ پاگل نہیں ہے نارمل ہے۔“

”قتل کرنے یا قتل کا ارادہ کرنے والے ایب نارمل ہوتے ہیں۔ ابھی وہ ایک ہفتے

”ہاں! آپ یہ ضرور کریں کہ دن رات بیٹی کی خبر مجھے ملتی رہے۔ تب ہی میں یہاں اطمینان سے رہ سکوں گی۔“

اس نے رشیدہ کو اطمینان دلایا۔ بوتل بند کر کے الماری میں رکھی پھر بستر پر آکر لیٹ گیا۔ دماغ میں بہت سی باتیں پک رہی تھیں۔ ایسے میں نیند نہیں آتی لیکن نشتے کی زیادتی نے اسے سلا دیا۔

دوسری صبح وہ بشارت کے ساتھ کوٹھی سے نکلا۔ اس نے کار ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔ ”جناب! شائستہ بی بی اپنی ایک سہیلی کے ساتھ کہیں گئی ہیں۔ گامے چاچا انہیں لے گئے ہیں۔ حالانکہ گاڑی میں نے نکالی تھی۔ بی بی جی شروع سے مجھے پسند نہیں کرتی ہیں“ ایسا نہ ہو کہ وہ میرے ساتھ مری جانے سے انکار کر دیں۔“

سرفراز نے کہا۔ ”پرواہ نہ کرو۔ میں شام ہی کو گامے کی یہاں سے چھٹی کر دوں گا۔ وہ مل میں جا کر رہے گا۔ شائستہ کو بتایا جائے گا کہ وہ اچانک پنڈ چلا گیا ہے۔ اس کا کوئی عزیز بیمار ہے، تم ایبٹ روڈ ڈاکٹر جمالی کی کلینک چلو۔“

بشارت نے کلینک کے سامنے گاڑی روک دی۔ سرفراز کار سے نکل کر کلینک کے اندر چلا گیا۔ کوئی بیس منٹ کے بعد واپس آیا۔ پھر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بشارت نے گاڑی آگے بڑھائی۔ سرفراز نے کہا۔ ”واپس چلو۔ میں تمہاری ترقی کے لیے بہت کچھ سوچ رہا ہوں۔ تم دس جماعتیں پاس ہو۔ ڈرائیو رہ کر زندگی نہ گزارو۔ میں اپنی مل میں کلرک رکھوں گا۔ پھر تم جتنی جلدی کام سیکھو گے، اتنی ہی ترقی کرو گے، منیجر اور جنرل منیجر بن جاؤ گے۔“

”آپ کی مہربانی ہے جناب! آپ مجھ ناچیز کو بلکہ ایک ذرے کو آفتاب بنا رہے ہیں۔“

”جو میرا وفادار رہتا ہے، میں اسی طرح اس کی قدر کرتا ہوں۔ آگے جا کر نہر کے کنارے کسی درخت کے سائے میں گاڑی روک دو۔“

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ نہر کے کنارے ایک درخت کے سائے میں کار روک دی۔ سرفراز نے بریف کیس سے ایک واک ٹاک نکال کر اسے آپریٹ کرنا سکھایا پھر کہا۔ ”اسے چمپا کر رکھو۔ جب بھی موقع ملے، مجھ سے رابطہ کرتے رہو۔ اس کے علاوہ تم سے

ایک بہت اہم کام لینا چاہتا ہوں۔ کام بہت معمولی سا ہے۔ یہ دس ہزار روپے ہیں۔“ اس نے بریف کیس سے نوٹوں کی ایک پتلی سی گڈی نکال کر اسے دی۔ اس نے پوچھا۔ ”جناب! یہ کس لیے ہے؟“

”یہ تمہاری وفاداری کا انعام ہے۔ کام ہو جائے گا تو اور دس ہزار دوں گا۔“

”کام کیا ہے جناب؟“ اس نے جیب سے ایک چھوٹی شیشی نکالی۔ اسے دکھاتے ہوئے کہا۔ ”اس میں دوا ہے، یہاں سے مری جانے تک سفر کے دوران یا کسی وقت بھی شائستہ چائے پانی یا بوتل پینے کے لیے منگوائے تو اس میں اس دوا کا ایک قطرہ ٹپکا دینا۔“

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”یہ..... اس میں کیا ہے جناب؟“ ”زہر نہیں ہے۔ دوا ہے۔ وہ خود کو نازل سمجھتی ہے دوا پینے سے انکار کرتی ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اس کی لاعلمی میں اسے دوا پلائی جائے۔ تم ہمارے وفادار ہو، تمہیں شائستہ بی بی کی بھلائی کے لیے اسے دوا پلانے کے لیے ہم سے تعاون کرنا چاہیے۔“

”میں ضرور تعاون کروں گا۔“ ”تم اس دوا کا ذکر کسی سے نہیں کرو گے۔“

”کسی سے نہیں کروں گا۔“ ”شائستہ کو بھی کسی طرح شبہ نہیں ہونے دو گے۔“

”میں بہت چالاکی سے دوا پلاؤں گا، بی بی جی کو خبر نہیں ہوگی۔“ ”شبلاش۔ تم بہت جلد ترقی کرو گے۔ مری سے واپسی پر تمہیں مزید دس ہزار روپے بھی ملیں گے اور مل میں کلرک کی ملازمت بھی مل جائے گی، اب چلو!“

بشارت نے کار اشارت کر کے آگے بڑھا دی۔ پچھلی رات سرفراز نے رشیدہ سے کہا تھا کہ اگر شائستہ مری سے واپس آنے کے بعد نازل نہیں رہے گی اور انتقامی کارروائی کے لیے جوش اور جنون کا مظاہرہ کرے گی تو اسے پاگل خانے بھیج دیا جائے گا۔

وہ ڈاکٹر جمالی سے دماغی کمزوری کی دوا لے کر آیا تھا اور وہ دوا بشارت کو دی تھی۔ ہر مشروب کے ساتھ اس کا ایک ایک قطرہ شائستہ کو ذہنی مریض بنا سکتا تھا۔ ایسے میں منصوبہ یہ تھا کہ وہ مختلف طریقوں سے شائستہ کو غصہ دلاتا رہے گا۔ یہ چیلنج کرتا رہے گا کہ

وہ اپنے باپ کے قتل کا بدلہ نہیں لے سکے گی۔ وہ دماغی کمزوری کے باعث غصے میں آئے گی اور جنون میں قاتلانہ حملے کرے گی یا قتل کرنے کی دھمکیاں دیتی رہے گی۔ یوں ثابت ہوتا رہے گا کہ وہ خطرناک پاگل ہے۔

وہ دماغی کمزوری کے باعث غصے اور جذبات پر قابو نہیں رکھ سکے گی پھر وہی ہوگا جو وہ چاہتا تھا۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق اسے پاگل خانے بھیج دیا جائے۔ اس کے بعد وہ پھر کبھی اسے وہاں سے واپس نہیں آنے دے گا۔

☆-----☆-----☆

شائستہ بستر پر لیٹی ہوئی دھیمی آواز میں موسیقی سن رہی تھی۔ اسے علی الصباح بیدار ہو کر مری کے لیے روانہ ہونا تھا۔ فکر اور پریشانیاں دماغ میں شور مچاتی ہوں تو نیند نہیں آتی۔ اس نے رات کے دس بجے دو خواب آور گولیاں کھائی تھیں اور سر ہانے کی گھڑی میں صبح چھ بجے کا الارم سیٹ کر دیا تھا، اب آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کر رہی تھی۔

باپ کا قاتل ایک ہی چھت کے نیچے تھا۔ یہ بات اسے غصہ دلاتی تھی پھر یہ فکر تھی کہ وہ مری تک اس کا تعاقب کرے گا۔ پتا نہیں کیسے خطرناک ارادے دشمن کے اندر پرورش پا رہے ہیں۔ یہ تفکرات شاید اس کا سکون غارت کر دیتے لیکن حالات کی کڑی دھوپ میں بشارت سایہ دار درخت بن گیا تھا۔ اس کے وجود پر چھا گیا تھا اور اسے ٹھنڈی چھاؤں پہنچا رہا تھا۔

خدا نے درد کے ساتھ دوا بھی پیدا کی ہے۔ تلوار کے خلاف ڈھال بنانا بھی سکھایا ہے۔ خواب آور گولیاں حلق سے اتارنے کے بعد بشارت کا خیال اسے حوصلہ دے رہا تھا اور سکون پہنچا رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی، پہلے بشارت کو اہمیت کیوں نہیں دی؟ چھ ماہ پہلے اسے ثانی سے معلوم ہوا تھا کہ اس کا باپ ایک ڈرائیور تھا اور سرفراز نے اسے گولی ماری تھی۔ اسے باپ کا ڈرائیور ہونا یاد نہیں رہا۔ انتقام غالب آیا کہ وہ باپ کے قاتل کو زندہ نہیں چھوڑے گی۔ اگر اسے ہلاک نہ کر سکی تو کم از کم سکون سے کبھی رہنے نہیں دے گی۔ پھر اس سلسلے میں اس نے بشارت کا سارا لیا۔ تب باپ کا ڈرائیور ہونا یاد آیا۔ دل نے کہا، بشارت اس سے کمتر نہیں ہے۔ وہ آقا زادی نہیں، ڈرائیور کی بیٹی ہے اور ایک

ڈرائیور کو اپنا سکتی ہے۔

نیند آ رہی تھی، ایسے ہی وقت دستک سن کر چونک گئی۔ اس نے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

”بیٹی میں ہوں۔ کیا سو رہی ہو؟“

”کوئی اور ہوتا تو وہ دروازہ نہ کھولتی۔ ماں کے لیے اٹھ کر کھول دیا۔ رشیدہ نے اندر آ کر پوچھا۔ ”کیا کر رہی ہو؟“

”سونے والی تھی آپ آگئیں۔“

”بس ابھی چلی جاؤں گی۔ دو باتیں کرنے آئی ہوں۔“

وہ بیٹی کے ساتھ بستر کے سرے پر بیٹھ گئی پھر بولی۔ ”صبح تم جا رہی ہو۔ میں تمہارے لیے فکر مند رہوں گی۔“

”ممی! آپ یہاں اطمینان سے رہیں، میں ایک ہفتے بعد خیریت سے واپس آؤں گی۔“

”میں یہی چاہتی ہوں۔ تم واپس آؤ تو غصہ اور جنون ختم ہو جائے۔ تمہارے پیلا کہہ.....“

”میرے پیلا کوئی نہیں ہیں، آپ مجھے پھر غصہ دلا رہی ہیں۔“

”اچھا چلو وہ شازیہ کے پیلا ہیں۔ مگر تم یقین نہیں کرو گی کہ وہ تمہارے لیے کتنے فکر مند ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے، مری سے واپسی کے بعد تمہارا طبی معائنہ کرایا جائے گا۔

اگر تم غصے اور جنون کا مظاہرہ کرو گی تو ڈاکٹر تمہیں پاگل خانے بھیج دیں گے۔“

”ممی! دشمن ایسا ہی سوچتے ہیں۔ اس کی کوشش بھی یہی ہوگی کہ میں ہمیشہ کے لیے پاگل خانے چلی جاؤں۔“

”تم غلط سمجھ رہی ہو۔ وہ صرف خدشہ ظاہر کر رہے ہیں۔ تمہیں اس لیے سمجھا

رہی ہوں کہ ہمیشہ نارمل رہنے کی کوشش کرو۔ واپسی پر بہت سنبھل کر رہنا۔“

”یہ آپ نے صحیح الفاظ ادا کیے ہیں۔ میں بہت سنبھل کر رہوں گی۔“

”شباباش بیٹی! اب آرام کرو۔ میں جا رہی ہوں۔“

”ڈرا ایک منٹ۔ میں کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔ آپ جواب دیں گی۔“

”ہاں میری جان! بولو کیا بات ہے؟“

”آپ نے ابو سے محبت کیسے شروع کی تھی؟“

ماں نے چونک کر اسے دیکھا پھر کہا۔ ”تمہیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔“

”ایسی باتیں کیوں نہ پوچھوں؟“

”جو گزر گئی، سو گزر گئی۔ گزری ہوئی بعض باتیں دہراؤ تو گراں گزرتی ہیں۔“

”آپ نے وفاداری بدل دی، اس لیے آپ اس ذکر سے کترا رہی ہیں۔ آپ کو ایک اور شوہر مل گیا، مجھے تو کبھی باپ نہیں ملے گا۔ اس لیے میں ابو کی ایک بات پوچھنا چاہوں گی۔ آپ کو میری قسم، اتنا بتا دیں پہلی بار محبت کیسے ہوئی؟ کہاں ہوئی؟“

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ ”کار میں۔“

”ابو نے پہل کی تھی؟“

”نہیں۔ وہ بہت سیدھے سادے سے تھے۔ میں نے ہی پہل کی تھی۔“

یہ کہتے ہی وہ رونے لگی۔ روتے روتے کہنے لگی۔ ”انہوں نے سمجھایا، میں غلطی کر رہی ہوں۔ وہ مجھے دل سے چاہتے تھے مگر بدنام کرنا نہیں چاہتے تھے۔ میں نے ہی انہیں محبت کرنے اور مجھے گھر سے بھگا کر لے جانے پر مجبور کیا۔ میں انہیں مجبور نہ کرتی تو وہ یوں قتل نہ ہوتے۔“

وہ آگے نہ کہہ سکی۔ روتے ہوئے، دوپٹے میں منہ چھپاتے ہوئے تیزی سے دروازے کے پاس آئی پھر اسے کھول کر چلی گئی۔ شائستہ تھوڑی دیر تک گم صم بیٹھی دروازے کو دیکھتی رہی۔ سوچتی رہی، یار کو قتل کیا جاسکتا ہے، پیار کو قتل نہیں کیا جاسکتا۔ وہ آج بھی مئی کے دل میں زندہ ہے اور وہ پیار زندگی کے کسی ایسے ہی موڑ پر انہیں رلاتا ہے۔ ابو زندہ ہیں، زندہ رہیں گے، میرے ابو زندہ باد۔

وہ دروازہ بند کر کے بستر پر آکر لیٹ گئی۔ آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگی۔ خواب آور گولیاں بھی اثر دکھا رہی تھیں، ذرا دیر پہلے اس نے ابو زندہ باد کہا تھا۔ اب اس کی بند آنکھوں کے پیچھے بشارت زندہ ہو رہا تھا اور وہ سو رہی تھی۔ اب تو اسی کے خواب آنے والے تھے۔

دوسری صبح وہ وقت پر بیدار ہو کر سفر کے لیے تیار ہو گئی۔ بشارت پورچ میں کار

لے آیا۔ پھر کوٹھی کے اندر آکر شائستہ کا بڑا سوٹ کیس اٹھا کر کار کی چھت پر رکھنے لے گیا۔ رشیدہ نے پوچھا۔ ”بیٹی! اتنا بڑا سوٹ کیس کیوں لے جا رہی ہو؟ ایک ہفتے میں تو واپس آتا ہے۔“

”میں صبح و شام لباس بدلنا چاہوں تو آپ کو کیا اعتراض ہوگا۔ اس میں کپڑے ہی کپڑے ہیں۔“

وہ ماں کے گلے لگنے آئی تو آنسو نکل پڑے۔ بیٹیاں میکے سے رخصت ہوتی ہیں تو ایسے ہی بے اختیار آنسو نکل پڑتے ہیں۔ ماں نے تھپک کر کہا۔ ”نہ رو میری جان! کہو تو میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔“

”نہیں مئی! مجھے پیار کریں، میں تمنا جاؤں گی۔“

ماں اس کی پیشانی اور رخساروں کو جی بھر کے چومتی رہی پھر اسے دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ شازیہ اور زبیر پورچ میں کھڑے تھے۔ شائستہ نے بہن کو گلے لگا کر کہا۔ ”میری طرف سے جو زیادتی ہوئی اسے بھول جاؤ۔ بہنیں دشمنی سے نہیں، محبت سے لڑتی ہیں۔ پھر گلے لگ جاتی ہیں۔“

وہ بولی۔ ”آپ! آپ بہت اچھی ہیں جب پیار کرتی ہیں تو آپ کا غصہ یا دہی نہیں رہتا۔“

پھر وہ زبیر کی پیشانی چوم کر بولی۔ ”تم نے ہائے کتنا چھوڑا ہے یا نہیں؟“

”چھوڑ دیا ہے لیکن آپ جلدی واپس نہیں آئیں گی تو میں پکاروں گا ہائے آپ! آپ کہاں رہ گئی ہیں؟“

سب لوگ ہنسنے لگے۔ وہ پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔ بشارت نے گاڑی اشارت کر کے آگے بڑھائی۔ اسے رخصت کرتے وقت ماں اور بہن بھائی سب ہی تھے صرف سرفراز نہیں تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ کہیں چھپا ہوا ہے اور سائے کی طرح پیچھے پیچھے آئے گا۔

بشارت نے کشادہ مسک پر رفتار بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ نے حوصلہ دیا ہے، کیا میں شائی کہہ کر مخاطب کر سکتا ہوں؟“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”تم زبان سے بولو گے میں دل سے سنوں گی۔“

”شائی! میں پہلی بار محبت سے مخاطب کر رہا ہوں مگر خطرے کی اطلاع دے رہا

ہوں۔“

اس نے نوٹوں کی پتی سی گڈی نکال کر پچھلی سیٹ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
”صاحب نے مجھے دس ہزار روپے دیے ہیں اور وعدہ کیا ہے کہ کام ہونے کے بعد مزید
دس ہزار دیں گے۔“

”یہ رقم اپنے پاس رکھو۔ کام بہت اہم ہو گا تب ہی بیس ہزار دیے جارہے ہیں۔“
اس نے رقم جیب میں رکھی پھر چھوٹی شیشی نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ شیشی
صاحب نے مجھے دی ہے، اس میں کوئی مہلک دوا ہے۔ صاحب نے کہا ہے آپ مجھ سے
جب بھی چائے یا کوئی مشروب منگوائیں تو میں اس مشروب میں دوا کا ایک قطرہ پکا دیا
کریں۔“

شانستہ نے وہ شیشی اس کے ہاتھ سے لے لی پھر اسے کھول کر سونگھا، وہ بولا۔
”میں بڑی رات تک سوچتا رہا۔ یہی سمجھ میں آیا کہ یہ زہر نہیں ہے، زہر ہوتا تو مجھے آپ
کے کسی مشروب میں ایک ہی بار دو چار قطرے پکانے کو کہا جاتا۔ یہ کسی اور طرح کی دوا
ہے۔“

شانستہ سوچ رہی تھی۔ پچھلی رات ماں سے ہونے والی گفتگو یاد آ رہی تھی۔ ماں
کے بیان کے مطابق سرفراز نے کہا تھا کہ مری سے واپسی پر اس کا طبی معائنہ کرایا جائے
گا۔ اگر وہ نارمل نہ رہی اور اگر اس نے غصے اور جنون کا مظاہرہ کیا تو ڈاکٹر اسے پاگل
خانے بھیج دیں گے۔

شانستہ نے شیشی بند کر کے اسے واپس کرتے ہوئے سوچا۔ اس میں کوئی ایسی دوا
ہے جو مجھے پاگل بنا سکتی ہے۔ میرا دماغ الٹ سکتی ہے۔ اس طرح سرفراز مجھے آسانی سے
پاگل ثابت کر کے پاگل خانے بھیج دے گا۔ میں سمجھ رہی تھی کہ وہ میرے ابو کی طرح
مجھے مار ڈالے گا لیکن بہت چالاک ہے مئی کے سامنے مجھے زندہ رکھنا چاہتا ہے اور مردوں
سے بدتر بنا کر پاگل خانے پہنچانا چاہتا ہے۔

بشارت کی آواز نے چونکا دیا۔ ”شالی! کیا سوچ رہی ہو۔ کچھ سمجھ میں آیا؟“

”ہاں۔ تمہارا خیال درست ہے۔ یہ زہر نہیں ہے۔“

”پھر کون سی دوا ہے؟“

”کوئی سی بھی دوا ہے۔ مگر مجھے نقصان پہنچانے کے لیے ہے۔ ہو سکتا ہے اس کے
استعمال سے میرے دماغ میں خرابیاں پیدا ہو جائیں۔ اس طرح مجھے آسانی سے پاگل ثابت
کیا جائے گا۔“

”بالکل یہی بات ہے۔ اب میں اس دشمن کو صاحب نہیں کہوں گا۔“
”ذرا تحمل سے کام لو۔ کسی وقت واکا ٹاکی کے ذریعے اس سے رابطہ کرنا ہے۔
اسے یقین دلانا ہے کہ تم اس کے وفادار ہو اور اس کے احکامات کی تعمیل کرتے جا رہے
ہو۔“

”وہ مجھے زہر لگ رہا ہے۔“
”صرف چند گھنٹوں کی بات ہے۔ پھر اس سے تمہارا پیچھا چھوٹ جائے گا۔“
”کیا تم نے اس کے خلاف کوئی تدبیر سوچی ہے؟“

”ہاں، تم ساتھ دو گے تو اس تدبیر پر کامیابی سے عمل کر سکو گی۔“
”میں آخری سانس تک تمہارے ساتھ ہوں۔ بولو مجھے کیا کرنا ہے؟“

”جب سے تم نے میرا ہاتھ پکڑا ہے، میری دنیا بدل گئی ہے۔ میں تمام رشتے توڑ کر
اور عالیشان کوٹھی چھوڑ کر آئی ہوں اور کہیں دور کسی شہر میں جا کر تمہارے ساتھ زندگی
گزارنا چاہتی ہوں۔ تم کیا کہتے ہو؟“

”میں ہر قدم پر تمہارے ساتھ ہوں لیکن میرے ماں باپ پنڈ میں ہیں۔ میری وجہ
سے چاہے گامے پر مصیبت آسکتی ہے۔ ان کے لیے کچھ سوچنا اور کرنا چاہیے۔“
”تمہارے ماں باپ کو کہیں سے بھی بڑی رقم بھیج دی جائے گی۔ گامے کوٹھی کا
پرانا ملازم ہے اور ہمارے معاملے میں بے قصور ہے۔ اس پر کوئی مصیبت نہیں آئے گی۔
ایسا کچھ ہوا تو ہم اس کی بھی مدد کریں گے۔“

”لیکن وہ دشمن آپ کے پیچھے ہے۔ اس سے چھٹکارا کیسے ملے گا؟“
”ہم سیدھے مری نہیں جائیں گے۔ پنڈی میں کل صبح تک کے لیے رک جائیں
گے۔ ہمارا قیام ایک ہوٹل میں ہو گا۔ وہاں تم واکا ٹاکی کے ذریعے سرفراز کو بتاؤ گے کہ
میں دوسری صبح مری جاؤں گی۔ یہ سن کر وہ بھی اسی ہوٹل میں یا کہیں آس پاس رات
گزار دے گا۔ پھر ظاہر ہے کہ وہ تمام رات جاگ کر پہرا نہیں دے گا۔ ہم کسی وقت بھی

وہاں سے نکل جائیں گے۔“

وہ منصوبے بناتے ہوئے پنڈی پہنچ گئے۔ وہاں ایک فور اشار ہوٹل میں ایک کمرہ لیا۔ بشارت نے سرفراز کو دکھانے کے لیے وہیں قریب ایک چھوٹے سے ہوٹل میں کمرہ حاصل کیا پھر کمرے کے دروازے کو بند کر کے سرفراز سے رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”ہاں“ میں سرفراز بول رہا ہوں۔“

”جناب! بی بی جی آج رات سامنے والے ہوٹل میں قیام کریں گی۔ کل صبح مری جائیں گی۔ میں جمانگیر ہوٹل کے کمرہ نمبر بارہ سے بول رہا ہوں۔“

”وہ تم سے اور کیا باتیں کر رہی تھی؟“

”وہ تو بہت مغرور ہیں جناب! ملازم سے بولنا پسند نہیں کرتیں۔ تمام راستے میوزک سنتی آئی ہیں۔“

”تمہیں خدمت کرنے کے بہانے اس کے کمرے میں یا کمرے کے باہر رہنا چاہیے۔ وہ کھانے پینے کی کوئی چیز منگوائے گی تو تمہیں اس میں دوا حل کرنے کا موقع مل جائے گا۔“

”انہوں نے شام کو چار بجے آنے کا حکم دیا ہے۔ اس سے پہلے میں نہیں جاسکوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ سرفراز آدھے گھنٹے بعد تھکا ہوا سا آیا۔ کمرے میں آکر ناگواری سے بولا۔ ”نان سنس“ یہ ہوٹل ہے؟ یہاں انسان رہتے ہیں؟ کیسی عجیب سی بو آ رہی ہے۔“

”جناب! آپ کہاں قیام کریں گے؟“

”سوچا تھا اسی چھوٹے سے ہوٹل میں رہوں گا تو شائستہ کی نظر مجھ پر نہیں پڑے گی۔ چلو، میں اپنے لیے کوئی چھوٹا مگر صاف ستھرا ہوٹل پسند کروں گا۔“

وہ باہر آئے۔ تھوڑی دور پیدل چلتے رہے۔ پھر سرفراز نے ایک ہوٹل میں کمرہ لے لیا۔ کمرے میں پہنچ کر بستر پر لیٹتے ہوئے بولا۔ ”اس لڑکی نے تو تھکا مارا ہے۔ جاؤ کسی ملازم سے بولو پہلے پانی پلائے، پھر چائے لائے۔“

بشارت نے کاؤنٹر پر آکر کہا۔ ”آپ نے کمرے میں پینے کا پانی نہیں رکھا ہے؟“

ایک ملازم پانی سے بھرا جگ اور گلاس لا کر بولا۔ ”میں کمرے میں لے جا رہا ہوں جناب!“

بشارت نے اسے روک کر ایک گلاس میں پانی لیا پھر کہا۔ ”یہ جگ کیسا میلا سا لگ رہا ہے۔ اسے اچھی طرح صاف کر کے دوسرا پانی لاؤ۔ اس کے بعد چائے لے آنا۔“

ملازم کچن کی طرف گیا۔ بشارت گلاس اٹھائے سیڑھیاں چڑھتا ہوا ایک کارڈور میں آیا جیب سے شیشی نکالتے ہوئے آگے پیچھے دیکھا۔ کوئی نہیں تھا۔ اس نے گلاس کے پانی میں چار قطرے پکائے، شیشی کو بند کر کے جیب میں رکھا۔ پھر کمرے میں آگیا۔ پانی سے بھرا ہوا گلاس پیش کرتے ہوئے بولا۔ ”اس ہوٹل میں بھی صفائی نہیں ہے۔ میں اپنے ہاتھوں سے گلاس دھو کر لایا ہوں۔ ملازم جگ دھو کر لا رہا ہے۔“

سرفراز صبح سے پیسا تھا۔ تعاقب کے دوران کہیں رک کر کھانے پینے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس نے گلاس لیتے ہی ایک سانس میں اسے خالی کر دیا پھر منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”پانی کا مزا عجیب سا ہے۔ میرے لیے کسی دکان سے منزل وائر کی بوتل لے آنا۔“

بشارت کچھ گھبرایا ہوا اس سے دیکھ رہا تھا۔ سرفراز نے کمرے میں آنے کے بعد اپنی اپنی سے کچھ سامان نکال کر سرہانے کی میز پر رکھ دیا تھا۔ شیونگ کے سامان کے ساتھ دوا کی ایک بوتل بھی رکھی ہوئی تھی۔ وہ باقاعدگی سے کوئی دوا استعمال کرتا تھا۔ ملازم پانی سے بھرا جگ لے کر آیا تو اسے واپس کر دیا گیا۔ سرفراز نے بستر پر لیٹ کر کہا۔ ”بڑی تھکن اور کمزوری لگ رہی ہے۔“

”جناب! آپ نے صبح سے کچھ کھایا نہیں ہے۔ میں کسی بڑے سے ہوٹل سے لائٹ لنچ لے کر آتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ اپنی سے تولیا اور صابن ہاتھ روم میں لے جاؤ۔ لنچ آنے تک غسل کر لوں گا۔“

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ سرفراز کسی بیمار کی طرح تھکے ہوئے انداز میں چلتا ہوا غسل خانے میں آیا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔ ”کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے جاؤ اور جلدی آؤ۔“

غسل خانے کا دروازہ بند ہوتے ہی وہ تیزی سے چلتا ہوا میز کے پاس آیا۔ وہاں رکھی ہوئی دوا کی بوتل اٹھا کر اس کے لینبل کو پڑھا۔ پتہ چلا سرفراز دماغی توانائی اور حافظہ درست رکھنے کے لیے وہ دوا استعمال کرتا ہے۔ اس نے وہ بوتل اور اپنی شیشی کھولی۔ اس میں سے چار چھ قطرے بوتل میں پکائے۔ بوتل کو بند کر کے میز پر رکھا۔ شیشی بند کر کے جیب میں ڈالی پھر کمرے سے باہر جانے لگا۔ اسی وقت غسل خانے سے کراہنے کی آواز آئی۔ وہ واپس آگیا۔ غسل خانے کے دروازے پر دستک دے کر بولا۔ ”جناب! خیریت ہے؟“

اندر سے آواز آئی۔ ”جلدی آؤ، ہری اپ۔“

وہ دروازہ کھول کر اندر آیا۔ سرفراز ایک نیکر پننے فرش پر پڑا کراہ رہا تھا۔ بشارت نے اسے سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”کیا ہوا جناب؟“

”آہ! پتا نہیں کیسے یکایک سرچکرا گیا تھا۔ مجھے لے چلو۔ یہ سرخالی خالی سا لگ رہا ہے۔“

دوا اثر دکھا رہی تھی۔ اس نے سرفراز کو پلنگ تک پہنچا کر وہاں لٹا دیا۔ میز پر رکھی ہوئی دوا کی بوتل کو اٹھا کر اسی میز کے نیچے چھپا دیا تاکہ وہ اتنی جلدی دوا استعمال نہ کرے۔ پھر اس نے سرفراز کی پیشانی چھو کر دیکھی۔ نبض ٹولنے لگا۔ اسے پسینہ آرہا تھا جبکہ سردی کا موسم تھا۔ نبض کی رفتار ست تھی مگر تشویش ناک نہیں تھی۔ اس نے گہری لمبی سانسیں لیتے ہوئے کہا۔ ”کسی بڑے ڈاکٹر کو بلاؤ۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ جلدی جاؤ۔“

وہ تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے باہر آیا۔ شائستہ نے جس ہوٹل میں قیام کیا تھا وہ قریب ہی ایک شاہراہ پر تھا۔ وہ سیدھا اس ہوٹل میں پہنچ گیا۔ دروازے پر دستک دی۔ اندر سے آواز آئی۔ ”کم ان۔“

وہ دروازہ کھول کر اندر آیا۔ شائستہ اپنے اوپر کمبل ڈالے پلنگ پر نیم دراز تھی۔ وہ دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے بولا۔ ”شائی! میں نے دشمن کا ہتھیار دشمن پر آزمایا ہے۔ جو دوا اس نے تمہارے لیے دی تھی، وہ میں نے مسٹر سرفراز کو پلا دی ہے۔“

وہ جلدی سے کمبل ایک طرف پھینکتی ہوئی انھی۔ اس کے بدن پر مختصر سالباں تھا۔ وہ کچھ پریشان ہو کر بولی۔ ”کیا تم نے ساری دوا پلا دی؟“

”میں اتنا نادان نہیں ہوں۔ ایک گلاس پانی میں چار قطرے ملا کر دیے، وہ بستر پر بیمار کی طرح پڑا ہے۔ مجھے ڈاکٹر کو بلانے کا حکم دیا۔ میں یہاں چلا آیا۔“

وہ فرط مسرت سے لپٹ گئی۔ ”اودہ بشارت! تم نے موقع سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ اس کا جو اتنا اسی کے منہ پر مار کر مجھے ایسی خوشی دی ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ مجھے بتاؤ تم نے کیا کیا؟ اور اس کی حالت کیسی ہے؟“

وہ کیا بتاتا؟ پوچھنے والی بجلی کا تار بن گئی تھی۔ آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔ وہ بولنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ یاد نہ رہا کہ اپنے اختیار میں کیسے رہا جائے۔ بے اختیاری سکھ جھا رہی تھی۔ حواس گم کرنے کی دوا ادھر پلا کر آیا تھا، ہوش ادھر اڑ رہے تھے۔ نشہ کتنا ہی تیز ہو، مقررہ وقت پر ٹوٹ جاتا ہے۔ نیند کتنی ہی گہری ہو، آخر آنکھ کھل جاتی ہے۔

شائستہ نے آنکھیں کھول کر کہا۔ ”ہمیں یہاں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ پتہ نہیں وہ کم بخت کس حال میں ہے۔ ہمیں اب یہاں سے چلنا چاہیے۔“

وہ ہاتھ روم میں لباس بدلنے گئی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ پھر اپنی کار میں تھے۔ بشارت نے پوچھا۔ ”ہم کہاں جائیں گے؟“

”کراچی بہت بڑا شہر ہے۔ سنا ہے وہاں کی آبادی اسی لاکھ سے زیادہ ہے۔ ہم وہاں کی بھیڑ میں گم ہو جائیں گے۔“

”کیا اتنی جلدی کسی فلائٹ میں جگہ ملے گی؟“

”ہم ٹرین سے جائیں گے۔ کسی ریلوے ٹکٹ گھر کے سامنے گاڑی روکو۔ میں نے کل اپنے اکاؤنٹ سے ڈھائی لاکھ روپے اور لاکھ سے چار لاکھ کے زیورات نکالے تھے۔ یہ سب سوٹ کیس میں ہیں۔ کسی فلائٹ سے جائیں گے تو ایئر پورٹ پر چیکنگ کے وقت ظاہر ہو جائے گا کہ ہم کافی مال لے جا رہے ہیں۔ ہم پر شبہ کیا جائے گا۔“

بشارت نے ایک ٹکٹ گھر کے کاؤنٹر سے دریافت کیا کہ ایئر کنڈیشنڈ کوچ یا فرسٹ کلاس کا ٹکٹ مل سکتا ہے یا نہیں؟ پتہ چلا کسی کلاس کا ٹکٹ نہیں ہے۔ بشارت نے دو ٹکٹوں پر دو سو روپے فاضل دیے تو کام بن گیا۔ ٹرین تین گھنٹے بعد جانے والی تھی۔ شائستہ نے کہا۔ ”تم اپنے لیے ریڈی میڈ جوڑے، ایک ایچی اور کمبل وغیرہ خرید لو۔ کچھ پھل

وغیرہ بھی رکھ لیں گے۔

انہوں نے بڑی عجلت میں شاپنگ کی تھی۔ ڈیڑھ گھنٹے میں ضرورت کی چیزیں خرید لیں۔ پھر وہ جنرل پوسٹ آفس کے سامنے آکر رک گئے۔ شائستہ نے کہا۔ ”تم سامان گاڑی سے نکال کر ادھر ٹیکسی اسٹینڈ میں لے جاؤ۔ ہم ٹیکسی میں اسٹیشن جائیں گے۔ میں ابھی می سے بات کر کے آتی ہوں۔“

اس نے موبائل فون کے ذریعے رابطہ کیا۔ رشیدہ اپنے شوہر کے فون کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ سرفراز اسے شائستہ کی خیر خیریت بتانے والا تھا۔ گھنٹی کی آواز سنتے ہی اس نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ ”ہیلو“ میں رشیدہ بول رہی ہوں۔“

”می! میں پنڈی کے جنرل پوسٹ آفس کے سامنے ہوں۔ آپ کو یاد ہے نا؟ پچیس برس پہلے آپ نے گوجرانوالہ کے جنرل پوسٹ آفس سے اپنی اماں کو فون کیا تھا اور یہ خبر سنائی تھی کہ ڈرائیور سلامت سے آپ کا نکاح ہونے والا ہے۔“

”یہ تم کہاں کی باتیں لے بیٹھی ہو۔ اپنی خیر خیریت کی باتیں کرو۔“

”می! ٹھیک پچیس برس بعد میں اسی طرح جنرل پوسٹ آفس سے آپ کو اطلاع دے رہی ہوں کہ ڈرائیور بشارت سے مہرا نکاح ہونے والا ہے۔“

”کیا بک رہی ہو؟ کیا تم پر پھر دورہ پڑا ہے؟“

”یہ دورہ وراثت میں ملا ہے، خاندانی ہے۔ اس وقت میں زیادہ بات نہیں کر سکتی۔ کچھ دیر بعد دوبارہ آپ سے رابطہ کروں گی۔ اوکے، گڈ بائی۔“

وہ چیخ کر بولی۔ ”ٹھہرو! فون بند نہ کرنا۔ میری بات سنو۔“

لیکن رابطہ منقطع ہو گیا۔ شائستہ جی پی او سے باہر آئی اور بشارت کے ساتھ اسٹیشن پہنچ گئی۔

جب ٹرین چل پڑی تو بشارت اوپری برتھ پر جا لیٹا۔ شائستہ نے موبائل فون سنبھالا اور ٹائلٹ میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ وہ دوبارہ گھر کا نمبر ملا رہی تھی۔

دوسری طرف سے پہلی ہی گھنٹی پر فون اٹھا لیا گیا۔ رشیدہ نے بے تابی سے ہیلو

کہا۔

”می۔ یہ کہنا باقی تھا کہ جس طرح آپ نے گوجرانوالہ جی پی او کے سامنے گاڑی

چھوڑی تھی، اسی طرح میں پنڈی جی پی او کے سامنے کار چھوڑ کر جا رہی ہوں، کسی سے منگوا لیں یا آکر لے جائیں۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ رشیدہ ہیلو ہیلو کہتی رہی۔ کوئی سننے والا نہیں تھا پھر جواب کیسے ملا۔ وہ ریسیور کو کڑیل پر پٹخ کر شازیہ کا منہ بٹکنے لگی۔ اسے پچیس برس پہلے کی مار پھر پڑی تھی اور اب ایک اور مار پڑنے والی تھی۔ ابھی اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے شوہر کا..... اس کے بچوں کے باپ کا دماغ الٹ گیا ہے۔ وہ پنڈی کے ایک عوامی ہوٹل میں بے یار و مددگار پڑا ہے۔ اگر جلد ہی اسے کوئی پرسان حال نہ ملا تو وہ مر بھی سکتا ہے۔

ٹرین کسی دیرانے میں رکی ہوئی تھی۔ شائستہ نے ٹائلٹ میں جا کر دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد ٹائلٹ کی کھڑکی کے قریب آکر اپنی ماں سے رابطہ کیا تھا اور بشارت کے ساتھ بھاگ جانے کی اطلاع اسے دی تھی۔

بشارت اوپری برتھ پر لیٹا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ پھر اچانک بیدار ہوا تو گھبرا کر سوچنے لگا۔ ”میں کہاں ہوں؟ میرے چاروں طرف یہ گہری تاریکی کیوں ہے؟“

اسے فوراً ہی یاد آیا کہ وہ شائستہ کے ساتھ ٹرین میں سفر کر رہا ہے اور اوپری برتھ پر لیٹا ہوا ہے۔ لیکن پریشانی یہ تھی کہ گہری تاریکی کیوں ہے؟ کمپارٹمنٹ کے بلب بجھے ہوئے ہیں یا اس کی آنکھیں پھر بجھ گئی ہیں؟

اس نے گھبرا کر سر ایک طرف گھما کر سامنے دیکھا۔ ذرا فاصلے پر کھڑکی تھی۔ خیال تھا کہ ٹرین کسی چھوٹے بڑے اسٹیشن پر رکی ہوئی ہے تو اسٹیشن کی روشنی دکھائی دے گی۔ لیکن باہر بھی اتنی تاریکی تھی کہ کمپارٹمنٹ کی کھڑکی تک نظر نہیں آ رہی تھی۔

تب ثابت ہو گیا کہ بینائی نے بے وفائی کی ہے۔ آہ! ایسے وقت اندھا ہو رہا ہے جب ایک دولت مند حسینہ اس پر مہربان ہو رہی ہے۔ اگر اسے پتہ چلے گا کہ جس مرد پر بھروسہ کر کے خون کے رشتوں کو چھوڑ آئی ہے، وہ اندھا ہو گیا ہے تو اس کا رد عمل کیا ہوگا؟

ظاہر، اسے اندھے بھکاری کی طرح دھتکار دے گی۔ اسے بوائے فرینڈز کی کمی نہیں تھی۔ وہ کسی کو بھی ہمسفر بنا لیتی۔ محتاجی تو اندھے اور لاچار کا مقدر ہوتی ہے۔ وہ دل

اس نے انٹرکام کے ذریعے چوکیدار سے کہا کہ گامے کو کوٹھی میں بھیجا جائے پھر شازیہ سے کہا۔ ”گھڑی دیکھتی رہو۔ آدھے گھنٹے میں ڈاکٹر شاہ زمان سے رابطہ کرنا ہے۔“ وہ ڈرائنگ روم میں آئی۔ ایک منٹ بعد گامے حاضر ہوا۔ وہ بولی۔ ”ابھی پنڈی جاتا ہے۔ گاڑی نکالو۔“

”بیگم صاحبہ! دو گاڑیاں گئی ہوئی ہیں۔ آپ سوزوکی کار میں بیٹھتی نہیں ہیں۔“

”مجبوری ہے۔ سوزوکی میں ہی جانا ہوگا۔“

وہ جانے لگا۔ اس نے کہا۔ ”ٹھہرو! بشارت تمہارا کون ہے؟“

”میرا بھتیجا ہے۔“

”تم تو بہت ایماندار اور وفادار ہو۔ تمہارا بھتیجا دھوکے باز کیسے ہو گیا؟“

”دھوکا؟ کیا اس نے کوئی غلطی کی ہے؟“

”غلطی نہیں، جرم کیا ہے، گناہ کیا ہے۔ میری بیٹی کو بھگا کر لے گیا ہے۔“

وہ حیران پریشان ہو کر بولا۔ ”نہیں! بشارت نے ایسا کیا ہے؟ اس کی اتنی ہمت کیسے

ہوئی؟ بیگم صاحبہ! آپ سچ کہہ رہی ہیں لیکن یقین نہیں آرہا ہے۔“

”مجھے بھی یقین نہیں آرہا ہے لیکن اندازہ کرو کہ ہماری کتنی بدنامی ہوگی۔ کیا ہم

اپنے خاندان میں اور اونچی سوسائٹی میں کسی کو منہ دکھاسکیں گے۔“

”بیگم صاحبہ! میں اس کم ظرف کو گردن سے پکڑ کر قبر میں گھسا دوں گا۔ اس نمک

حرام کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”تمہارے طیش میں آنے سے ہم نیک نام نہیں ہو جائیں گے۔ وہ کہاں ملے گا کہ

تم اس کی گردن پکڑو گے؟“

”میں شر شر، گلی گلی اسے تلاش کروں گا۔“

”دیکھو، میں وارننگ دیتی ہوں۔ یہ بات اس کو ٹھہرنے سے باہر نہ جائے۔ تم اگر اپنے

سائے سے بھی کھو گے کہ شائستہ اس نمک حرام کے ساتھ گئی ہے تو صاحب تمہیں گولی مار

دیں گے۔“

”میری کیا مجال ہے کہ اس معاملے میں زبان کھولوں۔ میں مرتے دم تک یہ بات

کسی سے نہیں کہوں گا۔ قسم سے کہتا ہوں بیگم صاحبہ! میں شرم سے مرا جا جا رہا ہوں، میں

پنڈ جاؤں گا، شاید وہ بی بی جی کو وہاں لے گیا ہو۔“

”بی بی جی پنڈ کبھی نہیں جائے گی۔ وہ دونوں نادان نہیں ہیں۔ وہاں انہیں پکڑے

جانے کا اندیشہ ہوگا۔ جاؤ، گاڑی نکال، لو اور سوچو کہ وہ دونوں کہاں جاسکتے ہیں۔“

وہ چلا گیا۔ رشیدہ دہری پریشانیوں میں پھنس گئی تھی۔ ایک طرف شوہر گھر سے

دور نہ جانے کسی بیماری اور مصیبت میں پڑ گیا تھا۔ دوسری طرف بیٹی ڈرائیور کے ساتھ

کیس چلی گئی تھی۔ پولیس میں رپورٹ درج نہیں کرائی جاسکتی تھی۔ اخبارات میں تصویر

شائع کرانا حماقت ہوتی۔ یہ سب بدنامی کو دوچند کرنے والے اقدامات ہوتے۔ وہ اپنے بیٹ

روم میں آئی۔ شازیہ ڈاکٹر شاہ زمان سے رابطہ کر رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔ ”ہیلو ڈاکٹر

انکل! مسز سرفراز آپ سے بات کریں گی۔“

رشیدہ نے فون کے پاس آکر جھک کر کہا۔ ”بھائی صاحب! سرفراز کیسے ہیں؟“

”یہ بے ہوش ہیں۔ میں انہیں اسپتال لے جا رہا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں، پنڈی

آجائیں۔“

”میں ابھی یہاں سے چل رہی ہوں۔ سیدھی آپ کے اسپتال آؤں گی، خدا

حافظ۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ رشیدہ نے آہنی الماری کھولی، اس میں سے نوٹوں کی چند گڈیاں

نکل کر پنڈ بیگ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”شازیہ! میں کل تک واپس آنے کی کوشش کروں

گی۔ اگر نہ آسکی تو پریشان نہ ہونا۔ میں فون کرتی رہوں گی۔ زیر کا خیال رکھنا۔“

گامے اٹیچی لے گیا۔ وہ کار میں آکر بیٹھ گئی۔ پھر شازیہ کو قریب بلا کر بولی۔

”شائستہ کا فون آسکتا ہے۔ اس سے معلوم کرنے کی کوشش کرنا کہ وہ کہاں ہے۔ ایک

ڈرائیور کے ساتھ جانے کہاں بھٹک رہی ہے۔ اس پاگل کو بدنامی کا احساس نہیں ہے۔ کوئی

پوچھے تو کہہ دینا، شائستہ میرے پنڈی گئی ہے۔“

وہ کار کو ٹھہرنے کے احاطے سے باہر آئی۔ رشیدہ نے گامے سے کہا۔ ”میں بینک سے

ہو کر چلوں گی۔“

گامے نے گاڑی بینک کے سامنے لا کر روک دی۔ رشیدہ کار سے نکل کر بینک کے

اندر گئی۔ بینک بند ہو چکا تھا لیکن فیور اور عملے کے کچھ افراد ضروری کاموں میں مصروف

پاس تھا۔ رشیدہ نے سگجرات میں کار رکوائی۔ پھر بی بی او کے ذریعے شازیہ سے رابطہ کیا۔ اس سے پوچھا۔ ”تمہیں شائستہ کے موبائل فون کا نمبر معلوم ہے؟“

”معلوم ہے اور ڈائری میں بھی لکھا ہوا ہے۔“

”بی بی! اس سے رابطہ کرتی رہو۔ اس سے گڑگڑا کر التجا کرتی رہو کہ وہ واپس آجائے۔ اس کی ہر خواہش پوری کی جائے گی۔ بشارت کو بھی معاف کر دیا جائے گا اور اس سے کتنا رات دس بجے تمہارے پیلا کے موبائل فون پر مجھ سے بات کرے۔ میں جہلم پہنچ کر پھر تم سے رابطہ کروں گی۔“

وہ شازیہ کو ہدایات دے کر پھر کار میں آگئی۔ اسے تشویش تھی کہ سرفراز اچانک بیمار کیسے ہو گیا؟ اگر وہ صحت مند ہوتا تو شائستہ کو ڈھونڈنے اور اسے واپس لانے کے لیے بڑی ہوشیاری اور رازداری سے کام لیتا۔ اس کے نہ ہونے سے ساری فکر پریشانیاں اور ذمے داریاں اس پر آپڑی تھیں۔ اس نے جہلم پہنچ کر پھر شازیہ سے رابطہ کیا۔ بی بی نے کہا۔ ”میں کئی بار آپ سے رابطہ کرنے کی کوششیں کر چکی ہوں۔ معلوم ہوتا ہے انہوں نے اپنا موبائل فون آف کر دیا ہے یا کسی ایسے شہر میں ہیں، جہاں کا کوڈ نمبر ہمیں معلوم نہیں ہے۔“

”کئی شہروں کے کوڈ نمبر ہماری ڈائری میں درج ہیں۔ باری باری ان نمبروں کو آزماؤ شاید رابطہ ہو جائے۔“

”مشکل ہے می! اگر وہ ٹرین، بس یا کوچ کے ذریعے سفر کر رہی ہوں گی تو مختلف شہروں سے گزری ہوں گی ایسے میں کسی بھی شہر کے کوڈ نمبر کو آزمانے کا فائدہ نہیں ہوگا۔ میں یقین سے کہتی ہوں کہ انہوں نے فون کو بند کر رکھا ہے۔“

”اس لڑکی نے تو جینا حرام کر دیا ہے۔ اب میں گھنٹے بھر میں پنڈی پہنچ جاؤں گی۔ تم پیلا کے فون پر رابطہ کرنا۔“

اس نے ریسور رکھ دیا۔ کار میں آکر بیٹھ گئی۔ گامے نے ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔ ”بیگ صاحب! آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔“

”بولو کیا بات ہے؟“

”اگر بی بی جی اور بشارت نے پہلے سے بھاگنے کا منصوبہ بنایا ہوگا تو پھر وہ بڑی رقم

تھے۔ فیجر نے اپنی جگہ سے اٹھ کر استقبال کیا۔ ”آئیے سرفراز، تشریف لائیے، کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ یہاں تشریف رکھئے۔“

وہ ایک کرسی پر بیٹھ کر بولی۔ ”میں یہ معلوم کرنے آئی ہوں، کیا ادھر دو ایک دنوں میں شائستہ آئی تھی؟“

”جی ہاں، کل ہی آئی تھیں۔“

”کیا رقم نکالی تھی؟“

”جی ہاں، رقم بھی نکالی اور لا کر سے.....“

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ رشیدہ نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، فیجر کا فرض ہے کہ وہ کسی اکاؤنٹ ہولڈر کے اکاؤنٹ اور لا کر کے متعلق کسی کو نہ بتائے۔ بے شک آپ فرض ادا کریں، مجھے جو معلوم کرنا تھا وہ کر چکی ہوں۔“

وہ کار میں آکر بیٹھ گئی۔ اسے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ بی بی کیا کچھ لے گئی ہے۔ وہ ایک مل اونز کی نواسی تھی۔ بینک میں لاکھوں روپے اور لا کر میں لاکھوں کے زیورات ہوں گے۔ وہ بہت کچھ لے گئی ہوگی۔ رشیدہ کو بینک میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اپنے ماضی میں جھانک کر دیکھ لیتی۔ وہ بھی کبھی بینک سے رقم اور گھر سے زیورات لے کر گئی تھی۔ بی بی نے وقت کو دہرایا تھا۔

کار تیز رفتاری سے پنڈی کی طرف جا رہی تھی۔ وہ پچھلی سیٹ پر سر پکڑے بیٹھی سوچ رہی تھی۔ میں نے جو غلطی کی تھی، اسے بڑی کامیابی سے چھپا دیا گیا تھا۔ بی بی کی غلطی کا کیا بنے گا؟ ابھی بات نہیں پھیلی ہے۔ وہ واپس آجائے یا معلوم ہو جائے کہ وہ کہاں ہے تو میں اسے سمجھا منکر لے آؤں گی۔ میں سلامت کے معاملے میں سنجیدہ تھی لیکن وہ بشارت کے معاملے میں سنجیدہ نہیں ہوگی۔ صرف اپنے باپ کا انتقام لینے اور باپ کے قاتل سرفراز کو ذلیل کرنے کے لیے ڈرائیو کے ساتھ گئی ہے۔

اور اگر واقعی اس کے دل میں ڈرائیو بشارت کے لیے محبوبانہ جذبات نہیں ہیں اور اسے محض آلہ کار بنایا ہے تو پھر وہ سرفراز کو بدنام کرنے اور پریشان کرنے کے لیے ہم سے ضرور رابطہ کرے گی۔ کاش میرے پاس بھی موبائل فون ہوتا۔

ان کے ہاں دو ہی موبائل فون تھے۔ ایک شائستہ لے گئی تھی دوسرا سرفراز کے

لے گئی ہوں گی۔ پنجاب کے کئی شہروں میں آپ کے رشتے دار ہیں، وہ ادھر نہیں جائیں گی۔ میرا دماغ کہتا ہے وہ کراچی گئی ہیں۔“

”کہتے تو ٹھیک ہو۔ ہماری برادری کے لوگ دور تک پھیلے ہوئے ہیں، اگر وہ کراچی جائے گی تو ڈھونڈنا مشکل ہو جائے گا۔ وہاں تو سڑکوں، گلیوں اور محلوں میں کیڑوں مکوڑوں کی طرح لوگ پھیلے ہوئے ہیں۔“

”پھر بھی کوشش کی جائے تو وہاں انہیں تلاش کیا جاسکتا ہے۔“

رشیدہ کو یاد آیا، وہ سلامت کے ساتھ بھاگ کر لاہور آئی تھی تو برقع پہن کر رہتی تھی۔ عورت کے لیے چھپنا بڑا آسان ہوتا ہے۔ شاید بیٹی بھی یہی طریقہ آزمائے گی۔ البتہ بشارت پہچانا جاسکتا ہے اس نے گامے سے پوچھا ”بشارت کی کوئی تصویر ہے؟“

”جی ہاں، کوارٹر میں رکھی ہے۔“

”وابسی پر مجھے اس تصویر کی ضرورت ہوگی۔“

وہ ہنڈی کے اسپتال میں پہنچ گئی۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ ڈیوٹی پر رہنے والی ہیڈ نرس نے کہا۔ ”ڈاکٹر آرام کرنے گھر گئے ہیں۔ مسٹر سرفراز ہوش میں آئے تھے۔ انہوں نے دوبار آنکھیں کھولیں، پھر سو گئے۔“

وہ نرس کے ساتھ اسپیشل وارڈ کے کمرے میں آئی۔ سرفراز آنکھیں بند کیے بستر پر اڑا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”یہ بیمار کیسے ہو گئے؟ بیماری کیا ہے؟“

”دماغ کمزور ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہے تھے کہ آپ لوگ پرانے شناسا ہیں لیکن آپ کے شوہر نے آنکھیں کھولنے کے بعد ڈاکٹر کو نہیں پہچانا۔ ڈاکٹر نے دو چار سوالات کیے لیکن یہ خاموش رہے پھر آنکھیں بند کر کے سو گئے۔“

رشیدہ نے پوچھا۔ ”یہ لاہور سے چلے تو بالکل نارمل تھے۔ پھر یہ بڑی مضبوط قوت ارادی کے مالک ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا، ان کا دماغ کمزور کیسے ہو گیا۔“

”ان کے سامان میں دماغی توانائی کی ایک دوا پائی گئی ہے۔“

”ہاں وہ ایک ٹانک استعمال کرتے ہیں۔“

نرس نے کہا۔ ”وہ ٹانک مشکوک ہے۔ ڈاکٹر نے ٹانک کی وہ بوتل لیبارٹری بھیج دی ہے۔ اس میں کسی اور دوا کی ملاوٹ کا شبہ ہے۔“

نرس تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد چلی گئی۔ رشیدہ نے کہا۔ ”گامے! میرا دل کہتا ہے۔ تمہارے صاحب کے خلاف سازش کی گئی ہے۔ کسی نے ٹانک میں کوئی دوسری دوا ملائی ہے۔ کون ہم سے دشمنی کر سکتا ہے؟“

”صاحب بڑے آدمی ہیں اور بڑے آدمیوں کے ہزاروں دشمن ہوتے ہیں۔“

”تم ابھی ہوٹل ڈبلکس جاؤ۔ صاحب نے وہاں کمرہ نمبر چار میں قیام کیا تھا۔ معلوم کرو، صاحب کے ساتھ وہاں اور کون تھا۔“

گامے چلا گیا۔ رشیدہ کو ابھی بیٹی اور بشارت پر شبہ نہیں تھا۔ اس کے خیال میں شائستہ اور بشارت اس بات سے بے خبر تھے کہ سرفراز ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ گامے ایک گھنٹے کے اندر واپس آیا۔ اس نے بتایا کہ سرفراز کے ساتھ ایک جوان تھا۔ اس کا جو حلیہ بتایا گیا ہے وہ بشارت سے ملتا جلتا تھا۔ ہوٹل والوں نے بتایا کہ وہ بندہ اپنے صاحب کے لیے ایک گلاس میں پانی لے گیا تھا اس کے بعد دوبارہ ہوٹل میں نظر نہیں آیا۔

رشیدہ سر جھکا کر سوچنے لگی۔ کیا شائستہ نے بشارت کے ذریعے سرفراز کو نقصان پہنچایا ہے؟ کیا اسے پتا چل گیا تھا کہ سرفراز اس کے تعاقب میں ہے؟

اسے یاد آیا، سرفراز نے کہا تھا کہ اس نے ڈرائیور بشارت کو اپنا رازدار بنایا ہے۔ وہ واک ٹانک کے ذریعے صاحب سے رابطہ رکھے گا۔ اب بات واضح ہو رہی تھی۔ بشارت سرفراز کا نہیں شائستہ کا رازدار تھا۔ اس نے صاحب کو دھوکا دیا۔ اسے تعاقب سے باز رکھنے کے لیے کوئی ایسی دوا پلا دی ہے جس کے نتیجے میں یہ اسپتال پہنچ گیا ہے اور وہ شائستہ کو لے اڑا ہے۔

اس نے اپنے شوہر کو دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے بستر پر پڑا ہوا تھا۔ چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ کسی قدر مردہ سا لگ رہا تھا۔ وہ قریب آکر بستر کے سرے پر بیٹھ گئی۔ ہولے سے سینے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ دل دھڑک رہا تھا۔ سانس چل رہی تھی۔

وہ مطمئن ہو کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اپنی انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ رشیدہ نے عالم سرخوشی میں اس پر جھک کر کہا۔ ”میں ہوں تمہاری رشیدہ۔ تمہارے پاس آگئی ہوں۔ تم اکیلے نہیں ہو۔“

وہ شناسا نظروں سے دیکھ رہا تھا، کچھ بولنا چاہتا تھا۔ رشیدہ نے کہا۔ ”ہاں بولو، کسی چیز کی ضرورت ہے۔ کمزوری لگ رہی ہے تو آنکھیں بند کرلو۔ سونے کی کوشش کرو۔ اللہ نے چاہا تو صبح تک ہنسنے بولنے لگو گے۔“

اس کے ہونٹ کھل گئے۔ وہ بولا۔ ”سا۔ سا۔ سلامت آیا تھا۔“
رشیدہ کا کلیجا دھک سے رہ گیا۔ وہ بولی۔ ”سلامت کیسے آئے گا؟ وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ مر چکا ہے۔“

”آیا تھا۔ ابھی ابھی میرے سامنے تھا۔“
”اے بھول جاؤ سرفراز! تم نے خواب دیکھا ہے۔ ابھی تم سو رہے تھے“ وہ خواب تھا۔ اس کا نام، اس کا خیال دماغ سے نکال دو۔“

وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے لگی۔ اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں بند کر لیں۔ رشیدہ نے مشورہ دیا تھا کہ سلامت کا نام اور اس کا خیال دماغ سے نکال دے لیکن اب وہ رشیدہ کے دماغ میں آگیا تھا۔ سلامت محض ایک نام نہیں تھا، ایک ایسا ناقابل انکار رشتہ تھا جو اس سے ٹوٹا نہیں تھا۔ اگرچہ اسے گولی مار کر بظاہر توڑ دیا گیا تھا۔ تاہم آج بھی شائستہ کے حوالے سے جڑا ہوا تھا۔ پچیس برس تک مردہ رہنے کے بعد پھر زندہ ہو گیا تھا۔

تشویش کی بات یہ تھی کہ وہ سرفراز کے دماغ میں آ رہا تھا۔ سرفراز ایسا سنگدل اور فولادی ارادوں کا مالک تھا کہ بڑی سے بڑی بات کا اثر نہیں لیتا تھا۔ سلامت کو قتل کرنے کے بعد ایسے بھول گیا تھا، جیسے وہ کوئی چیونٹی یا مچھر تھا۔ مچھر کا کوئی نام، کوئی پہچان نہیں ہوتی۔ وہ دو ہاتھوں کی تالیوں کے درمیان پس جاتا ہے۔ ایسے ہی سلامت کی بھی ہستی تھی۔

سب کچھ ٹھیک ہو چکا تھا۔ دامن پر لہو کا دھبا نہیں لگا تھا۔ کوئی قانونی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ ایک بہت اونچا گھرانہ بدنامی سے بال بال بچ گیا تھا۔ رشیدہ کی اماں اور ابو ملک جان محمد اس اطمینان سے مر گئے تھے کہ بدنامی کو مار چکے ہیں، وہ کبھی زندہ نہیں ہوگی۔

اور کبھی نہ ہوتی۔ یہ شائستہ فساد پھیلا رہی تھی۔ گڑا ہوا مردہ اکھاڑ رہی تھی بلکہ اکھاڑ چکی تھی۔ سرفراز سے خطرناک انتقام لے رہی تھی۔ پتا نہیں بشارت کے ذریعے کیا

کھلایا یا پلایا تھا کہ سرفراز کا دماغ الٹ گیا تھا۔ اس نے ایک طویل مدت کے بعد مقتول سلامت کو یاد کیا تھا اور اسے اپنے سامنے دیکھنے لگا تھا۔

رشیدہ سوچ رہی تھی اور الجھ رہی تھی۔ بھوک..... مر گئی تھی، نیند اڑ گئی تھی۔ اس نے فون پر شازیہ سے بات کی تھی۔ گائے جی پی او کے سامنے کھڑی ہوئی کار لے آیا تھا۔ پھر اسی کار میں سونے چلا گیا تھا۔ وہ بھی سوچتے سوچتے تھک گئی تھی۔ رات کے پچھلے پھر آنکھ لگ گئی۔ نیند پھر نیند ہے، کانٹوں کے بستر پر بھی آجاتی ہے۔ اور دماغ پھر دماغ ہے، کسی بات کا اثر لے لے تو پھر خواب میں بھی وہ اثر دکھاتا ہے۔ اس نے سلامت کو دیکھا، کچھ ایسے دیکھا کہ سلامت کے چہرے پر شائستہ کی صورت نظر آئی یا پھر شائستہ کی صورت میں سلامت کو دیکھا۔ دونوں باپ بیٹی ایک دوسرے میں گڈٹھتے۔ پھر آنکھ کھل گئی۔ دن نکل آیا تھا۔ سرفراز ہولے ہولے کراہ رہا تھا، وہ کرسی پر سے اٹھ کر اس کے پاس آئی۔ اسے آواز دی۔ ”سرفراز! کیا ہوا؟ کچھ تکلیف ہے؟“

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ چہرے سے کرب ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی زس کے پاس آئی۔ اس سے بولی۔ ”وہ بیدار ہو چکے ہیں۔ آنکھیں نہیں کھول رہے ہیں۔ کسی تکلیف میں ہیں۔ پلیز، انہیں چیک کریں۔“

زس نے آکر نبض دیکھی۔ اس کا معائنہ کیا۔ پھر کہا۔ ”پریشانی کی بات نہیں ہے۔ بس ذرا کمزوری ہے۔ ڈاکٹر دس بجے آئیں گے۔“

سرفراز کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ جیسے نیند میں بڑبڑایا۔ ”جاؤ، بھاگ جاؤ یہاں سے۔ کیا بھول گیا کم بخت! ایک ہی گولی میں چٹ پٹ ہو گیا تھا۔ یہ دیکھ میرے پاس ریو اور ہے۔ پھر گولی ماروں گا۔“

رشیدہ نے گھبرا کر زس کو دیکھا پھر کہا۔ ”سرفراز! یہ کیا بڑبڑا رہے ہو، آنکھیں کھولو۔“

وہ ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔ ”آخر ہے نابزدل ڈرائیور۔ ریو اور دیکھتے ہی بھاگ گیا۔“
رشیدہ نے ہولے سے شانے کو ہلایا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ہنسی بجھ گئی۔
اس نے سنجیدگی سے زس کو دیکھا۔ پھر رشیدہ کو دیکھ کر بولا۔ ”تم؟ میں؟ میں کہاں ہوں؟“
وہ بولی۔ ”خدا کا شکر ہے، مجھے اور اپنے آپ کو پہچان رہے ہیں۔ آپ اسپتال میں

ہیں۔ دماغ پر زیادہ بوجھ نہ ڈالیں۔ آرام سے لیئے رہیں۔“

نرس نے کہا۔ ”یہ کچھ ناشتہ کر لیں تو بہتر ہے کیونکہ انہیں دوا دینی ہے اور انجکشن لگانا ہے۔“

وہ آہستگی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رشیدہ اس کی خدمت میں مصروف ہو گئی۔ وہ ہاتھ روم میں گیا۔ رشیدہ نے اپنے ہاتھوں سے اس کا منہ ہاتھ دھلایا۔ اسے ناشتا کرایا، ایسے وقت شازیہ نے فون پر مخاطب کیا۔ رشیدہ نے پوچھا۔ ”آپ شازیہ سے بات کریں گے۔“ اس نے فون لے کر کہا۔ ”ہیلو بیٹی! کیسی ہو؟“

”آپ کیسے ہیں بیٹا؟ آپ کو کیا ہو گیا تھا؟“

”کچھ نہیں بیٹے! زندگی میں مصیبتیں آتی رہتی ہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اپنا اور زیر کا خیال رکھو۔“

”آپ ہماری طرف سے مطمئن رہیں۔ کیا آپ کا فون آیا تھا؟“

سرفراز نے چونک کر پوچھا۔ ”کون آپ؟ اوہ! ہاں شائستہ کو پوچھ رہی ہو؟“

رشیدہ نے فون لے کر کہا۔ ”شازیہ! ابھی پیلا سے اس کی باتیں نہ کرو۔ انہیں

آرام کی ضرورت ہے۔ میں بعد میں تم سے باتیں کروں گی۔ خدا حافظ۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ سرفراز نے کہا۔ ”تم ٹھیک کہتی ہو، مجھے اس لڑکی کے متعلق نہ ہی کچھ بولنا چاہیے، نہ سوچنا چاہیے۔ مجھے بشارت پر غصہ آ رہا ہے۔ وہ سامنے ہوتا تو اسے گولی مار دیتا۔“

”یہ تو میں سمجھ گئی ہوں کہ اس ذلیل نمک حرام نے دھوکا دیا ہے۔ کیا اس نے نقصان پہنچانے والی کوئی دوا آپ کو کھلائی ہے؟“

وہ سوچنے لگا۔ رشیدہ سے یہ کہہ نہیں سکتا تھا کہ شائستہ کا دماغ اٹنے والی دوا خود اس نے بشارت کو دی تھی اور وہ فریبی وہی دوا اسے پلا کر چلا گیا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ ”ہاں، مجھے ایسا ہی لگتا ہے کہ اس نے پانی میں کوئی دوا ملا کر دی ہوگی۔ وہ نمک حرام کہاں ہے؟ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ شائستہ نے اس نوکر کو میرے خلاف استعمال کیا ہے۔“

”اگر اس میں شائستہ کا بھی ہاتھ ہے تو وہ بہت زیادہ پراہم بن رہی ہے۔“

”کہاں ہے وہ؟“

رشیدہ نے سر جھکا لیا۔ سرفراز نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے، مجھے بتاؤ؟“

وہ بولی۔ ”کیا بتاؤں۔ وہ ہم سے انتقام لے رہی ہے۔ جو غلطی کبھی میں نے کی

تھی، وہی وہ بھی کر رہی ہے۔ وہ بھی اس ڈرائیور کے ساتھ کہیں چلی گئی ہے۔“

سرفراز کو ذرا اطمینان ہوا کہ مقتول کی دشمن بیٹی دور ہو گئی ہے لیکن خاندانی بدنامی اور بے عزتی کا بھی خیال آیا۔ دنیا تو یہی کہے گی کہ مل اور ملک سرفراز خان کی صاحب زادی منہ کالا کرنے گئی ہے۔ اسے پچیس برس تک اپنی بیٹی کتنے رہنے کے بعد اب باپ بیٹی کے رشتے سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

اور اگر انکار کرتا تو اس کی بیوی رشیدہ کے چال چلن پر حرف آتا۔ اس کی اپنی بیٹی شازیہ اور زہیر کی ماں بد چلن کھلاتی۔ باقی دونوں اولادیں بھی مشکوک سمجھی جاتیں کہ پتا نہیں، وہ بھی سرفراز کا خون ہیں یا نہیں؟ بات بہت دور تک بگڑ جاتی۔ پچیس برس بعد پھر اس بگڑی کو بتانے کا مسئلہ درپیش تھا۔

کیا وہ سلامت کی طرح بشارت کو بھی قتل کر سکتا تھا؟

نہیں۔ اب یہ مشکل تھا۔ رشیدہ کی فطرت میں چمک تھی۔ اس نے والدین کی عزت رکھنے کے لیے شوہر کے قاتل کو شوہر بنالیا تھا لیکن شائستہ کی فطرت میں سمجھوتے بازی نہیں تھی۔ وہ باپ کے قاتل کو باپ نہیں بنا سکتی تھی اور جس ڈرائیور کو محبوب بنالیا تھا اسے سوتیلے باپ پر قربان نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اپنے محبوب کے نہیں، باپ کے قاتل کی تباہی چاہتی تھی اور تباہی کی ابتدا میں اسے اسپتال پہنچا چکی تھی۔ پتا نہیں انتہا کیا ہونے والی تھی۔

ڈاکٹر نے اپنے وقت پر آکر اس کا معائنہ کیا۔ اسے دماغی توانائی کے لیے مزید دوائیں اور انجکشن وغیرہ لکھ کر دیے۔ دوپہر کو لیبارٹری کی رپورٹ آگئی۔ اس ٹانگ میں نہایت ہی ضرر رساں دوا کی آمیزش تھی۔ اس نے پوچھا کہ وہ دوا کہاں سے خریدی گئی تھی؟

سرفراز نے کہا۔ ”ٹانگ میں کوئی خرابی نہیں تھی۔ میں آدمی بوتل پی چکا تھا اور دو دنوں تک نارمل رہا تھا۔ کل کسی نے اس میں دوا ملائی ہے۔ میں معلوم کروں گا کہ یہ

دشمنی کس نے کی ہے۔“

دشمن کو جانتے ہوئے بھی انجان بننا پڑا۔ ڈاکٹر نے شام کو اسپتال سے جانے کی اجازت دے دی۔ روائی سے پہلے سرفراز نے گامے کو بلا کر کہا ”یہاں ہماری تین گاڑیاں ہیں۔ تم ایک گاڑی لے جاؤ اور کسی ڈرائیور کو معاوضہ دے کر اسے سوزوکی کا..... اپنے ساتھ لے جانے کو کہو۔ میں ہنڈا اکارڈ لے آؤں گا۔ باہر انتظار کرو ہم ابھی آرہے ہیں۔“

گامے کے جاتے ہی موبائل فون پر سنگل ملا۔ رشیدہ نے اسے آن کر کے پوچھا ”ہیلو کون، شازیہ؟“

آواز آئی۔ ”نہیں۔ شازت۔“

وہ جلدی سے سیدھی بیٹھ کر بولی۔ ”بیٹی! میری جان! تم کہاں ہو؟ کیوں ماں کو پریشان کر رہی ہو۔ جانتی ہو بشارت نے کیسی دشمنی کی ہے۔ اگر تمہارے پیلا کو بروقت طبی امداد نہ ملتی تو ان کا ذہنی توازن بگڑ جاتا۔“

”یعنی وہ پاگل ہو جاتے۔ پھر مجھے پاگل ثابت کرنے کے قابل نہ رہتے۔“

”بیٹی! یہ تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ خدا کے لیے عقل سے کام لو۔“

”عقل سے کام لے رہی ہوں۔ پہلے بے عقلی سے کہا تھا کہ وہ میرے پیلا نہیں

ہیں۔ اب ڈنکے کی چوٹ پر انہیں پیلا کہوں گی۔ کیا ان سے بات کر سکتی ہوں۔“

سرفراز نے کہا۔ ”اسپیکر آن ہے، میں تمہاری باتیں سن رہا ہوں۔“

”ہیلو پیلا! کیا آپ انکار کریں گے کہ میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں؟“

”میں نے کبھی انکار نہیں کیا۔ تم پہلے بھی میری بیٹی تھیں اور آخری سانس تک

بیٹی رہو گی۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مل اور ملک سرفراز خان کی بیٹی ایک ڈرائیور کے

ساتھ بھاگی ہوئی ہے۔“

”تمہیں ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں۔ تم بہت اچھی بیٹی ہو، واپس آ جاؤ۔“

”ایسے تو نہیں آؤں گی۔ واپسی کی ایک شرط ہے۔“

”ہم تمہاری تمام شرائط مان لیں گے۔ کیا بشارت سے شادی کرنا چاہتی ہو؟“

”کوئی بلندی سے بستی میں آنا نہیں چاہتا۔ میں اتنے اونچے خاندان کی بیٹی ہوں اور قیامت بھی آجائے تو اس خاندان میں کوئی ڈرائیور ہمارا رشتے دار نہیں بن سکتا۔ اگر کوئی اس قابل ہوتا تو می اسے گلے کا ہار بنا کر رکھتیں اسے قتل نہ کراتیں۔“

رشیدہ نے کہا۔ ”یہ جھوٹ ہے، میں نے قتل نہیں کرایا تھا۔“

”اس کا مطلب ہے، وہ زندہ رہتے تو آپ کے سرتاج رہتے۔ میرے نانا جان اسے داماد قبول کر لیتے؟ اگر آپ کا جواب ہاں میں ہے تو پھر آپ اور پیلا بشارت کو داماد تسلیم کر لیں اور اگر آپ نے ایک ڈرائیور کو مجازی خدا بنائے رکھنا گوارا نہیں کیا تھا تو میں بھی گوارا نہیں کروں گی۔ آپ کے پاس واپس آؤں گی۔“

سرفراز نے کہا۔ ”واپس آنے کا یہی دانشمندانہ فیصلہ کرو۔ ایک ادنیٰ ملازم سے رشتہ کرنے کی غلطی ہو سکتی ہے لیکن ایسی غلطی نہ جاری رکھی جاسکتی ہے، نہ دہرائی جاسکتی ہے۔“

”میں یہی بات می کی زبان سے سننا چاہتی ہوں۔“

رشیدہ نے کہا۔ ”ہاں، میں نے ایک غلطی کی تھی۔ پھر اپنے والدین اور خاندان کی عزت کی خاطر احساس ہو گیا کہ گری ہوئی چیز کو اٹھانے کے لیے اتنا نہیں جھکنا چاہیے کہ ہمارے ساتھ والدین بھی گر پڑیں۔ بیٹی! واپس آ جاؤ۔“

”میں نے کہا تھا کہ واپسی کی ایک شرط ہے۔ جس طرح نانا جان نے آپ کو تلاش کیا اور ایک حقیر داماد کو قتل کرایا۔ ٹھیک اسی طرح آپ اور پیلا ہمیں تلاش کریں اور بشارت کو قتل کرائیں۔“

”دیکھو بیٹی! تم پھر ایب نارمل ہو کر بول رہی ہو۔“

”کیا گھر کی عزت پر ہاتھ ڈالنے والے ملازم کو مار ڈالنے اور بیٹی کو گھر واپس لانے والے ایب نارمل ہوتے ہیں۔“

”ہمیں طعنہ نہ دو بیٹی! یہ باتیں گھر آ کر کرو۔“

”میں گھر آنے کی شرط پیش کر چکی ہوں۔ آپ غور کریں پھر اپنا فیصلہ سنائیں۔ میں رات کو کسی وقت فون کروں گی۔ یہ بتائیں آپ اس وقت پنڈی میں ہوں گی یا لاہور میں؟“

”ہم ابھی لاہور جا رہے ہیں۔“

”اگر میری شرط کے مطابق آپ مجھے تلاش کرنا چاہیں گے تو میں بتا دوں گی کہ کس شہر میں ہوں لیکن اس روز بتاؤں گی جس روز یقین ہو جائے گا کہ آپ کی طرح میرے پاؤں بھی بھاری ہو گئے ہیں اور میں ایک ادنیٰ ملازم کی اولاد کو اونچے خاندان میں آکر پیدا کرنے والی ہوں۔“

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ سرفراز نے فون کو آف کر کے کہا۔ ”یہ ایک نفسیاتی کیس بن چکی ہے۔ ہم نے ماضی میں جو کیا اسے دہرا کر ہمیں اذیتیں دینا اور خود تسکین حاصل کرنا چاہتی ہے۔“

”خدا کے لیے اس لڑکی کو قابو میں کرنے کی کوئی تدبیر سوچیں۔“

وہ اٹھ کر بولا۔ ”چلو راتے میں باتیں ہوں گی۔“

وہ اسپتال سے نکل کر اپنی کار کے پاس آئے۔ رشیدہ نے گامے سے کہا ”ہمارے ساتھ یہ گاڑیاں لے کر چلو۔ تمہارے صاحب بیماری سے اٹھے ہیں، ہو سکتا ہے لمبی ڈرائیو نہ کر سکیں اس لیے ہمارے ساتھ رہنا۔“

گامے نے تیسری گاڑی لے جانے کے لیے ایک ڈرائیور کی خدمات حاصل کیں، پھر وہ سب آگے پیچھے چل پڑے۔ سرفراز نے کہا۔ ”شائستہ یہ شرط پیش نہ کرتی۔ تب بھی ہم اسے تلاش کرتے اور کریں گے اور بشارت کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

”نہیں، اب آپ خون خرابے سے پرہیز کریں۔ بشارت پر مٹی ڈالیں۔“

”اسے معاف نہیں کیا جاسکتا۔ سلامت کو یہی سوچ کر ختم کیا گیا تھا کہ وہ زندہ رہے گا تو اپنے جیسے چھوٹے لوگوں میں تمہارا نام لیتا رہے گا اور ہمیں بدنام کرتا رہے گا یا بلیک میل کرتا رہے گا۔ تم نہیں جانتیں، یہ چھوٹے لوگ بہت ہم کم طرف ہوتے ہیں۔ مٹی کے کیرٹوں کو سر اٹھانے سے پہلے پھل دینا چاہیے۔“

”مجھے تو بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ اگر شائستہ کے گھر سے جانے کی خبر پھیل گئی تو میر کسی کو منہ دکھانے سے پہلے خود کشی کر لوں گی۔“

”احتمالاً باتیں نہ سوچو۔ کوئی بھی پوچھے تو کہا جائے گا کہ شائستہ یو۔ کے گئی ہے۔ مجھے سب سے زیادہ فکر شازیہ کی ہے۔ بڑی بہن بدنام ہوگی تو چھوٹی بھی دنیا والوں کو

نظروں سے گرے گی۔ میری بیٹی اپنے سرال جائے گی تو کسی سے آنکھ ملا کر اپنے خاندان کی نیک نامی کی باتیں نہیں کر سکے گی۔“

”وہ ایک لڑکی بہت سے مسائل پیدا کرے گی۔ آپ یہ سوچیں کہ یہ معاملہ کیسے نئے گا اور کتنی جلدی منٹ سکتا ہے؟“

”جلدی کی بات نہ کرو۔ ہم اپنی طرف سے اس وقت تک کچھ نہیں کر سکتے، جب تک ان کا پتا نہ چلے اور وہ تب ہی اپنا پتا بتائے گی، جب ایک بچے کی ماں بننے والی ہوگی۔ اس کے منصوبے کے مطابق کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کب ماں بنے گی؟“

”یہ بہت ہی بے شرمی کی بات ہے۔ پتا نہیں اس نے نکاح پڑھوایا ہے یا نہیں؟“

”برانہ ماننا، وہ تمہارے نقش قدم پر چل رہی ہے۔ نکاح ضرور ہو چکا ہوگا۔“

رشیدہ نے سر جھکا لیا۔ کوئی جواب نہ دے سکی۔ سرفراز ڈرائیو کرتے وینڈا اسکرین کے پار دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ ”ہم اسے ایب نارمل کہہ رہے ہیں۔ حقیقتاً وہ پاگل نہیں ہے۔ مجھے پاگل بنا رہی ہے۔ کوئی بھی کچھ کرتا ہے تو اس کے پیچھے کوئی مقصد ہوتا ہے۔ بے مقصد اور بنیادی وجوہات کے بغیر کچھ کرنے والا پاگل کہلاتا ہے۔“

شائستہ جو کر رہی تھی اس کی بنیادی وجوہات تھیں۔ اس کا مقصد انتقام لینا تھا۔ وہ دنیا والوں سے لاکھ کتا رہے کہ وہ لڑکی ایب نارمل ہے لیکن خود حقیقت سے انکار نہیں کر سکے گا کہ شائستہ چالاک ہے۔ بے باک ہے، ماں کی ہسٹری ماں کی زندگی میں دہرا رہی اور سوتیلے باپ کا داؤ، سوتیلے باپ پر ہی آزمایا ہے۔

وہ رات کے گیارہ بجے گھر پہنچے۔ شازیہ اور زہیر کے ساتھ کھانا کھایا۔

ایک بجے کے قریب شائستہ نے فون پر مخاطب کیا۔ رشیدہ نے شازیہ اور زہیر سے کہا کہ وہ اپنے بیڈ روم میں جائیں۔ پھر وہ سرفراز کے ساتھ اپنی خواب گاہ میں آگئی۔ دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ شائستہ نے پوچھا ”پاپا کی طبیعت کیسی ہے؟“

”ہماری نیکیاں آڑے آگئیں اور تمہارے پاپا ہوش میں آگئے۔ ورنہ بشارت نے ان کا ذہنی توازن بگاڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔“

”پاپا نے نہیں بتایا کہ وہ ضرر رساں دوا بشارت کو کس نے دی تھی میں اپنے مقتول باپ کی قسم کھا کر کہتی ہوں، پاپا نے بشارت کو رازدار بنایا پھر وہ دوا دی، اسے حکم دیا

کہ وہ میرے کھانے پینے کی کسی چیز میں دوا ملائے تاکہ میرا ذہنی توازن بگڑ جائے اور وہ مجھے پاگل خانے پہنچا دے۔“

سرفراز نے کہا۔ ”یہ جھوٹ ہے۔ تم بے بنیاد الزام لگا رہی ہو۔“

”آپ نے می سے کہا تھا کہ میں مری سے واپسی پر نارمل نہ رہی اور جوش و جنون کا مظاہرہ کیا تو مجھے پاگل خانے بھیج دیا جائے گا۔ آپ بشارت کے ذریعے مجھے پاگل بنانے کے تمام انتظامات کر چکے تھے لیکن بشارت نے آپ کے کھودے ہوئے گڑھے میں آپ ہی کو گرا دیا۔“

”رشیدہ! اس سے کو ایسی بکواس کرنا ہے تو پھر ہمیں فون نہ کرے۔“

”آپ فون کا رابطہ ختم کر سکتے ہیں۔ ماں سے بیٹی کا رشتہ نہیں توڑ سکتے۔“

”بیٹی! تم سے کبھی رشتہ نہیں ٹوٹے گا۔ میری ایک بات مان لو۔ ہم سے کہیں ملاقات کرو۔ ہم ایک اچھے ماحول میں باتیں کریں گے تو.....“

وہ بات کاٹ کر بولی۔ ”جو مجھے پاگل خانے پہنچانے کی سازش کر چکا ہے اور جس نے میرے ابو کو ہلاک کیا ہے اس کے ساتھ اچھے ماحول میں کبھی گفتگو نہیں ہوگی۔“

سرفراز نے کہا۔ ”جب میں دشمن ہوں تو مجھے پایا کیوں کہہ رہی ہو؟“

”پایا کہتی رہوں گی تاکہ دنیا والوں کو معلوم ہو کہ ملک سرفراز خاں کی بیٹی گھر سے بھاگی ہے۔ تم میں حوصلہ ہے تو اعلان کرو کہ میں تمہاری بیٹی نہیں ہوں۔ میں یہ تماشا دیکھوں گی کہ تم اپنی شریک حیات رشیدہ بیگم کے کردار پر کیسے کچڑا اچھالو گے اور اپنی بیٹی شازیہ اور زہیرہ کو کس طرح دنیا والوں کی نظروں سے گراؤ گے۔“

سرفراز نے شکست خوردہ ساہو کر کہا۔ ”تم ہماری کمزوریوں سے فائدہ اٹھا رہی ہو لیکن ہماری بے عزت اور بدنای کے بعد تمہیں بھی سوسائٹی میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جائے گا۔ کوئی ایسا راستہ اختیار کرو کہ خاندانی وقار کو ٹھیس نہ پہنچے۔ ہماری عزت پر اور تمہاری عزت پر حرف نہ آئے۔ تمہارے دل کو اطمینان ہو اور ہمیں بھی سکون حاصل ہو۔“

”یہ می کہہ چکی ہیں کہ گری ہوئی چیز کو اٹھانے کے لیے اتنا نہیں جھکنا چاہیے کہ اٹھانے والے خود بھی گر پڑیں۔ میں بھی بشارت کو اٹھانے کے لیے جس حد تک جھک گئی

ہوں، اس سے زیادہ جھکنا نہیں چاہتی۔ آپ اس کانٹے کو نکال پھینکیں۔ جس طرح برسوں پہلے ایک ڈرائیور کو ٹھکانے لگایا، اسی طرح بشارت کو بھی ٹھکانے لگا دیں۔ پھر میں واپس آ جاؤں گی۔“

”تمہاری یہی ضد، یہی شرط ہے تو پوری ہو جائے گی۔ بتاؤ تم کہاں ہو؟“

”بتاؤ گی۔ ابھی میرے پاؤں ہلکے ہیں بھاری ہونے دو۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ رشیدہ ہیلو ہیلو کہہ کر مخاطب کرتی رہی۔ مگر جواب نہ ملا۔ وہ بولی۔ ”گامے کی بات میرے دل کو لگ رہی ہے وہ کراچی گئی ہوگی وہاں کی گنجان آبادی میں اسے تلاش کرنا مشکل ہوگا۔ وہ وہاں آسانی سے چھپی رہے گی۔“ وہ سوچتی ہوئی نظروں سے رشیدہ کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا وہ کراچی میں ہے یا نہیں ابھی موبائل فون کے کوڈ سے معلوم ہو جائے گا۔

اس نے فون کو آن کیا۔ کراچی کا کوڈ استعمال کیا۔ پھر نمبر ڈائل کیے فوراً ہی رابطہ ہو گیا۔ پتا چل رہا تھا کہ شائستہ کا موبائل فون سنگل دے رہا ہے لیکن وہ اٹینڈ نہیں کر رہی تھی۔ سوچ رہی ہوگی کہ نئے شہر میں کون اسے فون کرے گا؟ گھر والوں کے سوا کوئی اس کا موبائل نمبر نہیں جانتا تھا۔

پھر ادھر سے فون بند کر دیا گیا۔ سرفراز نے اپنے فون کو آف کرتے ہوئے کہا۔

”یہ اچانک بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ اس کا سراغ مل گیا ہے۔ وہ کراچی میں ہے۔“

”میں کراچی جاؤں گی۔ اس سے ملوں گی۔“

”تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے اس کا پتا جانتی ہو اور جاتے ہی تمہاری ملاقات ہو جائے گی۔“

”آپ بھی ساتھ رہیں گے، ہم اسے تلاش کریں گے۔“

”کیا ضروری ہے کہ وہ مل جائے؟ اسے ڈھونڈ نکالنے میں ہفتے اور مہینے گزر سکتے ہیں۔ کیا تم گھر اور بچوں کو چھوڑ کر وہاں ڈیرا جماؤ گی؟“

”آپ تنہا کیسے جائیں گے؟ ابھی اسپتال سے آئے ہیں، اتنی دور آپ کی دیکھ بھال

کون کرے گا۔ کسی کو آپ کے ساتھ ہونا چاہیے۔“

”میں دھوکے سے اسپتال پہنچ گیا تھا۔ اب کوئی مجھے دھوکا نہیں دے سکے گا۔ تم

میری فکر نہ کرو۔ میں دن رات فون کے ذریعے تم سے رابطہ رکھوں گا۔“

☆=====☆=====☆

بشارت کو یہ امید ہو چلی تھی کہ پنڈے سے اپنے باپ کے جو خواب لے کر آیا ہے وہ جلد ہی پورے ہوں گے۔ وہ اپنے باپ کی خواہش کے مطابق بہت بڑا افسر تو نہیں بن سکے گا، پر بڑا آدمی ضرور بن جائے گا۔ جب ماں باپ سے ملنے جائے گا تو دولت مند کہلائے گا۔ شائستہ جتنا مال لے کر آئی تھی، مل میں اور جائیداد میں اس کا جتنا حصہ تھا، ان سب کا حساب کیا جائے تو وہ اپنے پنڈے کے چودھری سے زیادہ مالدار ہو رہا تھا۔

شائستہ اس پر مہربان تھی۔ مقدر ساتھ دے رہا تھا لیکن ذرا دھمکی بھی دے رہا تھا۔ جب بھی وہ کامیابی حاصل کرتا تھا تو عارضی اندھا پن یاد آجاتا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اس نے آئی بینک میں اپنا نام لکھوایا تھا۔ اس بینک کے ذریعے نئی آنکھیں لگانے کا نمبر آتا اور اسے کال کیا جاتا تو اسے خبر نہ ہوتی۔ شائستہ اسے کراچی لے آئی تھی۔

اس نے شائستہ سے عشق کرنے اور لاہور چھوڑنے کا فیصلہ بڑی غلبت میں کیا تھا۔ اس وقت اس کے سامنے شائستہ کا حسن و شباب، بے انتہا دولت اور اونچے خاندان کا ایک اہم فرد بننے والی درخشاں منزل تھی۔ بعد میں خیال آیا کہ منزل اسی وقت درخشاں نظر آئے گی، جب بینائی ہوگی۔ اسے جہاں سے آنکھیں حاصل ہو سکتی تھی، وہ شہر چھوڑ آیا تھا۔

یوں تو دوسرے شہروں کے آئی بینک میں بھی وہ اپنا نام درج کرا سکتا تھا لیکن یہ پتا نہیں تھا کہ شائستہ کے ساتھ کتنے شہروں میں بھٹکنا ہوگا، کسی ایک شہر میں رہنا نصیب ہوگا تو وہ آئی بینک والوں سے رجوع کرے گا۔ ورنہ حسینہ کے پیچھے چلتے چلتے ایک دن اندھا ہو جائے گا۔

شائستہ نے کراچی پہنچ کر اسٹیشن کے قریب ہی ہوٹل پلازا میں قیام کیا۔ بشارت نے پوچھا۔ ”ہم اسی شہر میں مستقل رہیں گے؟“

”مستقل رہ سکتے ہیں۔ حالات نے مجبور کیا تو یہاں سے جا بھی سکتے ہیں۔ ہمیں سب سے پہلے ایک مکان حاصل کرنا چاہیے۔ ہوٹل منگا پڑے گا۔ پھر پولیس والے ہم پر شبہ کریں گے۔“

”ٹھیک ہے، میں کل صبح مکان تلاش کرنے جاؤں گا۔“

”جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سامنے اخبار پڑھا ہے، اشتہار والا صفحہ دیکھو۔ میں

دوسرے کمرے میں جا رہی ہوں۔ فون پر مئی سے بات کروں گی۔ تم ادھر نہ آنا۔“
اس نے دوسرے کمرے میں جا کر درمیانی دروازہ بند کر دیا۔ بشارت نے بند دروازے کو دیکھا۔ پھر اخبار اٹھا کر ایک صفحے پر آکر بیٹھ گیا۔ بڑی بڑی سرخیوں میں سیاسی خبریں چھپی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ اسے سیاست سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے وہ صفحہ الٹ دیا۔ وہ دوسرا صفحہ بھی نہ پڑھتا لیکن وہاں ایک اغوا کی خبر شائع ہوئی تھی۔ جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا ”ایک عورت بائیس برس کے جوان کو اغوا کر کے کراچی لے آئی۔“ یہ خبر حسب حال تھی۔ یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ شائستہ کو اغوا کر کے لایا ہے یا شائستہ نے اسے اغوا کیا ہے۔ اخباری خبر کے مطابق چار بچوں کی ماں نے اپنے شوہر کو دھوکا دیا۔ ایک نوجوان سے عشق کیا۔ اور اس کے عشق میں چاروں بچوں کو چھوڑ کر کراچی آئی ہے۔ گرفتار ہونے پر اس نے بیان دیا کہ نوجوان بے قصور ہے وہ اسے سبز باغ دکھا کر لے آئی ہے۔

بشارت نے دل میں کہا شکر ہے، مجھے بھگا کر لانے والی دولت مند دوشیزہ ہے لیکن ہمارے لیے خطرہ ہے۔ ہم بھی کسی وقت پولیس کی گرفت میں آسکتے ہیں۔ اس سے پہلے ہی کرائے کا کوئی مکان حاصل کر لینا چاہیے۔

اس نے اشتہار والا صفحہ کھول کر نگاہوں کے سامنے کیا۔ اسی وقت آہستہ آہستہ کمرے کی لائٹس بجھنے لگیں۔ پھر ایک دم..... سے تاریکی چھا گئی۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ شاید بجلی نہیں گئی تھی۔ آنکھیں بے وفائی کر رہی تھیں۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں ہاتھوں سے راستہ ٹٹولتا ہوا کھڑکی کی طرف جانے لگا۔ شام کے پانچ بجتے والے تھے۔ باہر دن کی روشنی دیکھی جاسکتی تھی۔ اس نے کھڑکی کے دیز پر دے کو ذرا سا ہٹایا۔ باہر بھی گہری تاریکی تھی۔ وہ چند ساعتوں تک سانس لیتا بھول گیا۔ عارضی اندھا پن پھر طاری ہو گیا تھا۔

سب سے پہلا خوف یہی ہوتا تھا کہ اندھا پن عارضی نہیں ہوگا۔ اس بار دائمی ہوگا تو کیا ہوگا؟ خوف بھی کیا چیز ہے جیسے ہی حواس پر غالب آتا ہے، خدا یاد آجاتا ہے۔ توبہ

توبہ! یا اللہ! توبہ توبہ۔ میرے مالک! مجھے معذور نہ کر۔ اندھے پن سے بڑی معذوری کوئی نہیں ہوتی۔ میری بینائی بحال کر دے۔ میں گناہوں سے توبہ کرتا ہوں۔ توبہ توبہ.....

وہ راستہ ٹٹلتا ہوا پھر صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ یہ پریشانی تھی کہ ابھی شائستہ آئے گی تو کیا ہوگا؟ اسے اندھا پا کر اس کا جو رد عمل ہوگا؟ اسے دیکھ بھی نہیں سکے گا۔

وہ اپنے ماں باپ سے بھی اپنی آنکھوں کے نقص کو چھپاتا آیا تھا۔ اپنی پہلی محبوبہ بیٹو کو بھی یہ کمزوری نہیں بتائی تھی۔ بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو اپنا نقص یا عیب ظاہر کرتے ہیں، وہ ظاہر کرتے ہوئے سبکی محسوس کرتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنی اہمیت کم کر رہا ہے۔ اس نے آتی جاتی بینائی کے سلسلے میں کسی دوست احباب اور عزیزو اقارب سے مشورہ نہیں کیا تھا صرف ڈاکٹر کے پاس گیا تھا لیکن اب شائستہ کے ساتھ دن رات رہنا تھا۔ اب وہ بینائی کا المیہ اس سے چھپا نہیں سکتا تھا۔

اسی لیے مرد عورت کو نکاح کے بندھن میں باندھا جاتا ہے تاکہ وہ ساتھ رہتے رہتے ایک دوسرے کے عیوب دیکھیں، انہیں برداشت کریں اور ایک دوسرے کے تعاون سے اپنی کمزوریاں اور خرابیاں دور کریں۔ شائستہ بیوی ہوتی تو اطمینان ہوتا۔ بیویاں اپنے شوہروں کی ناقابل برداشت برائیوں کو بھی برداشت کر لیتی ہیں لیکن محبوبہ ٹھک جاتی ہے۔ شادی کے مرحلے سے پہلے ہی کترا جاتی ہے۔

وہ تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ایسے ہی وقت آہٹ محسوس ہوئی۔ وہ دردناک کھول کر آئی تھی اور پوچھ رہی تھی۔ ”تم نے اخبار دیکھا۔ کیا ہوا؟ خاموش کیوں ہو؟“

وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ ”مجھے نظر نہیں آرہا ہے۔“

”کیا اخبار نظر نہیں آرہا ہے؟ یہ سامنے پڑا ہے۔“

”شائی! مجھے کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔ تم بھی نظر نہیں آرہی ہو۔“

”یہ کیا مذاق ہے؟ سر اٹھاؤ میری طرف دیکھو۔“

اس نے سر اٹھا کر ایک طرف دیکھا۔ وہ بولی۔ ”ادھر نہیں، ادھر مجھے دیکھو۔“

اس نے آواز کی سمت سر گھما کر کہا۔ ”میں نے اپنی یہ کمزوری یا معذوری آج تک کسی کو نہیں بتائی، کبھی کبھی میری آنکھوں کے سائے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ میں تھوڑی دیر کے لیے اندھا ہو جاتا ہوں۔“

وہ قریب آکر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی ”جھوٹ بولتے ہو۔ اگر تمہارے ساتھ یہ ٹریجڈی ہے تو تم گاڑی کیسے چلاتے ہو؟“

”اب تک اللہ تعالیٰ مہربان ہے۔ گاڑی ڈرائیو کرنے کے دوران کبھی ایسا نہیں ہوا۔ اس روز تم فاروق کے ساتھ پرل گئی تھیں تو ایسا ہوا تھا۔ پھر تمہارے آنے سے پہلے بینائی بحال ہو گئی تھی۔ میں دعا مانگ رہا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو ابھی دیکھنے لگوں گا۔“

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر اس سے الگ ہو گئی۔ ایک اندھا اور اس کا ساتھی؟ وہ نفرت سے پھٹ پڑی۔ ”یو ایڈیٹ! نان سنس! تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ میں تمہارے جیسے اندھے کو ساتھ لے کر اس شہر میں کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتی پھروں گی؟“

وہ اندھیرے میں نکلتے ہوئے سوچنے لگا، کیا جواب دے؟ کوئی جواب ہی نہیں تھا۔ اندھے کو کون ہم سفر بناتا ہے۔ اسے غصہ آرہا تھا کہ جس پر بھروسہ کیا اس نے اپنی معذوری چھپائی۔ وہ بولی۔ ”کیا سوچ کر میرے ساتھ آئے ہو؟ تم نے سوچا ہوگا؟ اندھا پن کبھی ظاہر نہیں ہوگا اور تم میری دولت پر عیش کرتے رہو گے۔“

”نن، نہیں..... مجھے غلط نہ سمجھو شائی!“

وہ تراخ کی آواز کے ساتھ زوردار طمانچہ رسید کرتے ہوئے بولی۔ ”خبردار! مجھے شائی کہنے سے پہلے اپنی اوقات سمجھو۔“

اگر منہ پر طمانچہ پڑے تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے مگر کمال ہو گیا، طمانچہ پڑتے ہی دنیا روشن ہو گئی۔ وہ خوشی سے اچھل کر بولا ”میں دیکھ سکتا ہوں۔ تمہیں دیکھ سکتا ہوں۔ مجھے کمرے کی ایک ایک چیز نظر آرہی ہے۔“

شائستہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ بعض عورتیں اپنے مرد کو آنچل کی طرح سر پر رکھتی ہیں اور بعض عورتیں جو تئیں کی طرح مرد کو پہنتی ہیں۔ شائستہ جو بیوی پن کر آئی تھی، وہ کٹ رہی تھی۔ سوچ رہی تھی، بشارت کو پن کر کتنی ذور چل سکے گی؟ وہ ایک آدھ بار کراچی آئی تھی۔ یہ شہر اچھی طرح دیکھا نہیں تھا۔ اس لیے نیا اور انجانا سا تھا۔ یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ ساتھ چلتے چلتے وہ اچانک اندھا ہو جائے گا تو سر راہ تماشا بن جائے گا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ لوگوں کی بھیڑ میں طمانچہ مار کر اس کی بینائی واپس لائے۔

وہ جھنجھلا کر بولی۔ ”یہ کیسی بینائی ہے؟ گنوار عورت کی طرح لات جوتے کھا کر راہ

راست پر آتی ہے۔“

وہ بولا۔ ”ایسی بات نہیں ہے۔ یہ محض اتفاق ہے ورنہ بینائی خود بخود واپس آتی ہے۔“

”میں تم پر بھروسہ کر رہی ہوں۔ خود کو تنہا محسوس کر رہی ہوں۔“

”ایسا نہ کہو۔ میں ہر قدم پر تمہارے ساتھ ہوں۔“

”تم میرے ساتھ نہیں ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں، تمہیں راستہ دکھانے اور سڑک پار کرانے کے لیے۔“

”مجھے طعنہ نہ دو۔ میں نے لاہور کے آئی بینک میں نام لکھوایا تھا۔ یہاں بھی اپنا نام درج کراؤں گا۔ کوئی خدا کا بندہ آنکھوں کا عطیہ دے گا تو مجھے نئی آنکھیں مل جائیں گی۔“

”صاف صاف بتاؤ۔ ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟“

”آنکھوں میں موتیا ہے۔ بس کسی وقت بھی اندھا ہو سکتا ہوں۔“

”اگر تم آج کل میں اندھے ہو جاؤ گے تو میں تمہیں کہاں لیے پھروں گی؟ کیا میں تمہارا بوجھ اٹھانے گھر سے آئی ہوں؟ کیا تمہارے باپ کی نوکرائی ہوں؟ اپنا بوریا بستر باندھو۔ واپسی کا کرایہ لو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“

اس نے سر جھکا لیا۔ اس کے سامنے ادب سے بیٹھا رہا۔ وہ ناگواری سے بولی۔

”میں تمہاری صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔ دوسرے کمرے میں جاؤ۔“

وہ بڑی فرمانبرداری سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ شائستہ تھوڑی دیر تک پیچ و تاب کھاتی رہی۔ جیون ساتھی ہو یا عارضی ہم سفر ہو، اس کے انتخاب میں لڑکیاں اکثر دھوکا کھاتی ہیں۔ وہ باپ کے قاتل سے انتقام لینے نکلی تھی۔ ایسے میں بشارت اس کی کمر توڑ رہا تھا۔

اس نے سامنے پڑا ہوا اشتہار کا صفحہ اٹھالیا۔ ہم سفر اندھا ہو یا لنگڑا، وہ واپس نہیں جانا چاہتی تھی اور اس شہر میں رہنے کے لیے مکان ضروری تھا۔ اس نے اشتہار پڑھ کر ایک اسٹین ایجنسی کو فون کیا پھر کہا۔ ”مجھے اچھے علاقے میں ایک چھوٹا سا کرائے کا مکان چاہیے۔ دو بیڈ روم اور ڈرائنگ ڈائننگ، فرسٹ ہو تو بہتر ہے۔“

جواب ملا۔ ”گلشن میں ایسا ایک مکان ہے۔ تمام ضروری سامان سے آراستہ ہے۔“

ماہانہ پانچ ہزار روپے کرایہ اور ایک سال کا ایڈوانس۔“

”کیا ابھی مکان دکھا سکتے ہیں؟“

”جی ہاں، آپ تشریف لے آئیں۔“

”میرے پاس گاڑی نہیں ہے۔ میں گاڑی کا کرایہ بھی ادا کروں گی، آپ اپنے کسی بندے کو راہنمائی کے لیے بھیج دیں۔ میں ہوٹل پلازا کے کمر نمبر ایک سو گیارہ میں ہوں۔“

دوسری طرف سے کہا گیا کہ ان کا ایک بندہ آرہا ہے۔ شائستہ نے ریسیور رکھ دیا۔ وہاں سے اٹھ کر بستر پر آکر لیٹ گئی۔ بشارت کے متعلق سوچ کر بڑی مایوس ہو رہی تھی۔ بچھتا رہی تھی کہ سارے کے لیے ایسے مرد کا انتخاب کیوں کیا؟ اور اب ساتھ ہو ہی گیا ہے تو یہ ساتھ کب تک نبھایا جائے گا۔

ابھی کچھ دیر پہلے اس نے اپنی ماں سے اور سرفراز سے کہا تھا کہ ایک شرط پر گھر واپس آئے گی۔ اپنی مٹی سے کہا، جس طرح نانا جان نے آپ کو تلاش کیا اور ایک حقیر داماد کو قتل کرایا ٹھیک اسی طرح آپ اور پاپا ہمیں تلاش کریں اور بشارت کو قتل کرائیں۔ اس نے اپنی مٹی کو طعنہ دینے کے لیے کہا تھا کہ ڈرائیور سلامت کی طرح ڈرائیور بشارت کو بھی قتل کرایا جائے۔ ایسے ادنیٰ ملازم اسی قابل ہوتے ہیں۔ کوٹھی والوں کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی سزا موت سے کم نہیں ہونی چاہیے۔

دراصل وہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اس کی مٹی نے اس کے ڈرائیور ابو سے واقعی محبت کی تھی یا ابو کو کمتر اور حقیر سمجھ کر سرفراز اور نانا جان کے آگے سر جھکا لیا تھا۔ مٹی کا جواب تھا کہ انہوں نے غلطی کی تھی۔ والدین اور خاندان کی عزت کی خاطر احساس ہو گیا تھا کہ کبوتر کو کبوتر کے ساتھ اور باز کو باز کے ساتھ پرواز کرنا چاہیے اور عزت دار کو عزت دار کے ساتھ رشتہ کرنا چاہیے۔

اس وقت ماں کی بات بری لگی تھی کیونکہ اس کے ڈرائیور باپ کو عزت دار نہیں سمجھا گیا تھا۔ باپ خواہ کیسا ہی ہو، بیٹی کے لیے عزت دار اور قابل فخر ہوتا ہے لیکن ابھی بشارت کا اندھا پن دیکھ کر خیال آیا کہ سب ہی ڈرائیور اس کے باپ سلامت جیسے نہیں ہوتے۔ بشارت کی طرح اندر سے ٹوٹے پھوٹے بھی ہوتے ہیں۔

پھر اس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ غلطی اپنی ہی ہے۔ اسی نے بشارت میں اپنے ڈرائیور باپ کی جھلک دیکھی تھی۔ خود ہی اس کی طرف مائل ہوئی تھی۔ پھر بشارت جانتا بھی نہیں تھا کہ وہ گھر کو اور ماں باپ کو چھوڑ کر جانے والی ہے۔ اس نے ساتھ چلنے کو کہا تو وہ ساتھ چلا آیا، حکم کا بندہ تھا۔ اس کے احکامات کی تعمیل کر رہا تھا۔

دراصل اسے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا اور وہ اس پر غصہ اتار رہی تھی۔ اگر اپنی فطرت کا تجزیہ کرتی تو سمجھ میں آتا کہ بشارت پر ہاتھ اٹھا کر اسے گالیاں دے کر غیر شعوری طور پر تسکین حاصل ہوئی تھی۔ وہ ایسا ہی تابعدار چاہتی تھی جو محبت کے معاملے میں زبردست ہو اور احکامات کے معاملے میں زبردست رہا کرے۔

وہ سوچتے سوچتے بے اختیار بشارت کی تمنائی میں پھنچ گئی۔ اس نے اب تک پاکستان اور یورپی ممالک میں چار ہوائے فریڈز بنائے تھے۔ ان سے دوستی کی تھی پھر بے زار ہو کر انہیں چھوڑ دیا تھا۔ وہ چاروں اب بشارت کے سامنے بیچ تھے۔ وہ ایسا گھرو جوان تھا۔ کہ حواس پر چھا جاتا تھا۔ اب بھی اس کی ایک معذوری کو دیکھ لینے کے بعد اسے چھوڑنے پر دل راضی نہیں تھا۔ دل مانتا تھا کہ جتنی دیر وہ مصروف رکھتا ہے، اتنی دیر وہ اپنی حکمرانی اور غرور کو بھول جایا کرتی تھی۔ جی چاہتا تھا، اس تابعدار کی حکمرانی دراز رہے۔

وہ دستک سن کر خیالات سے چونک گئی۔ دوسرے کمرے کے دروازے پر کوئی آیا تھا۔ بشارت اس سے کچھ بول رہا تھا، پھر وہ درمیانی دروازہ کھول کر شائستہ کے پاس آیا۔ پھر بولا۔ ”اسٹیٹ ایجنسی سے ایک بندہ آیا ہے۔“

وہ بستر سے اٹھ کر بولی۔ ”ہم ابھی ایک مکان دیکھنے جا رہے ہیں۔“

وہ منہ پھیر کر بولا۔ ”مجھے تو تم نے واپس جانے کو کہا ہے۔“

وہ اس کے سامنے آئی۔ پھر اس کی گردن میں دونوں ہاتھیں ڈال کر بولی۔ ”ناراض

ہو؟“

وہ کچھ نہ بولا۔ شائستہ نے اس کے چہرے کو اپنے چہرے پر جھکا لیا۔ اس کے بند ہونٹوں کی خاموشی توڑ دی۔ پھر بولی۔ ”کیس نہیں جاؤ گے۔ تم میرے ہو۔ میں کل ہی تمہیں کسی آئی اسپیشلسٹ کے پاس لے چلوں گی۔“

وہ بولا۔ ”تمہیں اتنا غصہ کیوں آتا ہے؟“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”تمہیں میرا پیار اچھا لگتا ہے غصہ بھی اچھا لگتا چاہیے۔ تم میری ہر اچھی بری عادت کو برداشت کرو گے۔ میرے ہر حکم کی تعمیل کرو گے، بولو کرو گے؟“

”ہاں کروں گا۔ تمہارے مزاج کو سمجھتا جا رہا ہوں۔“

”اب جاؤ۔ اس بندے سے باتیں کرو۔ میں لباس بدل کر آتی ہوں۔“

وہ چلا گیا۔ شائستہ تھوڑی دیر بعد لباس بدل کر آئی۔ پھر اس شخص کی رہنمائی میں گلشن کے علاقے میں ایک چھوٹی سی کوٹھی دیکھی جو اسے پسند آئی۔ اسٹیٹ ایجنسی آکر تمام معاملات طے کیے۔ نقد رقم ہو تو تمام سودے طے ہو جاتے ہیں، اس نے مطلوبہ رقم ادا کر کے اس کوٹھی کی چابیاں حاصل کر لیں۔ رات کے نو بجے تک وہ دونوں ہوٹل چھوڑ کر کوٹھی میں آ گئے۔

دونوں میں دوستی ہو گئی تھی۔ وہ آدمی رات تک خوب ہنستے کھیلتے رہے پھر بشارت ایک ہوٹل سے کھانا لے آیا۔ شائستہ نے کھانے کے بعد کہا۔ ”میں می سے باتیں کروں گی، تم تھوڑی دیر کے لیے دوسرے کمرے میں چلے جاؤ۔“

”چلا جاتا ہوں لیکن میرے اور تمہارے درمیان کوئی پردہ نہیں رہا ہے۔ پھر میرے سامنے می سے باتیں کیوں نہیں کرتی ہو؟ کیا ابھی تک میں تمہارے لیے غیر ہوں؟“

”تم میرے اپنوں سے زیادہ اپنے ہو لیکن می کا ایک ذاتی معاملہ ہے لہذا صرف ان سے ہی بولنا بہتر ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ سر تسلیم خم ہے، جو مزاج یار میں آئے۔“

وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ شائستہ نے اب تک بشارت کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کی می بھی کسی ڈرائیور کے ساتھ ایک بار گھر چھوڑ کر گئی تھی۔ ایسا کہنے سے ماں کی توہین کا احساس ہوتا تھا۔ اس نے سوچا تھا، جب بشارت کو ہمیشہ کے لیے اپنانے کا آخری فیصلہ کر لے گی تو اسے اپنے خاندان کی پوری ہسٹری سنائے گی۔

اس نے ماں سے رابطہ کیا۔ وہ سرفراز کے ساتھ پنڈی سے لاہور آ گئی تھی اور اسی کے فون کا انتظار کر رہی تھی۔ ہر ماں کی طرح وہ بھی چاہتی تھی کہ بیٹی واپس آجائے اور یہ توقع تھی کہ اسے گھر واپس آنے کے لیے فون پر راضی کر لے گی لیکن شائستہ نے صرف

خواہ بول رہا ہوں، کیواس کر رہا ہوں۔“

وہ ایک لمبی سانس لے کر بولی۔ ”اچھا بس کرو۔ زیادہ نہ بولو، ذرا اسی بات پر منہ پھلانا، عورت کی طرح نخرے کرنا مرد کو زیب نہیں دیتا۔ چلو لائٹ آف کرو اور آجاؤ۔“

اس نے زیر و پاؤر کا بلب آن کیا۔ باقی بتیاں بجھائیں، پھر اس کے پاس آگیا۔ وہ بولی۔ ”ہمیں محتاط رہنا ہوگا۔ میں برقع پہن کر باہر نکلا کروں گی۔ تم داڑھی اور سر کے بال بڑھاؤ۔ سیاہ چشمہ پہنا کرو۔ شلوار قمیص چھوڑو۔ پینٹ شرٹ پہنا کرو۔ اس طرح تمہارا حلیہ اس حد تک بدل جائے گا کہ بہت غور سے دیکھے جانے کے بعد شاید پہچانے جاسکو گے۔“

”تم جو کہو گی، وہی کروں گا لیکن ہم کب تک چھپتے رہیں گے؟“

”جب تک میری اور سرفراز کی جنگ جاری رہے گی۔ آج یہ تمہیں بتا دوں کہ اس جنگ میں سب سے پہلا خطرہ تمہاری جان کو ہے۔ وہ ہمارے خاندان کے تحمل میں تمہیں ٹاٹ کے پیوند کی طرح لگنے نہیں دے گا۔ بدنامی کو خاموشی سے دفن کرنے کے لیے تمہیں مار ڈالے گا۔“

اس نے بازوؤں میں اسے سمیٹ کر کہا۔ ”مرد ازل سے زن، زر اور زمین کے لیے اپنی جان داؤ پر لگاتا آیا ہے۔ میں نے بھی یہ جان تمہارے نام کر دی ہے۔ میری فکر نہ کرو، ہو سکتا ہے وہ مجھے مارنے آئے اور میرے ہاتھوں سے فٹا ہو جائے۔“

”یہ تم نے مردوں والی بات کی ہے۔ میرا حوصلہ بڑھ گیا ہے۔ کل میں آئی آپیشلسٹ کے پاس تمہیں لے جاؤں گی۔ تمہیں نئی آنکھیں، نئی بینائی دلانے کے لیے بے دریغ پیسہ خرچ کروں گی۔“

”تم جو رقم لائی ہو۔ اسے سوچ سمجھ کر خرچ کرو۔ یہ پونجی ختم ہو گئی تو محتاجی کی زندگی نہیں گزار سکو گی۔“

وہ ہنس کر بولی۔ ”میں برسوں یہاں رہ کر شاہانہ زندگی گزار سکتی ہوں۔ میرے اکاؤنٹ میں ابھی پندرہ لاکھ روپے ہیں اور لاکھوں پچیس لاکھ کے پرائز بانڈ رکھے ہوئے ہیں۔ میں کسی وقت بھی لاہور جا کر بڑی رقم لاسکتی ہوں۔“

سرفراز کو جلانے کڑھانے اور پریشانیوں مبتلا کرنے کے لیے فون کا سلسلہ قائم کر رکھا تھا۔ اس بار بھی اس نے سرفراز کو بے چینی میں مبتلا کر کے فون بند کر دیا، پھر دروازہ کھول کر بشارت سے بولی۔ ”سوری، تمہیں انتظار کرنا پڑا۔ آجاؤ۔“

وہ کمرے میں آگیا۔ دو منٹ کے بعد ہی موبائل فون سنگٹل دینے لگا۔ کبھی رابطہ کیا تھا۔ شائستہ نے چونک کر فون کو دیکھا۔ بشارت نے پوچھا ”کیا باہر جاؤں؟“

”نہیں۔ میں سوچ رہی ہوں، یہ کون ہے جو مجھے کال کر رہا ہے؟“

”تمہارے گھر والے یا جان پہچان والے ہوں گے۔“

”صرف می پاپا اور شازیہ کو اس موبائل کا نمبر معلوم ہے لیکن وہ نہیں جانتے ہیں کہ ہم کراچی میں ہیں۔ میرا خیال ہے سرفراز نے آزمائش کے طور پر کراچی کا کوڈ استعمال کیا ہے۔“

”کیا یہ کال اٹینڈ کرو گی؟“

وہ جھنجھلا کر بولی۔ ”خواہ مخواہ نہ بولا کرو۔ کچھ سوچنے دیا کرو۔ وہ ذلیل، کم بخت اسی طریقہ کار سے مجھے تلاش کر رہا ہے۔“

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی فون کے قریب آئی۔ تھوڑی دیر تک اسے گھورتی رہی جیسے دشمن کو غرا کر دیکھ رہی ہو۔ پھر اس نے پاؤر سپلائی کے بٹن کو آف کر دیا۔ موبائل فون خاموش ہو گیا۔

وہ بستر کے سرے پر بیٹھ گئی۔ پھر بولی۔ ”وہ بہت چالاک، بہت مکار ہے۔ اس نے معلوم کر لیا ہے کہ ہم اس شہر میں ہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے بشارت کو دیکھا۔ وہ ٹی وی کینٹ سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ وہ بستر پر لیٹ کر بولی۔ ”مجھے یقین ہے کہ وہ ہماری تلاش میں آئے گا۔ اس نے بڑی آسانی سے میرا سراغ لگایا ہے۔ مجھ سے بھول ہو گئی۔ ان لوگوں سے باتیں کرنے کے بعد مجھے فوراً ہی فون کو آف کرنا چاہیے تھا۔“

اس نے پھر بشارت کو دیکھا۔ جھنجھلا کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”کیا میں پاگل ہوں۔ دیواروں سے بول رہی ہوں؟ جواب کیوں نہیں دے رہے ہو؟ کیا سانپ سو گئے گی؟“

”میری سمجھ میں نہیں آتا، مجھے کس وقت بولنا چاہیے۔ بولتا ہوں تو کہتی ہو، خواہ

”ہم وہاں جائیں گے تو دیکھ لے جائیں گے۔ کیا تمہارے والدین تمہارے بینک اکاؤنٹ کی کسی طرح نگرانی کر سکتے ہیں؟“

”وہ بے چارے بدنامی سے بہت ڈرتے ہیں۔ نہ ہمارے خلاف رپورٹ درج کرائیں گے اور نہ ہی میرا اکاؤنٹ ہولڈ اپ کرائیں گے۔ میں نے ایک بار بینک منیجر کو پچاس ہزار روپے قرض دیے تھے۔ وہ میرا احسان مند ہے۔ اس لیے میرے خلاف مئی وغیرہ سے تعاون نہیں کرے گا۔“

وہ بولتے بولتے رک گئی۔ پیار نے، پیار کی تکرار نے بولنے نہ دیا۔ پھر اس نے کہا۔ ”تم رقم اور علاج کی فکر نہ کرو۔ یہ بات دھیان میں رکھو کہ آج یا ایک برس بعد دشمن سے سامنا ہوگا۔ اسے یا ہمیں، کسی ایک کو تباہ ہونا ہے یا بالکل ہی فنا ہو جانا ہے۔“

”موت برحق ہے۔ دشمن سے پہلے یا دشمن کے بعد موت کو آنا ہی آتا ہے۔ پھر اسے کیا سوچیں؟ جتنی فرصت دے رہی ہے، آؤ ہم مل کر اتنی ہی محبتیں اور مسرتیں لوٹ لیں۔ کل کی کل دیکھی جائے گی۔“

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ زیرو پاور کا بلب دھیمے دھیمے مسکرا رہا تھا۔

یہ زیرو پاور کیا شے ہے؟

پاور یعنی قوت وہ ہوتی ہے، جو زندہ اور متحرک چیزوں میں پائی جاتی ہے۔

جو چیز زیرو ہو جائے، جو چیز صفر ہو جائے، وہ قوت سے خالی ہو جاتی ہے۔

عقل کہتی ہے، قوت کو زیرو نہ کہو۔ مگر ہم زیرو پاور کہتے ہیں۔

اس کمرے میں وہ زیرو پاور کا بلب انسانی تفریق پر روشنی ڈال رہا تھا اور سمجھا رہا

تھا کہ ہمارے ہاں کچھ لوگ زیرو ہوتے ہیں اور کچھ لوگ پاور ہوتے ہیں اور اپنی تھوڑی سی قوت کسی زیرو کو خیرات کرتے ہیں۔

وہ سلامت زیرو تھا، وہ رشیدہ پاور تھی۔

یہ بشارت زیرو ہے اور یہ شائستہ پاور ہے۔ یہ اتنی ہی پاور سلائی کرتی ہیں کہ وہ

صرف خواب گاہ میں روشن رہے۔ ورنہ خواب گاہ کے باہر کوئی سپر پاور اس زیرو پاور کو

قتل کر دے گی۔ اس لیے زیرو کو اپنی اوقات کے مطابق خواب گاہ میں ہی فیوزاڑنے تک

زندہ رہنا چاہیے۔

☆-----☆-----☆

سرفراز کاروبار کے سلسلے میں کراچی آتا رہتا تھا۔ بعض اوقات یہاں طویل قیام ہوتا تھا۔ اس لیے اس نے کلفٹن میں ایک لکڑی اپارٹمنٹ خرید لیا تھا۔ ایک ملازم اس اپارٹمنٹ کی دیکھ بھال کے لیے تھا۔ اس کے لیے کھانے بھی پکاتا تھا اور بازار سے ضرورت کا سامان بھی خرید کر لاتا تھا۔ سرفراز نے وہاں پہنچ کر مل کا کپڑا فروخت کرنے والے بیوپاریوں سے فون پر رابطہ کیا۔ ان سے کاروباری گفتگو کی۔ پھر ان سے دوسرے دن ملاقات کرنے کا وعدہ کیا۔ شام کو چائے پیتے وقت اس نے بریف کیس سے بشارت کی ایک تصویر نکالی۔ یہ تصویر اس نے گامے سے حاصل کی تھی۔ اس نے ملازم کو وہ تصویر دیتے ہوئے کہا۔ ”رمضانی! اس بندے کو دیکھو اور اس کی شکل اچھی طرح یاد رکھو۔“

رمضانی نے بشارت کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ کون ہے صاحب جی؟“

”اس کا نام بشارت ہے۔ یہ کراچی میں کہیں رہتا ہے۔ تمہیں کہیں بھی نظر آئے تو اس کا سامنا نہ کرو اور نہ ہی بات کرو بلکہ چھپ کر اس کا پیچھا کرو۔ معلوم کرو یہ کہاں رہتا ہے۔ کسی گاڑی میں ہو تو اس گاڑی کا نمبر نوٹ کرو۔ کسی رکشا ٹیکسی میں تعاقب کرو۔“

”جناب! یہ کس قسم کا بندہ ہے اور کام کیا کرتا ہے؟“

”مجھ سے کوئی سوال نہ کرو۔ اور نہ ہی کسی اور ذریعے سے معلوم کرو کہ میں اسے کیوں تلاش کر رہا ہوں۔ اگر تم نہایت رازداری سے اس کی لاعلمی میں اس کا پتا ٹھکانا معلوم کر لو گے تو میں تمہیں پانچ ہزار روپے انعام کے طور پر دوں گا۔“

”مہربانی ہے جناب! میں آج سے راستہ چلتے ہوئے ہر بندے کو غور سے دیکھتا رہوں گا۔ اگر یہ نظر آئے گا تو پھر میری نظروں سے چھپ نہیں سکے گا۔“

اس نے ملازم کو شائستہ کی تصویر نہیں دکھائی۔ اسے یہ اچھی طرح یاد تھا کہ رشیدہ گھر سے بھاگ کر لاہور گئی تھی تو خود کو چھپائے رکھنے کے لیے برقع پہنتی تھی۔ سرفراز کا خیال تھا کہ اس کی بیٹی شائستہ بھی یہی کرے گی۔ پھر یہ کہ دنیا والوں کی نظروں میں وہ ملک سرفراز خان کی بڑی بیٹی تھی۔ وہ اس رشتے کے حوالے سے بدنام نہیں ہونا چاہتا تھا۔ کسی کے سامنے شائستہ کا ذکر کرنا یوں بھی ضروری نہیں تھا۔ وہ صرف بشارت کو

ڈھونڈ لینے کے بعد آسانی سے شائستہ تک پہنچ سکتا تھا۔ وہ چائے پینے کے بعد اپنی کار میں باہر نکلا اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ صرف آرام کے وقت آرام کرے گا۔ اس کے بعد پیٹرول پھونکتا رہے گا اور سارے شہر میں گھومتا رہے گا۔ خواہ ہفتے اور مہینے گزر جائیں وہ دونوں کسی دن تو نظر آئیں گے۔

پتا نہیں وہ دن کب آنے والا تھا۔ وہ رات کے آٹھ بجے واپس آیا۔ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر بوتل اور گلاس لے کر بیٹھ گیا۔ وہ رات کو کھانے سے پہلے پینے کا عادی تھا کیونکہ پینے کے دوران کسی بھی مسئلہ پر ذہن مرکوز رہتا تھا۔ اس نے پہلا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے شائستہ کا تصور کیا۔ شراب ایک ایسی حرام شے ہے کہ اسے پیتے وقت کوئی بھی شخص بہن یا بیٹی کو تصور میں نہیں دیکھتا۔ مستی میں آکر پرانی عورت کی باتیں کرتا ہے۔ وہ پہلی بار شراب کا گھونٹ لے کر بیٹی کو تصور میں دیکھ رہا تھا۔ اگرچہ وہ سوتیلی تھی مگر بیٹی تھی۔ بیٹی تو تھی مگر دشمن تھی۔

آدھا گلاس خالی ہونے تک وہ اسے گھور کر دیکھ رہی تھی اور زیر لب کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ وہ ہاتھ نچا کر بولا۔ ”اے! کیا تم گالیاں دے رہی ہو؟ میں بہت سی گالیاں جانتا ہوں مگر دوں گا نہیں میں تم پر تھوکتا ہوں۔“

اس نے تھوک دیا۔ رمضان نے ایک طرف ہٹ کر کہا۔ ”صاحب! یہ میں ہوں“ آپ مجھ پر کیوں تھوک رہے ہیں۔“

”آں؟ تم ہو؟ وہ کہاں گئی؟“

”کون؟ یہاں تو کوئی نہیں تھی۔“

وہ حلق پھاڑ کر چیختے ہوئے بولا۔ ”تو جھوٹ بولتا ہے۔ وہ ابھی یہاں تھی۔ تو نے اسے چھپا دیا ہے۔ میں جس ملازم پر بھروسہ کرتا ہوں۔ وہ نمک حرام ہو جاتا ہے۔ میری دشمن کا وفادار بن جاتا ہے۔ وہ یہاں چھپ کر مجھ پر حملے کرے گی۔ میں یہاں نہیں رہوں گا۔ میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میں.....میں.....میں“

وہ چیخ رہا تھا۔ ادھر سے ادھر ڈگمگا رہا تھا۔ بوتل اور گلاس اس کے ہاتھوں سے ٹکرا کر گر رہے تھے۔ کرسی الٹ گئی تھی۔ پھر وہ الٹی ہوئی کرسی سے الجھ کر فرش پر آیا اور چاروں شانے پر چپ ہو گیا۔ رمضان اس کی ان حرکتوں پر حیران تھا۔ وہ ہمیشہ دیکھتا آیا تھا

کہ صاحب آدمی بوتل پی جانے کے بعد بھی نہیں بہکتا تھا۔ آج صرف آدھا گلاس یعنی چند گھونٹ پی کر ہی آپے سے باہر ہو گیا تھا۔

اس نے قریب آکر فرش کی طرف جھک کر اسے آواز دی۔ ”صاحب! صاحب جی!“

وہ بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ رمضان نے اس کا بازو پکڑ کر ہلایا۔ پھر سانس دیکھی، چل رہی تھی۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ رمضان کی سمجھ میں آیا کہ نشے نے اسے لڑھکا دیا ہے اور وہ مدہوش ہو گیا ہے۔ اب اسے بستر تک پہنچانے کا مسئلہ تھا۔ رمضان نے اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھانے کی کوشش کی لیکن صرف ہلا سکا کیونکہ صاحب موٹا تھا اور وہ دبلا پتلا سا تھا۔

اس نے صاحب کو چھوڑ دیا۔ کمرے میں گری ہوئی چیزوں کو اٹھا کر ان کی جگہ رکھنے لگا۔ گھر کی کوئی چیز گرے خواہ دیوار گرے، وہ دوبارہ اٹھالی جاتی ہے لیکن گھر کا مالک گرے تو اسے مقدر ہی اٹھاتا ہے۔ نہ اٹھائے تو خدا اٹھا لیتا ہے۔

رمضان ایک کمبل لا کر اس پر ڈال کر سوچنے لگا، صاحب کو کیا ہوا ہے؟ کیا بڑھاپے نے اتنا کمزور کر دیا ہے کہ شراب کے چند گھونٹ انہیں چاروں شانے چت کر دیتے ہیں یا انہیں کوئی بیماری لگ گئی ہے اور وہ بیماری کے باعث اس سیال آتش کو برداشت نہیں کپاتے ہیں۔“

مدہوشی میں سونے والے صبح سے پہلے آنکھ نہیں کھولتے۔ رمضان نے سوچا۔ آج جمعرات ہے۔ کلفشن کی زیارت گاہ میں میلہ ساگاہ ہوگا۔ وہاں سے گھوم کر آنا چاہیے ہو سکتا ہے اس میلے میں وہ مطلوبہ بشارت نظر آجائے۔ یہ سوچ کر وہ دروازہ بند کرتے ہوئے اپارٹمنٹ سے باہر چلا گیا۔

وہ تھافرش پر پڑا رہا۔ اس سے دو قدم کے فاصلے پر بیڈ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کمرے کے اندر رکھے ہوئے موبائل فون کا سنگل بول رہا تھا۔ سرفراز کو پکار رہا تھا شاید رشیدہ اسے لاہور سے بلا رہی ہوگی۔ اس کی خیریت معلوم کرنا چاہتی ہوگی۔ ادھر خیریت کی خبر دینے والا خیریت سے نہیں تھا۔ کچھ ہوش میں آ رہا تھا، کراہ رہا تھا اس کے دماغ میں عجیب طرح کی آوازیں گونجتے لگی تھیں۔ وہ پریشان ہو کر دائیں بائیں سر کو

جھٹک رہا تھا۔ لیکن وہ شور دماغ سے نہیں نکل رہا تھا۔

پھر اس نے بند آنکھوں کے پیچھے دیکھا، شائستہ پاگل خانے کی آہنی سلاخوں کے پیچھے اپنے بالوں کو نوچ رہی ہے، اپنے لباس کو تار تار کر رہی ہے اور چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے، میں پاگل نہیں ہوں۔ دنیا والو! یقین کرو میں پاگل نہیں ہوں۔

وہ آنکھیں بند کیے دائیں بائیں سرہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”میں پاگل نہیں ہوں۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں ملک سرفراز خان ہوں۔ پاگل نہیں ہوں۔ میں پاگل نہیں ہوں۔ میں پاگل.....“

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اپنے پارٹنٹ میں تھا، پاگل خانے میں نہیں تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ پنڈی کے ہوٹل اور اسپتال میں جیسے دماغی کمزوری غالب رہی تھی کچھ ایسی ہی کمزوری پھر محسوس کر رہا تھا۔ سر جیسے خالی خالی سا ہو گیا تھا۔ بشارت نے جو دوا پلائی تھی، اس کا اثر باقی تھا۔ وہ بظاہر نارمل ہو گیا تھا لیکن اندر گڑبڑ رہ گئی تھی۔

وہ سوچنے لگا۔ ”مجھے کیا ہو گیا تھا؟ میں یہاں فرش پر ہوں، مجھ پر یہ کبل ہے مگر میں تو میز کے پاس کرسی پر بیٹھا پی رہا تھا۔“

اسے یاد آیا کہ اس نے گلاس سے چند گھونٹ پئے تھے۔ پھر کچھ ہوش نہ رہا۔ خود پر کیا گزری اور وہ کیسی کیسی حرکتیں کرتا رہا، یہ یاد نہیں آ رہا تھا البتہ اس نے بند آنکھوں کے پیچھے شائستہ کو دیکھا۔ وہ پاگل خانے میں تھی پھر اچانک اس نے خود کو شائستہ کی جگہ پاگل خانے میں دیکھا تھا اور گھبرا کر اٹھ بیٹھا تھا۔

اس کی سمجھ میں یہی آ رہا تھا کہ اس ضرر رساں دوا کا اثر ابھی باقی ہے۔ ڈاکٹر شاہ زمان نے اسے اسی حد تک نارمل رکھا ہے لیکن اس شیطانی دوا کا توڑ نہیں ہو پایا ہے اور جب تک اس کا اثر بالکل ہی ختم نہیں ہو گا وہ ایب نارمل ہوتا رہے گا اس کے سر پر پاگل پن کا خطرہ منڈلاتا رہے گا۔

وہ کبل کو ایک طرف پھینک کر فرش سے اٹھ گیا۔ میز پر رکھی ہوئی شراب کی بوتل کو گھور کر دیکھنے لگا۔ اسے پیتے ہی اس کی حالت ابتر ہوئی تھی۔ شراب شر ہے، دماغ کمزور ہو تو اس میں جوش، دلولہ اور جنون پیدا کرتی ہے۔ کسی ایب نارمل کے لیے کہا جاتا

ہے کہ اسے غصہ نہ دلاؤ۔ اس کے مزاج کے خلاف اسے نہ بھڑکاؤ جبکہ شراب بھڑکاتی ہے۔ سرفراز کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ شراب کی گرمی اور شدت نے اس کی چھپی ہوئی دماغی کمزوری میں ابال پیدا کیا تھا لہذا اپنی بہتری اور سلامتی کی خاطر آئندہ شراب کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیے۔

رمضانی واپس آ گیا۔ سرفراز ڈانٹ کر پوچھنا چاہتا تھا کہ اسے فرش پر چھوڑ کر کہاں چلا گیا تھا۔ لیکن اس نے غصے کو روکا۔ عقل نے سمجھایا، غصہ کرے گا، دماغ گرم ہو گا تو پھر پاگلوں جیسی کوئی حرکت کر بیٹھے گا۔

رمضانی باہر جانے کی وجہ بتانا چاہتا تھا۔ سرفراز نے کہا۔ ”میں نے تم سے وضاحت طلب نہیں کی ہے۔ یہ بتاؤ میں نے پینا شروع کیا تو تم موجود تھے۔ تم نے کیا دیکھا؟ مجھے کیا ہوا تھا؟“

”جناب! آپ آدمی بوتل پی کر بھی نہیں بکسکتے لیکن آج دو چار گھونٹ کے بعد ہی کسی عورت کو مخاطب کر کے کہنے لگے کہ تم پر تھوکتا ہوں۔ یہ کہہ کر آپ نے مجھ پر تھوک دیا۔“

سرفراز نے سر جھکالیا۔ ایک ملازم کے سامنے تماشابن کر شرمندگی سی ہو رہی تھی۔ رمضانی بتا رہا تھا کہ وہ کس طرح جوش اور جنون میں گرج رہا تھا۔ میز پر رکھی ہوئی چیزیں گرا رہا تھا۔ پھر خود فرش پر گر کر بے ہوش ہو گیا تھا۔

وہ رمضانی سے منہ پھیر کر کرسی سے اٹھ گیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنی خواب گاہ میں آکر بستر کے سرے پر بیٹھ گیا۔ یہ خیال ستا رہا تھا کہ وہ واقعی نارمل نہیں رہا ہے اب اس پر پاگل پن کا دورہ پڑنے لگا ہے آئندہ پھر کسی وقت ایسا ہو گا اور وہ پھر تماشابنے گا۔

گھر کے اندر ایک ملازم کی موجودگی میں جو ہوا سو ہوا لیکن سرعام دورہ پڑے گا تو ثابت ہو جائے گا کہ وہ پاگل ہے۔ اس نے شائستہ کو پاگل خانے پہنچانا چاہا تھا اب وہ خود پاگل خانے کی راہ پر لگ گیا تھا۔ اس کے سامنے جو بچی کبھی دودھ پیتی تھی۔ اس نے بہت برا انتقام لیا تھا۔ باپ کے قاتل کو قتل کر دیتی تو فوراً ہی قصہ تمام ہو جاتا لیکن وہ اسے پاگل بنا کر زندہ رکھنا چاہتی تھی۔

وہ پریشان ہو کر نوچنے لگا۔ ابھی وقت ہے میں بچاؤ کی تدابیر کر سکتا ہوں۔ معروف

اور تجربہ کار ڈاکٹروں سے علاج کرا سکتا ہوں۔ یہ درست ہے کہ وہ شیطانی دوا میرے اندر جڑ پکڑ رہی ہے لیکن یہ لاعلاج کینسر نہیں ہے کہ میں مایوس ہو جاؤں۔

یہ خیال آیا کہ مسئلے علاج کے باوجود پاگل پن بڑھتا گیا اور وہ تماشا بن گیا تو کیا ہوگا؟ وہ کسی صورت میں تماشا بن کر پاگل خانے نہیں جانا چاہتا تھا۔ اب اسے ایسے قابل اعتماد ساتھی کی ضرورت تھی جو دورہ پڑتے ہی اسے سنبھالے اور اس کی ایب نارمل ہونے والی بات دنیا سے چھپائے۔ ایسی ساتھی صرف رشیدہ تھی، اس کی شریک حیات۔ وہ موبائل فون اٹھا کر رابطہ کرنے لگا۔ تھوڑی سی دیر میں رشیدہ کی آواز سنائی دی۔ وہ بولا۔ ”میں ہوں سرفراز، تم کیسی ہو؟“

”ٹھیک ہوں۔ کوئی آدھا گھنٹہ پہلے فون کیا تھا۔ تم نے انیڈ نہیں کیا، کیا فون کے پاس نہیں تھے؟“

”تھاکر ہوش میں نہیں تھا۔ میری دماغی حالت پھر تشویش ناک ہو گئی تھی۔“

”اللہ خیر۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ تمنا نہ جائیں۔ میں ابھی کسی فلائٹ سے آؤں گی۔“

”ہاں رشیدہ! میں صحت مند رہوں یا نہ رہوں، تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن تم آؤ گی تو وہاں بچے تمہارے ہیں گے۔ پھر تم بڑی حد تک کاروبار کی نگرانی کر لیتی ہو وہاں تم نہیں رہو گی تو.....“

وہ بولی۔ ”کاروبار آپ کی جان سے بڑھ کر نہیں ہے اور بچے ماشاء اللہ سمجھ دار ہیں۔ میں ابھی کوئی فلائٹ کفرم کر کے آپ کو فون کروں گی۔ ابھی کیسی طبیعت ہے؟“

”ابھی تک خیریت ہے۔ بس آجاؤ، دل گھبرا رہا ہے۔“

”میں اپنی جان کے پاس ابھی آتی ہوں۔ آپ نہ گھبرائیں۔ ابھی آدھے گھنٹے میں فون کروں گی۔“

رشیدہ نے رابطہ ختم کر کے اپنے خاص ٹریولنگ ایجنٹ کے نمبر ڈائل کیے اس سے کہا کہ کراچی کی کسی بھی پہلی فلائٹ میں اسے ایک سیٹ دلانے اور ابھی پندرہ منٹ کے اندر جواب دے۔ اس نے کہا۔ اتنی جلدی ممکن نہیں ہے۔ تین دن تک کسی فلائٹ میں جگہ نہیں مل سکے گی۔ اگر کسی مسافر نے سیٹ کینسل کرائی تو وہ چانس پر جاسکے گی۔

اس نے آدھے گھنٹے کے بعد سرفراز کو اطلاع دی کہ وہ صبح پانچ بجے کی فلائٹ میں چانس لے گی۔ مقدار سے سیٹ مل گئی تو آجائے گی۔ ورنہ ہر دوسری فلائٹ میں چانس لیتی رہے گی۔ وہ معصم ارادہ کر چکی تھی کہ صبح چار بجے سے ان پورٹ جا کر بیٹھ جائے گی۔ صبح سے رات تک وہاں رہے گی کسی نہ کسی فلائٹ میں ضرور جگہ ملے گی۔

یہ نئی افتاد آپڑی تھی۔ وہ بیٹی کو پاگل سمجھ رہی تھی۔ اب شوہر پر پاگل پن کے دورے پڑ رہے تھے اسے اپنی دنیا تاریک ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ اگر سرفراز کا دماغ الٹ جاتا تو کروڑوں کے کاروبار کو وہ تنہا سنبھال نہ پاتی۔ بیٹا بھی اس قابل نہیں ہوا تھا۔ پھر یہ بھی اندیشہ تھا کہ پاگل پن کا دورہ جان لیوا ہو سکتا ہے۔ ایسا ہوا تو کیا وہ پھر ایک بار بیوہ ہو جائے گی؟

وہ ایسے جاں گدازا لیے کے خیال سے ہی کانپ گئی۔ جس نے اس کے شوہر کو قتل کر کے اسے بیوہ بنایا تھا، اسی نے اسے اپنی سہاگن بنالیا تھا۔ پہلے شوہر کو قتل کرنے والا ابتدا میں ناپسندیدہ تھا پھر وہ دوبارہ سہاگن بن کر اسے پسند کرنے لگی تھی۔ اب تو پچیس برس گزر چکے تھے وہ اس کی ایک بیٹی اور ایک بیٹے کو جنم دے چکی تھی۔ وہ شوہر کی حیثیت سے اور ایک کامیاب کاروباری کی حیثیت سے اس کی زندگی میں گہرا اثر کیا تھا۔ اب وہ دوبارہ بیوہ ہونے کے خیال سے ہی کانپ جاتی تھی اور دل ہی دل میں اس کی درازی عمر کی دعائیں مانگنے لگتی تھی۔

یہ دعائیں اس وقت مانگتی تھی جب کبھی وہ بیمار پڑتا تھا۔ دعائیں تو ایسے ہی وقت یاد آتی ہیں لیکن اس بار بیماری مختلف تھی، آکر جانے والی نہیں لگتی تھی۔ ڈرا رہی تھی، سہا رہی تھی کہ اگر وہ بیوہ نہ بھی ہوئی تو نصف بیوہ ضرور ہوگی۔ شوہر گھر میں نہیں پاگل خانے میں رہے گا۔

دل نے کہا، نماز پڑھ کر شوہر کی جسمانی اور دماغی صحت مندی کے لیے دعا مانگنا چاہیے۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا، رات کے بارہ بجنے والے تھے اسے یاد نہیں تھا کہ رات کے بارہ بجے عشاء کی نماز پڑھی جاسکتی ہے یا نہیں؟ پہلے شوہر کے قتل ہونے کا تماشا دیکھنے کے بعد وہ کچھ عرصہ تک نمازیں پڑھتی رہی تھی اور اللہ میاں کو یقین دلاتی رہی تھی کہ قتل میں اس کا ہاتھ نہیں تھا، وہ صرف خاموش تماشا بنی تھی۔ اس نے قتل کرنے کو

نہیں کہا تھا اور قتل کرنے سے منع بھی نہیں کیا تھا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ وہ اللہ میاں کے سامنے صفائی پیش کر چکی ہے تو اس نے رفتہ رفتہ ایک وقت کی نماز چھوڑتے چھوڑتے بالکل ہی چھوڑ دی۔ اس کے بعد زندگی کی مصروفیات نے موقع نہیں دیا اور نہ ہی ایسی آفت آئی کہ نماز ضروری ہوتی۔

اب پچیس برس کے بعد نماز پڑھنے کا خیال آیا تو یہ یاد نہیں رہا کہ عشاء کی نماز میں کتنی رکعتیں ہوتی ہیں۔ اپنے علاقے میں مسجد کی تعمیر کے لیے ایک لاکھ روپے کا عطیہ دے کر پورا خاندان مطمئن ہو گیا تھا کہ بہت بڑا ثواب کمایا ہے۔ اس مسجد میں نماز پڑھنے والے پیدا کر دیے ہیں۔ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد کوٹھی میں نماز کے طریقے بتانے والا کتابچہ بھی نہیں تھا۔ ہوتا تو رشیدہ اس سے استفادہ کرتی۔ میاں بیوی اور بچوں نے یقین کر لیا تھا کہ انہیں کوئی مسئلہ حل کرنے کے لیے نماز کی نہیں حکمت عملی کی ضرورت ہوتی ہے۔ دکھ بیماری میں خدا کو نہیں صرف ڈاکٹر کو پکارنے سے بلا ٹل جاتی ہے۔

اس بار ایسی بلا نازل ہوئی تھی کہ ڈاکٹر شاہ زمان سے نہ ٹل سکی۔ شوہر پر دوسری بار دورہ پڑا تھا۔ ایک خوف سا تھا کہ دوسرے ڈاکٹروں کی کوششوں سے بھی وہ نازل نہ رہا تو کیا ہو گا؟ ہونا کیا ہے، دوا کے ساتھ دعا ہونی چاہیے۔ اس مادی دنیا میں معجزے بھی ہوتے ہیں اور وہ زمینوں اور آسمانوں والا معجزے دکھاتا ہے۔ ہاں، معجزے دکھاتا ہے۔ ہیلو! کون ڈاکٹر؟ نہیں، ڈاکٹر نہیں، اللہ میاں کے لیے کال ہے۔ ہیلو اللہ میاں! میں ہوں آپ کی گناہ گار بندی رشیدہ.....

وہ جائے نماز بچھا کر دو زانو ہو گئی۔ رکعتیں یاد نہیں ہیں تو کیا ہوا؟ نماز نہیں آتی تو کیا ہوا؟ سجدہ کرنا تو آتا ہے۔ وہ سجدے میں گر پڑی۔ توبہ توبہ! یا اللہ! توبہ توبہ۔ میرے مالک! توبہ توبہ.....

یا اللہ میں نے جان بوجھ کر کبھی کوئی گناہ نہیں کیا۔ اگر کوئی گناہ سرزد ہوا ہو تو معافی چاہتی ہوں۔

اکثر لوگوں کا دعویٰ ہوتا ہے کہ انہوں نے کبھی گناہ نہیں کیا۔ وہ دعا مانگنے کے دوران رسمی طور پر اللہ تعالیٰ سے کہتے ہیں کہ کوئی گناہ ہوا ہو تو معاف کر دیا جائے۔ گناہ بڑا ہو یا چھوٹے سے چھوٹا ہوا، ہر ایک سے سرزد ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے

کہ اپنے گناہ یاد نہیں رہتے۔ دوسروں کے یاد رہتے ہیں۔

رشیدہ نے پہلے ہی صفائی پیش کر دی تھی کہ اس کے پہلے شوہر کے قتل میں اس کا ہاتھ نہیں تھا۔ اس کے ذہن نے یہ نہیں سمجھایا کہ اس کی خاموشی کا ہاتھ تھا۔ اگر وہ خاموش نہ رہتی۔ سچے عشق میں اڑ جاتی۔ اپنے عاشق کے لیے لڑ جاتی تو اس کا باپ ملک جان محمد..... بدنامی کے خوف سے سرفراز کو قتل سے باز رکھتا۔ کوئی گالی صرف زبان سے ادا نہیں ہوتی، کبھی خاموشی بھی تمام عمر کی گالی بن جاتی ہے۔

رشیدہ کا دعویٰ تھا کہ اس نے جان بوجھ کر کبھی گناہ نہیں کیا۔ جبکہ اسی نے پہلی بار ڈرائیور سلامت کو گناہ کی ترغیب دی تھی۔ اور اس خوف خدا رکھنے والے بندے نے نکاح سے پہلے اسے تنہائی میں قبول نہیں کیا تھا۔

دراصل اپنے گناہوں کو یاد رکھنے کے لیے شرفیقاہ حافظہ اور گناہوں کا اعتراف کرنے کے لیے ایمانی جذبے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن یہ جذبے ضروری نہیں سمجھے جاتے کیونکہ توبہ کرنے سے دل کو اطمینان ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے توبہ کے دروازے کھلے رکھے ہیں۔ گناہ معاف ہو جائیں گے اور بلاؤں سے نجات مل جائے گی۔ کیسے مل جائے گی؟ توبہ تو اللہ تعالیٰ سے ایک وعدہ ہے کہ توبہ کرنے والا گناہوں سے پھر رہا ہے اور نیکی کی طرف آرہا ہے لہذا پچھلے تمام گناہ معاف ہوں۔ بے شک وہ غفور الرحیم معاف کرتا ہے۔

لیکن منافقت ناقابل معافی ہوتی ہے۔ یہ کہنا کہ کوئی گناہ اگر ہوا ہو تو توبہ قبول کی جائے۔ وہ توبہ کبھی قبول نہیں ہوتی۔

وہ سجدے میں تھی۔ صبح چار بجے ایئر پورٹ جانا تھا فکر اور پریشانی سے نیند نہیں آسکتی تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو ویڈیو فلمیں دیکھ کر چار گھنٹے گزار دیتی۔ حالات کا تقاضا تھا، اللہ اللہ کرے، اس لیے توبہ توبہ کر رہی تھی۔

☆=====☆=====☆

شائستہ اور بشارت دوسرے دن بہت مصروف رہے۔ امراض چشم کے ایک ماہر کے پاس گئی پھر اس ڈاکٹر کے حوالے سے آئی بینک پہنچے۔ وہاں نئی آنکھیں حاصل کرنے کے لیے بشارت کا نام درج کرایا۔ شائستہ نے دس ہزار روپے کا عطیہ دیا اور کہا جس دن

بشارت کو نئی بینائی دینے کے لیے بلایا جائے گا اس دن وہ پچاس ہزار روپے عطیے کے طور پر دے گی۔

واپسی میں شام ہو گئی۔ وہ ناگواری سے بولی۔ ”میں تھک گئی ہوں۔ مجھے رکشے ٹیکسی میں بیٹھنے کی عادت نہیں ہے۔ میرے لیے ذاتی کار ضروری ہے۔“

”اس کے لیے کافی رقم کی ضرورت ہوگی۔ سوزو کی کار کی کم سے کم قیمت ڈھائی لاکھ روپے ہے اور تم سوزو کی میں بیٹھنا پسند نہیں کرو گی۔“

”حالات کے پیش نظر وہ سوزو کی کسی بھی ٹیکسی سے بہتر ہوگی۔ پھر یہ کہ تین چار لاکھ میں بہت کم چلی ہوئی اچھی کنڈیشن کی کار مل جائے گی۔“

”کیا اتنی رقم کے لیے زیورات بیچنا چاہو گی؟“

”زیورات میں بڑے قیمتی ہیرے موتی جڑے ہیں۔ مجھے بہت پسند ہیں اگر میں زیورات کی جگہ پر انز بانڈ لاتی تو وہ فوراً ہی کیش ہو جاتے۔ مجھے لاہور جانا چاہیے تمہارا کیا خیال ہے؟“

”تم کار کے بغیر نہیں رہو گی۔ میں تمہاری خوشی میں خوش ہوں۔ بس ذرا ڈر لگتا ہے اگر وہاں ہم دیکھ لیے گئے تو.....“

”ہم نہیں صرف میں جاؤں گی۔ اگر دیکھ لی گئی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا سرفراز یہاں ہو گا۔ وہاں مئی مجھے زنجیریں نہیں پہنا سکیں گی۔ میں ایک دو دن میں واپس آ جاؤں گی۔“

وہ دونوں بنگ آفس میں پہنچے۔ شائستہ نے دوسرے دن کار میٹن ٹکٹ لیا۔ پھر وہ ایک ریسٹوران میں گئے۔ شائستہ..... کھانے کا آرڈر دیا۔ بشارت نے کہا۔ ”ہم کب تک ہوٹلوں کا کھانا کھاتے رہیں گے؟“

وہ بولی۔ ”گھر کھانے کے لیے کوئی باورچی رکھنا ہو گا۔“

”میں بہترین کھانے پکاتا ہوں۔ میرے ہاتھ کا کھاؤ گی تو انگلیاں چانتی رہ جاؤ گی۔“

”کمال ہے ذرا نیور بھی ہو اور باورچی بھی۔ ویسے یہ اچھا نہیں لگے گا کہ تم کھانے

پکاؤ۔“

”مرج کیا ہے؟“

”اب تم ملازم نہیں ہو میرے جسم و جان کے مالک ہو۔“

”یہ کوئی دیکھنے نہیں آئے گا کہ میں کچن میں کام کر رہا ہوں۔ آج میں نے پوری کوٹھی کی صفائی کی۔ باہر والوں کو تو کیا تمہیں بھی خبر نہیں ہوئی۔“

”ذاتی کوٹھی صاف ستھری تھی۔ ہر چیز اپنی جگہ سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ تعجب ہے تم نے کب صفائی کی تھی۔“

”میں صبح پانچ بجے بیدار ہونے کا عادی ہوں اور تم دن کے نو بجے تک سوتی رہیں۔ تمہارے جاگنے تک میں سارا کام کر چکا تھا۔“

ویٹر کھانے کی پلیٹیں لا کر رکھنے لگا۔ بشارت نے گھر کا سارا کام نمٹا کر ذمہ داری یا جو رو کی غلامی کا ثبوت پیش کیا تھا۔ شائستہ نے ناگواری سے سوچا۔ ”شوہر کوئی اونچے خاندان کا ہوتا تو اس کے مردانہ تیور کیا خوب ہوتے۔ ایک ملازم کو اپنا تمام حسن و شباب سوپ دو پھر بھی اس میں شوہریت پیدا نہیں ہوتی وہ ملازم ہی رہتا ہے۔“

”وہ کھانے کے دوران خاموش رہی۔ وہ بولتا رہا اور یہ ہوں ہاں کہہ کر سوچتی رہی۔“

”میں نے انتقام لینے کے جنون میں ایسے شخص کا سہارا لیا ہے جو میرے ساتھ کھانے کی میز پر بھی نہیں بچتا ہے بس گھر کی چار دیواری میں ہی زبردست لگتا ہے۔ اب ذاتی تجربات سے سمجھ آ رہی ہے کہ مئی نے بھی میرے ابو کو اپنے معیار کے مطابق نہ پا کر ان سے اپنا دامن چھڑایا تھا۔ یہ سچ ہے کسی کمتر کو ساری زندگی کے لیے سرتاج نہیں بنایا جاسکتا۔ اس سے صرف پارٹ ٹائم عشق کیا جاسکتا ہے۔“

وہ دوسرے دن لاہور آ گئی۔ ایک مہنگے ہوٹل میں قیام کیا۔ ایک رات گزارنے کے بعد دوسری صبح بینک میں آئی۔ فیجر نے کرسی سے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔ اسے بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کی۔ وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”کیسے ہیں آپ؟“

وہ انکساری سے بولا۔ ”بس جی! آپ کی مہربانی ہے۔ وہ جو میں نے آپ سے قرض لیا ہے سوچتا ہوں قسطوں میں ادا کر دوں۔“

وہ بولی۔ ”میں نے آپ سے رقم کا تقاضا نہیں کیا ہے اور نہ ہی کروں گی۔ آپ میرا کام کریں۔ یہ بارہ لاکھ کا چیک ہے۔ اسے کیش کر ادیں اور میرے ساتھ چل کر لا کر کھولیں۔“

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ اپنے ماتحت کو چیک کیش کرنے کے لیے دیا۔ پھر اس کے ساتھ جاکر لاکر کو کھولا۔ شائستہ نے پندرہ لاکھ کے پرائز بانڈ نکال کر ہینڈ بیگ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا یہ بانڈ ابھی کیش ہو سکتے ہیں؟“

”اس بینک میں نہیں ہو سکیں گے لیکن میں ایک ڈیلر کو جانتا ہوں اس کے ذریعے فوراً رقم مل جائے گی۔“

”آپ اس ڈیلر کو ہوٹل کے کمرے میں بھیج دیں۔ وہ پندرہ لاکھ کیش لائے اور بانڈ لے جائے۔ اسے تاکید کر دیں کہ میرے کمرے میں صرف وہی آئے اپنے کسی ساتھی کو نہ لائے۔“

وہ چیک کیش کرانے کے بعد ہوٹل کے کمرے میں آگئی۔ ٹی وی آن کر کے صوفے پر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر تک میوزیکل پروگرام دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ اب کیا کرنا ہے۔ اس نے بشارت سے کہا تھا کہ ٹھیک دو بجے دوپہر کو فون کرے گی۔ ابھی بارہ بجے تھے اس نے فون پر لنچ کا آرڈر دیا۔ پھر اپنی می کے فون سے رابطہ کیا۔ رابطہ قائم ہوتے ہی شازیہ کی آواز آئی۔ ”ہیلو میں بول رہی ہوں۔“

شائستہ نے کہا۔ ”میں بھی بول رہی ہوں۔“

چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ پھر آواز آئی۔ ”آپ! آپ! کیا واقعی یہ آپ ہیں؟“

”ہاں! کیا تم میری بہن نہیں ہو؟ کیا میں تمہیں یاد نہیں کر سکتی؟“

”اوہ آپ! میں بیان نہیں کر سکتی کہ آپ کی آواز سن کر کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ آپ کہاں ہیں؟ ہم سے دور کیوں ہیں؟ آپ کو پتا ہے، پیلا کتنے بیمار ہو گئے تھے؟“

”پتا ہے، می نے فون پر بتایا تھا۔ بالی دی وے، می کہاں ہیں؟“

”وہ کراچی گئی ہیں وہاں پیلا کی طبیعت پھر خراب ہو گئی تھی۔“

”مجھے می اور پیلا کا پتا دو۔ میں ان سے ملاقات کروں گی۔“

”کیا آپ کراچی میں ہیں؟“

”ہاں! مجھے بتاؤ! ان کی رہائش کہاں ہے؟“

”کلنٹن میں حضرت عبداللہ غازی کے مزار شریف کے پیچھے لگڑی اپارٹمنٹس ہیں۔ ان کے اپارٹمنٹ کا نمبر دن اے ہے۔ می اور پیلا ابھی فون کرنے والے ہیں۔ میں

انتظار کر رہی ہوں۔ انہیں بتاؤں گی کہ آپ ان سے ملنے آ رہی ہیں۔“

”ہاں! ان سے یہ بھی کہنا کہ میں ان سے دور ہو کر پچھتا رہی ہوں۔ اگر آج نہ آ سکی تو کل ان سے معافی مانگنے ضرور آؤں گی۔ میرا زہر بھیا کیسا ہے؟“

”وہ مل میں ہے۔ پیلا کی کچھ ذمے داریاں سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”چلو اچھا ہے، ہمارے بھائی کو اس قابل ہونا چاہیے۔ شازیہ میں تمہیں مس کر رہی ہوں۔ جلد ہی تمہارے پاس آؤں گی۔“

”میں بھی آپ کو بہت مس کر رہی ہوں۔ آپ آئیں گی تو میں جشن مناؤں گی۔“

دونوں بہنیں فون پر پیار سے رخصت ہوئیں پھر رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ دل کی گھرائیوں سے شازیہ کے لیے پیار محسوس کر رہی تھی۔ وہ سوتیلی تھیں تو کیا ہوا! ایک ماں کی بیٹیاں تھیں۔ وہ بہن دشمن نہیں تھی۔ عداوت اس کے باپ سے تھی۔

اور ابھی شازیہ نے بتایا تھا کہ سرفراز کراچی پہنچ کر پھر بیمار ہو گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ دوا کچھ زیادہ ہی ضرر رساں تھی۔ اگر وہ اپنی چال میں کامیاب ہو جاتا اور اسے یہ دوا پلا دیتا تو وہ ابھی پاگل خانے میں ہوتی۔ یہ سوچ کر اسے سرفراز سے نفرت اور عداوت اور بڑھ گئی تھی۔ وہ قسمیں کھا رہی تھی کہ اسے پاگل خانے پہنچا کر ہی دم لے گی۔

اس نے لنچ کے بعد بشارت سے رابطہ کیا۔ وہ بولا۔ ”ہیلو! تم نے دوپہر کو فون کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں صبح ہی سے فون کے پاس بیٹھا ہوں۔ اس سے میری محبت کا اندازہ کر سکتی ہو۔“

وہ دل میں بولی۔ ”محبت کا نہیں تابعداری کا یہ انداز ہے۔“

پھر اس نے کہا۔ ”میرا بینک کا کام ہو گیا ہے لیکن ٹکٹ کل کا کنفرم ہے۔ میں آج ہی کسی فلائٹ سے آنے کی کوشش کروں گی۔ دو گھنٹے بعد اپنی آمد کے متعلق بتاؤں گی۔“

اس نے ریسپورر رکھ دیا۔ ادھر سے بشارت نے آواز دی۔ ”ہیلو شائی! ہیلو ہیلو۔“

کوئی جواب نہیں ملا۔ موبائل فون کو آف کرتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”کیا شہزاد یوں جیسا مزاج ہے۔ نہ خدا حافظ! نہ گڈ بائی اور فون بند کر دیا۔ وہ عشق کرنے کے لیے نہیں! حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔“

وہ پچھلے دن سے اب تک چار دیواری میں تھا۔ باہر جاتے وقت خیال آتا تھا کہ شائستہ کا فون نہ آجائے۔ اگر وہ موبائل ساتھ لے جاتا اور باہر کیس ٹریفک کے شور میں اس سے باتیں کرتا تو وہ سوال کرتی، گھر چھوڑ کر کہاں گھوم رہے ہو؟ وہ گھر میں رہنے کی تاکید کر گئی تھی۔

اسے اچھا نہیں لگتا تھا کہ بیوی کی طرح گھر میں رہے اور شائستہ باہر جا کر بھی شوہر کی طرح احکامات کی تعمیل کراتی رہے۔ زندگی میں بہت سی باتیں، بہت سی چیزیں اچھی نہیں لگتیں، ناگوار گزرتی ہیں، بے غیرتی کا احساس ہوتا ہے لیکن اپنی منزل تک شارٹ کٹ راستہ اختیار کرنے کے لیے آدمی اپنی پسند سے منہ موڑ کر اور غیرت کو مار کر بے غیرتی کی سیڑھی پر پاؤں رکھتا ہے اور اوپر پہنچتا ہے۔

آج اس نے ماں باپ کو خط لکھا تھا کہ وہ اوپر پہنچنے والا ہے۔ جلد ہی ان کے لیے لکھ جتی ہو لائے گا۔ سو کے پاس اتنی دولت ہے کہ اتنی دولت رکھنے کے لیے پنڈ والا مکان چھوٹا پڑے گا۔ اس لیے کوئی شبہ گھڑی دیکھ کر ماں باپ کو شہر بلا لے گا۔

اس نے ارادہ کیا تھا کہ صبح پوسٹ آفس جا کر خط ڈالے گا اور پانچ ہزار روپے منی آرڈر کے ذریعے بھیج دے گا۔ سارے پنڈ میں چرچا ہو گا کہ بشارت پاکستان میں رہ کر دینی والوں کی طرح کما رہا ہے۔ چودھری کی حویلی میں بھی اس کا ذکر ہو گا اور پنڈ کے بڑے بوڑھے مکے ماما کو احق کہیں گے، جس نے پنڈ کے سوہنے منڈے کو داماد بنانے سے انکار کیا تھا۔

وہ صبح پوسٹ آفس نہ جاسکا۔ دوپہر کو شائستہ نے کہہ دیا کہ وہ پھر دو گھنٹے بعد رابطہ کرے گی اور وہ آج ہی خط اور منی آرڈر کی رقم ارسال کرنے کے لیے بے چین ہو گیا تھا کیونکہ شائستہ کے آنے کے بعد اسے اپنے کام کی فرصت نہ ملتی۔ دن رات اسی کی خدمت میں لگے رہنا پڑتا۔ اس نے سوچا، موبائل فون ساتھ لے جانا چاہیے وہ کیس بھی ہو گا تو کال اینڈ کر لے گا۔ یوں باہر جانے سے ناراض ہوگی تو اسے منالے گا۔ یہ سوچ کر اس نے فون اٹھایا۔ گھر کے تمام دروازے لاک کئے۔ پھر مین روڈ پر آکر ایک ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ اخراجات کی پروا نہیں تھی وہ لاہور سے تقریباً پچیس ہزار روپے لایا تھا۔ یہ روپے کبھی شازیہ نے اور کبھی سرفراز نے رشوت کے طور پر دے کر اس سے کام نکالنا

چاہا تھا۔ پھر شائستہ نے بھی لاہور جانے سے پہلے اسے پانچ ہزار دیے تھے۔ وہ پہلی ٹیکسی میں بیٹھ کر صدر گیا۔ رکشایا بس میں بھی جاسکتا تھا یا کالی ٹیکسی کا میٹر تین روپے سے شروع ہوتا ہے اس میں بھی جاسکتا تھا لیکن شائستہ کے ساتھ رہ کر اسے بھی رکشا، ٹیکسی کی سواری ناگوار گزرنے لگی تھی لہذا کچھ مختلف لگنے کے لیے پہلی ٹیکسی میں بیٹھا۔ یہ ٹیکسی قدرے مہنگی پڑتی ہے اس کا میٹر پانچ روپے سے شروع ہوتا ہے اور آرکنڈیشنڈ پہلی ٹیکسی سات روپے سے اشارٹ لیتی ہے۔ اس میں بیٹھنے کی شان ہی نرالی ہوتی ہے۔ چھوٹی ذات کا بندہ بھی ڈا سائیں لگتا ہے۔

اس نے خط پوسٹ کیا۔ رقم منی آرڈر کی۔ پھر اسی گاڑی میں بیٹھ کر بندو خان کے ہوٹل میں آیا۔ خوب سیر ہو کر کباب پراٹھے کھائے۔ ٹھنڈی بوتل پی۔ پھر ڈرائیور سے کہا۔ ”گلشن واپس چلو۔“

واپسی پر گاڑی رک رک کر چل رہی تھی۔ کشادہ شاہراہ پر حد نظر تک گاڑیاں ہی گاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ حکومت یہ اچھا کر رہی ہے کہ بے روزگاری دور کرنے کے لیے پہلی ٹیکسیاں، بمیں اور منی بمیں قرضے پر اور آسان اقساط پر دے رہی ہے لیکن ہزاروں گاڑیوں کے اضافے سے شاہراہیں چھوٹی پڑ گئی ہیں۔ موٹر سائیکل والے فٹ پاتھ پر سے دندناتے ہوئے گزرتے ہیں۔ ایک گاڑی دوسری گاڑی پر چڑھ دوڑتی ہے۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں میاں بیوی دس بچے پیدا کریں اور کمراد وسیع نہ کریں تو بچوں کو اس محدود چار دیواری میں چلنے پھرنے اور سونے کی جگہ نہیں ملے گی۔ انسانی آبادی کے لیے یہ دنیا چھوٹی پڑنے لگی ہے۔ اس لیے خاندانی منصوبہ بندی کا سبق پڑھایا جا رہا ہے۔ بے روزگاری کی اسکیم تیار کرتے وقت حکومت کو بھی سڑکوں کی تنگی مد نظر رکھ کر گاڑیوں کی منصوبہ بندی کا سبق پڑھنا چاہیے تھا۔

گر و مندر چورنگی کے پاس پہلی ٹیکسی رک گئی۔ چاروں طرف سے آنے جانے والی گاڑیاں آڑی ترچھی ہو کر ایک دوسرے کا راستہ روک چکی تھیں۔ بشارت نے بے زار ہو کر ایک کھڑکی سے باہر دیکھا تو ایک دم سے ہوش اڑ گئے۔ دوسری طرف سے برابر والی ایک کار بالکل نگاہوں کے سامنے تھی۔ اس کار کی پچھلی سیٹ پر صاحب اور بیگم صاحبہ دکھائی دیے۔ اسی وقت سرفراز نے بھی سرگما کر کھڑکی سے باہر دیکھا تو بشارت سے

نظریں نکرائیں۔ گاڑیاں کیا نکرائیں گی جیسے دو دشمنوں کی نظریں نکرائی تھیں۔ ان میں سے ایک وہ تھاجو شائستہ کو پاگل بنانا چاہتا تھا اور دوسرا وہ تھاجو دوا کے چند قطرے اسے پلا کر پنڈی سے بھاگ کر کراچی آیا تھا۔

اگر مردانہ وار مقابلے کی بات ہوتی تو بشارت، سرفراز کی ہڈیاں پسلیاں توڑ سکتا تھا لیکن وہاں تو قانونی گرفت میں آنے کا اندیشہ تھا۔ صاحب اور بیگم صاحبہ کا یہی بیان ہوتا کہ وہ ان کی بیٹی کو بھگا کر لے آیا ہے یا کوٹھی سے بھاری رقم چرا کر بھاگ آیا ہے۔ اب اس کی خیریت اسی میں تھی کہ وہ سرفراز کی گرفت میں آنے یا اس کے شور مچانے سے پہلے ٹیکسی سے نکل کر بھاگ جائے۔

وہ پچھلی سیٹ پر سے کھسکتا ہوا دوسرے دروازے کی طرف آیا لیکن وہ دروازہ کھل نہیں سکتا تھا۔ ایک دیگن کار دو تین انچ کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ پہلی ٹیکسی کے دائیں بائیں آگے پیچھے گاڑیوں نے ایسا محاصرہ کیا تھا کہ کھڑکی سے نکل بھاگنے کی بھی گنجائش نہیں رہی تھی۔ ایسا وقت آپڑے تو پتا چلتا ہے، مصیبت آتی ہے تو چاروں طرف سے آتی ہے پھر نہ دولت سے، نہ طاقت سے اور نہ ذہانت سے کام لے کر نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔ قدرتی گرفت بے شک مضبوط ہوتی ہے۔

پھر سائڈ والی دیگن کار ذرا آگے بڑھی تو دروازہ کھول کر باہر نکلنے کی گنجائش ہو گئی۔ اس نے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ لیکن یہ حالات سکھاتے ہیں کہ فرار کا راستہ مل جائے پھر بھی فرار ممکن نہیں ہوتا۔ اس نے جیسے ہی ہاتھ بڑھایا، دروازہ غائب ہو گیا۔

ہاں، دروازہ غائب ہوا۔ ٹیکسی غائب ہوئی، آنکھوں کی روشنی بجھتے ہی ساری دنیا غائب ہو گئی۔ آہ! وہ آنکھیں کیسے نازک لمحات میں دعا دے رہی تھیں۔ آدمی کس پر بھروسہ کرے؟ اپنے ساتھ پیدا ہونے والی چیزیں بھی دھوکا دے جاتی ہیں۔

”اے پروردگار! تھوڑی سی دیر کے لیے تھوڑی سی بینائی دے دے۔ بس اتنی سی دیر کے لیے کہ میں یہاں سے بھاگ کر کہیں چھپ جاؤں اور یہ سرفراز مجھے ڈھونڈ نہ سکے۔“

اسے گہری تاریکی میں سرفراز کا قہقہہ سنائی دیا۔ شیطان جب انسان کی گردن پکڑنے

آتا ہے تو ایسے ہی قہقہے لگاتا ہے۔ اس نے محسوس کیا ٹیکسی آگے بڑھ رہی تھی گاڑیوں کو گزرنے کا راستہ مل رہا تھا۔ کھڑکی سے آنے والی ٹھنڈی ہواؤں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ گاڑیوں کی دلدل سے نکل آیا ہے اور سرفراز کی کار بھی نکل آئی ہوگی لیکن اس کا ڈرائیور آگے آکر راستہ نہیں روک رہا تھا اور نہ ہی وہ اور رشیدہ اسے رکنے کے لیے آوازیں دے رہے تھے۔ ایسے میں ایک ہی بات سمجھ میں آرہی تھی کہ دشمن اس کا تعاقب کر رہا ہے اور وہ جگہ دیکھنا چاہتا ہے، جہاں وہ شائستہ کے ساتھ رہ رہا ہے۔ وہ دونوں یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ پیچھا کرتے ہوئے گھرتک پہنچیں گے تو انہیں بیٹی مل جائے گی۔

دانش مندی یہی تھی کہ وہ گھر نہ جاتا۔ یوں بھی وہ اندھی آنکھوں سے ٹیکسی ڈرائیور کو گھر کا راستہ نہیں بتا سکتا تھا۔ اگر وہ ڈرائیور کو گلی کا نام اور مکان کا نمبر بتاتا اور ڈرائیور غلطی سے کسی دوسری گلی کے مکان کے سامنے اتار دیتا تو وہ بھٹکتا ہی رہ جاتا۔ ڈرائیور حیران ہوتا کہ ٹیکسی میں آنکھوں والا آکر بیٹھا تھا مگر اتر رہا ہے ہے اندھا۔

اس نے ڈرائیور سے کہا۔ ”ڈرائیور ان سینما چلو۔ میں وہاں تھوڑا بہت وقت گزارنا چاہتا ہوں۔“

ڈرائیور کو نصیب سے اچھی سواری ملی تھی۔ ویٹنگ چارجر کے ساتھ میٹر لمبی رقم بنا رہا تھا۔ بشارت کو یقین تھا کہ پہلے کی طرح پھر بینائی لوٹ آئے گی لہذا روٹھی ہوئی محبوبہ کے واپس آنے تک اسی ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر اسے وقت گزارنا چاہیے اس طرح ڈرائیور کو بھی اس کی بے نور آنکھوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکے گا۔

اس نے جب میں ہاتھ ڈال کر اندازے سے سو کا ایک نوٹ نکالا۔ پھر ٹنڈل کر ڈرائیور کی سیٹ کا پتا کیا۔ اس کے بعد سیٹ سے آگے ہاتھ بڑھا کر کہا ”یہ رقم لو اور سینما کے دو ٹکٹ لے کر گاڑیوں کی آخری قطار میں ٹیکسی روکو۔“

ڈرائیور نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ ایک جگہ گاڑی روک دی۔ اس گاڑی سے سینما کا بڑا اسکرین نظر آسکتا تھا۔ اگر نظر کام کرتی۔ صرف کانوں سے سنائی دے رہا تھا۔ کوئی گانا گارہی تھی۔ گھنگرو بج رہے تھے۔ شاید اسکرین پر کوئی طوائف مجرا پیش کر رہی ہوگی۔ آہ! دنیا میں کتنی رنگینیاں اور عیش و نشاط کی محفلیں جیتی ہیں۔ رنگ و نور کو، حسن و شباب کو، کھلتے ہوئے پھولوں کو، روح پرور نظاروں کو اور مسکراتی ہوئی دو شیرازوں کو نہ

دیکھ سکو تو پھر یہ دنیا کیا ہے؟ کچھ نہیں، صرف سانس پوری کرنے کی جگہ ہے۔

یہی خدا کو سمجھنے کا مقام ہوتا ہے۔ جہاں قدرت گرہ ڈال دے، اسے کوئی کھول نہیں سکتا۔ فرار کر راستہ کھل جائے، پھر بھی بندہ فرار نہیں ہو سکتا۔ اور جب تک قدرت کو منظور نہ ہو، گرفتار کرنے والا بھی آگے آکر گرفتار نہیں کر سکتا۔

وہ سرفراز کی دسترس میں تھا وہ اگر بشارت کی گردن پکڑ سکتا تھا اور پوچھ سکتا تھا کہ بچنے کے لیے ڈرائیو ان میں کیوں آئے ہو؟ کب تک ٹیکسی میں گھسے رہو گے؟ لیکن وہ محاسبہ کرنے نہیں آ رہا تھا۔

بشارت نے ڈرائیو سے کہا۔ ”ذرا آس پاس دیکھو، کوئی سیاہ رنگ کی ہنڈا اکارڈ نظر آ رہی ہے؟ مجھے نیم تاریکی میں صاف نظر نہیں آتا ہے۔ باہر نکل کر دیکھ سکتا ہوں مگر تم ہی دیکھ لو۔“

اس نے باہر نکل کر دیکھا۔ پھر پچھلی سیٹ کی طرف جھک کر کہا۔ ”ہماری ٹیکسی کے پیچھے ایک کار ہے پھر اس کار کے پیچھے سیاہ ہنڈا اکارڈ کھڑی ہے۔“

وہ پریشان ہو گیا اس کا اندازہ درست ہو رہا تھا۔ سرفراز خاموشی سے تعاقب کر رہا تھا۔ ڈرائیو نے سوال کیا۔ ”آپ اس اکارڈ کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

جواباً کچھ کہنے سے پہلے ہی موبائل فون سنگل دینے لگا اس کی آواز سننے ہی اس نے ڈرائیو سے کہا۔ ”میں فون پر ضروری باتیں کروں گا۔ تم دور چلے جاؤ۔ بہتر ہے، چائے یا ٹھنڈا پی کر آ جاؤ۔“

بشارت نے چند سیکنڈ تک انتظار کیا۔ وہ ڈرائیو کو دور جاتے دیکھ نہیں سکتا تھا اسے یقین کرنا پڑا کہ وہ دور جا چکا ہے پھر اس نے فون کو آن کر کے کہا۔ ”ہیلو کون؟“

شائستہ کی آواز آئی۔ ”میں ہوں، تم کیا کر رہے ہو؟“

”تمہارے ہی فون کا انتظار کر رہا تھا۔“

اسی وقت ہوٹل کے ایک چھوکرے نے کھڑکی پر جھک کر پوچھا۔ ”صاحب! چائے

یا ٹھنڈا؟“

وہ ڈانٹ کر بولا۔ ”جاؤ یہاں سے۔“

وہ شاید چلا گیا۔ شائستہ نے پوچھا۔ ”یہ کون تھا؟ تم کہاں ہو؟“

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”میں، وہ میں ڈرائیو ان میں ہوں۔“

”کیا تمہیں روٹیاں لگ گئی ہیں؟ میں نے تاکید کی تھی، گھر سے نہ نکلتا۔“

”مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے۔ مجھے تمہارے حکم پر عمل کرنا چاہیے تھا۔ میں باہر نکل کر پچھتا رہا ہوں۔“

”زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ میں رات ایک بجے کی فلائٹ سے آرہی ہوں۔ وہاں تم ایئرپورٹ میں موجود رہو گے۔“

”ہاں، مگر میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

”کیا اجازت حاصل کر کے بولو گے؟“

”نہیں، وہ بات یہ ہے کہ تم سنو گی تو غصہ کرو گی۔“

”فار گاڈ سیک، جو بکنا ہے، وہ بکتے کیوں نہیں؟“

”وہ میں سینما کی بہت بڑی اسکرین کے سامنے ہوں مگر مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو؟ کیا پھر اندھے ہو گئے ہو؟“

”ہاں مگر جس ٹیکسی میں ہوں۔ اس کے ڈرائیو کو یہ معلوم نہیں ہے وہ ہماری باتیں بھی نہیں سن رہا ہے، چائے پینے گیا ہے۔“

”اوہ مائی گاڈ! میں پاگل ہو جاؤں گی۔ خدا کی قسم اس وقت میں وہاں ہوتی تو تمہیں گولی مار دیتی۔ اگر ایسے میں سرفراز تمہیں دیکھ لے گا تو کیا ہو گا؟“

یہ بتانے کی جرأت نہ ہوئی کہ سرفراز دیکھ رہا ہے اور اس کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اس نے کہا۔ ”میں اسی لیے ڈرائیو ان میں آ گیا ہوں۔ جب بینائی واپس آئے گی اور میں چاروں طرف دیکھ کر مطمئن ہو جاؤں گا کہ کسی نے مجھے دیکھا نہیں ہے تب گھ کی طرف

جاؤں گا۔“

”تم تو میرے لیے پرابلم بننے جا رہے ہو۔ میں ایک گھنٹے کے اندر فون کر کے معلوم

کروں گی کہ بینائی واپس آئی ہے یا نہیں؟“

اس نے رابطہ ختم کیا۔ بشارت نے اطمینان کی سانس لی اسے یقین تھا کہ دوبارہ شائستہ کا فون آنے تک وہ اچھی طرح دیکھنے لگے گا لیکن ابھی دو فکریں مسلط تھیں، ایک تو

یہ کہ اب بینائی ہر دوسرے تیسرے دن جانے لگی تھی۔ پہلے کی طرح طویل وقفہ نہیں ہوتا تھا۔ دوسری فکر یہ تھی کہ دشمن پیچھے لگا ہوا تھا۔ نہ آکر پکڑ رہا تھا اور نہ ہی چھوڑ کر جا رہا تھا۔

دشمن تب چھوڑ کر جاتا، جب پکڑنے کو آتا۔ وہ تو آیا ہی نہیں تھا۔ قدرت کے کھیل معجز نما ہوتے ہیں۔ جب وہ پہلی ٹیکسی گاڑیوں کی بھیڑ میں پھنسی ہوئی تھی اور جب اس نے سرفراز کو دیکھا تھا اور سرفراز نے اسے دیکھا، تب ہی وہ ایک دوسرے سے نمٹ سکتے تھے۔ بھاگنے والے نے بھاگنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن ٹیکسی کے اندر ہی قیدی بن کر رہ گیا تھا۔ سرفراز کم از کم یہ کر سکتا تھا کہ اپنی کار کی کھڑکی سے ہاتھ بڑھا کر اس کا گریبان پکڑ سکتا تھا لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ بشارت پر نظر پڑتے ہی وہ چونک گیا تھا۔ پہلا خیال یہ آیا کہ اس کے ساتھ شائستہ بھی ہوگی۔ اس نے ٹیکسی کے اندر نظر دوڑائی شائستہ دکھائی نہیں دی، بشارت تنہا دکھائی دیا۔ تب اس نے سوچا نمک حرام ملازم سے ابھی کچھ نہ کہا جائے، خاموشی سے اس کا تعاقب کیا جائے۔ یہ نمک حرام جس گھر میں جائے گا، اسی گھر میں شائستہ ملے گی۔

ریشیدہ اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اس سے کہنا چاہتا تھا۔ ”بشارت نظر آگیا ہے اب ہم اس کا تعاقب کرتے ہوئے شائستہ تک پہنچ جائیں گے۔ تمہیں بیٹی مل جائے گی اور وہ مجرم میری گرفت میں آجائے گا، جس نے دھوکے سے دوا پلا کر مجھے ذہنی مریض بنا دیا ہے۔“

”ذہنی مریض؟“ وہ ہولے سے ہنس پڑا۔ پھر خیال آیا۔ ”میں کیوں ہنس رہا ہوں؟“

وہ پھر ہنسنے لگا۔ اسے ریشیدہ سے کہنا چاہیے تھا کہ میں نے بشارت کو دیکھ لیا ہے۔ لیکن وہ ہنسنے ہوئے بولا۔ ”میں نے حقارت سے دیکھ لیا ہے۔“

ریشیدہ نے حیرانی سے پوچھا۔ ”آپ کس بات پر ہنس رہے ہیں؟ آپ نے حقارت سے کیا دیکھا ہے۔“

اس نے زور دار قہقہہ لگایا۔ یہ قہقہہ بشارت کے کانوں تک پہنچا۔ وہ سمجھ رہا تھا، شیطان قہقہہ لگاتا ہوا اسے دبوچنے آ رہا ہے۔ جبکہ شیطان خود مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔

مختصر سے قہقہے کے بعد وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو پیٹ رہا تھا۔ ریشیدہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔ سہم کو پوچھ رہی تھی۔ ”کیا ہو گیا؟ آپ سر کیوں پیٹ رہے ہیں؟“

”نہیں، نہیں مجھے پکڑو میں نیچے گر رہا ہوں۔ ریشیدہ مجھے پکڑو۔ میرا سر آہ! میرا سر کہاں ہے؟ ریشیدہ۔ ریشیدہ!“

ریشیدہ نے اسے پکڑ کر اپنی طرف جھکایا۔ متا بھرے انداز میں اس کے سر کو اپنے سینے سے لگایا۔ پھر ڈرائیور سے کہا۔ ”فوراً کسی قریبی اسپتال لے چلو۔“

اس وقت گاڑیوں کو آگے بڑھنے کا راستہ مل رہا تھا۔ ان کی کار بھی راستہ نکالتی ہوئی بریز اسپتال تک پہنچ گئی۔ اسے فوراً ایمر جنسی وارڈ میں پہنچایا گیا۔ ریشیدہ نے کراچی آتے ہی ایک ڈرائیور رکھ لیا تھا۔ سرفراز سے کہہ دیا تھا کہ جب تک مکمل علاج نہ ہو اور وہ دماغی کمزوری سے نجات حاصل نہ کر لے، تب تک گاڑی نہ چلائے۔

اس کی دور اندیشی کام آئی تھی۔ ورنہ وہ کار کی اسٹیرنگ پر ہوتا تو وہ مصیبت میں پڑ جاتی اور شوہر کو بھی بروقت اسپتال پہنچانہ پاتی۔ وہ اسپتال پہنچنے تک بے ہوش ہو گیا تھا۔

ریشیدہ نے ڈاکٹر کو بتایا کہ وہ دماغی مریض ہے۔ اس پر کبھی کبھی دورہ پڑتا ہے، وہ غصے میں چیخا چلاتا ہے یا قہقہہ لگاتا ہے پھر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ایسا پچھلے چار دنوں سے ہو رہا ہے۔ ایک دشمن نے کوئی مسٹر دوا اسے پلا دی تھی۔ اسی دوا کے اثر سے وہ تھوڑی دیر کے لیے پاگل سا ہو جاتا ہے۔

اس کی ہسٹری سننے کے بعد دماغی امراض کے ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اس وقت تک وہ ہوش میں آ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ پنڈی کے ڈاکٹر کا نسخہ دیکھ کر کہا۔ ”مریض کو یہی دوائیں دی جائیں۔ میں اس میں ایک انجکشن کا اضافہ کرتا ہوں۔ انہیں رفتہ رفتہ دماغی توانائی حاصل ہوتی رہے گی۔“

یہ بھی ہدایت کی گئی کہ مریض کے مزاج کے خلاف کوئی بات نہ کی جائے اور نہ ہی اسے غصہ دلایا جائے۔ اگر وہ نشہ کرتا ہو تو اسے نشے سے پرہیز کرایا جائے۔ وہ رات گیارہ بجے اپنے اپارٹمنٹ میں واپس آئے۔ وہ آرام سے بستر پر لیٹ کر بولا۔ ”میں کیا کروں؟ کچھ میں نہیں آتا، دماغ اچانک کیسے بے قابو ہو جاتا ہے۔“

وہ اس کا سر سلاتے ہوئے بولی۔ ”آپ کچھ نہ سوچیں۔ سونے کی کوشش

کریں۔

”کیسے نہ سوچوں، وہ سامنے آکر ہاتھ سے نکل گیا ہے۔“

”کون ہاتھ سے نکل گیا ہے۔“

”بشارت۔ وہ نمک حرام گردمند کے پاس نظر آیا تھا۔ پبلی ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ٹیکسی مخالف سمت سے ٹھیک ہماری کار کے برابر آکر رک گئی تھی۔“

”کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ بشارت ہی تھا۔“

”بالکل، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس وقت میں بالکل نارمل تھا۔

پورے ہوش و حواس میں رہ کر اسے پہچان رہا تھا۔“

”آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“

”میں بتانا چاہتا تھا۔ شاید اسے دیکھ کر مجھے غصہ آگیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں غصے میں ہنس پڑا تھا۔ میرے دماغ میں یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ میں کیوں ہنس رہا ہوں؟ اس کے بعد مجھے ہوش نہ رہا۔ یہ دماغ کیا چیز ہے۔ یہ کام نہ کرے تو آدمی اپنے آپ سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں اس ذلیل بد معاش کو پکڑ کر جوتے مارتا اور مجھے دماغی نقصان پہنچانے کے الزام میں جیل پہنچا دیتا۔“

”آپ اس کینے کا ذکر نہ کریں۔ پھر غصہ آئے گا تو آپ نارمل نہیں رہیں گے۔“

”اس کا ذکر کیسے نہ کروں۔ وہ ہمارے خاندان کی عزت لے گیا ہے۔ جب تک وہ واپس نہیں آئے گی اور جب تک یقین نہیں ہوگا کہ بات بگڑنے سے پہلے بن گئی ہے۔ بٹی کے در بدر ہونے کی خبر کسی کو نہیں ہوئی ہے اور ہماری عزت رہ گئی ہے، تب تک اس ذلیل ڈرائیور کا ذکر ہوتا ہی رہے گا۔“

”آپ دماغی کمزوری کا عذاب سہتے ہوئے بٹی کو واپس لانے کے لیے بھاگ دوڑ میں مصروف ہیں۔ اسے واپس لانے کے لیے آپ اپنے تمام ذرائع اور دولت کو استعمال کر سکتے ہیں لیکن ایک ذریعہ اور ہے اور وہ ہے دعا۔ ہم کبھی بھولے بھٹکے خدا کو یاد کرتے ہیں۔ ورنہ ایسے رہتے ہیں جیسے یہ دنیا خدا کی نہیں، ہماری ہے اور ہم کسی آفت یا آزمائش کے بغیر جی لیں گے۔ مجھے لگتا ہے، یہ قدرت کا عذاب اور خدا کی رضا سے ہی عذاب دور ہو سکتا ہے۔“

”کیسی دقیانوسی باتیں کر رہی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تو نہیں کہا تھا کہ تمہاری بیٹی کو ایک ڈرائیور کے ساتھ بھاگنا چاہیے۔ اور مجھے اس نمک حرام نے وہ دوا پلائی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے تو نہیں پلائی۔ یہ احتمالہ خیال ہے کہ دعا مانگنے سے اور توبہ کرنے سے مصیبتیں دور ہو جائیں گی۔ اپنی دماغی توانائی کے لیے کسی عالم دین کے پاس نہیں ڈاکٹر کے پاس جاتے رہنا ہوگا۔ شائستہ کو واپس لانے کے لیے روزے نماز اور تعویذ گندوں کی ضرورت نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم کسی حکمت عملی سے اسے تلاش کریں۔“

یہ حقیقت سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ ابھی اس نے تلاش کر لیا تھا۔ بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اس کا گریبان پکڑ سکتا تھا لیکن قدرت نے سمجھایا تھا کہ وہ اپنے ارادے سے کچھ نہیں کر سکتا، قدرت کی منشا ضروری ہے۔

ڈرائیور سلامت کو قتل کرنا، مقتول کی بیٹی کا قاتل کے سائے میں پرورش پانا پھر بیٹی کا جوان ہو کر انتقامی کارروائی کرنا اور گزرے ہوئے وقت کو دہرائنا۔ اس بیٹی کا بھی ایک ڈرائیور کے ساتھ بھاگ جانا اور ڈرائیور کا وہ دوا پلانا۔ یہ سب کیا تھا؟ یہ رشیدہ، سرفراز، شائستہ اور بشارت کے اعمال کے نتائج تھے۔ ایسے ہی مختلف انسانوں کے عمل اور رد عمل سے جو فطری نتائج کے سامنے آتے ہیں، انہیں مقدر کا کھیل کہا جاتا ہے۔

یہ کھیل ہے کہ پنڈ کا ایک بندہ مٹی کے کچے گھر سے نکل کر شہر کی ایک کوٹھی میں پہنچا اور کوٹھی والوں کی انتقام بازی کا ایک کردار بن گیا اور اس معمولی سے کردار نے ایک مل اونز کا دماغ الٹ دیا۔ پھر بھی مل اونز کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ مقدر کا کھیل بہت عرصے سے، بہت ماضی بعید سے ہوتا چلا آ رہا ہے اور کھیل کے ایسے طریقے کاتب تقدیر لکھ چکا ہوتا ہے۔

موبائل فون کا سنگٹل مخاطب کرنے لگا۔ سرفراز نے اسے اٹھا کر آن کیا۔ پھر کہا۔

”ہیلو؟“

شازیہ کی آواز آئی ”ہیلو پاپا! میں بول رہی ہوں۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“

”طبیعت تھوڑی سی ٹھیک تھی۔ اپنی بیٹی کی آواز سن کر بالکل ٹھیک ہو گیا ہوں۔“

”مئی کہاں ہیں؟“

”میرے پاس بیٹھی ہیں، زبیر سے بات کراؤ۔“

”ابھی بات کراتی ہوں۔ پہلے یہ خوش خبری سن لیں کہ آپنی سے میری فون پر بات ہوئی تھی۔ وہ اپنی غلطی پر پچھتا رہی ہیں۔ آپ سے اور می سے معافی مانگنے آئیں گی۔ آپ معاف کر دیں گے نا؟“

”کیوں نہیں، وہ ہماری بڑی بیٹی ہے۔ ماں باپ کا دل بہت بڑا ہوتا ہے وہ اولاد کی بڑی سے بڑی غلطی معاف کر دیتے ہیں۔ اس سے کہو اپنا پتا بتائے، ہم اس کے پاس جائیں گے اور بڑی محبت سے گھر لے آئیں گے۔“

”آپنی خود آئیں گی۔ میں نے انہیں آپ کا پتا بتا دیا ہے۔“

”اوہ گاڈ! یہ تم نے کیا کیا۔ اسے یہاں کا پتا نہیں بتانا چاہیے تھا۔“

”حرج کیا ہے بابا! آپ ان کے پاس جائیں یا وہ آپ کے پاس آئیں، ایک ہی بات ہے۔“

”ایک ہی بات نہیں ہے۔ تم یہ کیوں بھولتی ہو کہ وہ ایب نارمل ہے۔ میرے اپارٹمنٹ میں آکر کوئی ایسی سیدھی حرکت کر سکتی ہے اگر ہم اس کے پاس پہلے جاتے تو اسے سمجھانا نارمل رکھ سکتے تھے۔“

”واقعی میں یہ بات بھول گئی تھی۔ سو سوری بابا!“

”کوئی بات نہیں۔ زبیر کو فون دو۔“

پھر وہ زبیر سے باتیں کرنے لگا۔ رشیدہ فون کے اسپیکر کے ذریعے دونوں طرف کی باتیں سن رہی تھی اور یہ سن کر خوش ہو رہی تھی کہ بیٹی کو غلطی کا احساس ہو گیا ہے اور وہ معافی مانگنے کے لیے آنے والی ہے۔ سرفراز نے بیٹی سے باتیں کرنے کے بعد فون کو آف کیا۔ پھر رشیدہ سے کہا۔ ”یہ بہت برا ہوا۔ شائستہ کو اس اپارٹمنٹ کا پتا معلوم نہیں ہونا چاہیے تھا۔“

”اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“

”سمجھا کرو۔ وہ دو لکے کے ملازم کے ساتھ یہاں آئے گی تو میری کیا عزت رہ جائے گی؟“

”ہاں، یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں، وہ کم بخت اس کے ساتھ کھیل بنا ہوا ہے۔“

پھر وہ ذرا دیر سوچ کر بولی۔ ”مگر وہ پچھتا رہی ہے اس کا مطلب ہے، بشارت سے

بے زار ہو گئی ہے۔ شاید اسے لات مار کر نکال دیا ہے۔ ارے ہاں! یاد آیا، آپ نے اس کینے کو تنہا دیکھا تھا یا شائستہ بھی ساتھ تھی؟“

”وہ تنہا تھا۔ کچھ میری بھی سمجھ میں آ رہا ہے کہ شائستہ نے اسے دھتکار دیا ہے اور اب ہم سے ملنا چاہتی ہے۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ میں داتا صاحب کے نام پر سو دیکھیں پکواؤں گی۔ میں نے یہاں آنے سے پہلے عبادت کی تھی۔ دعائیں مانگی تھیں۔ اللہ نے میری سن لی۔ آپ کہہ رہے تھے، وہ تلاش کرنے سے ملے گی۔ مگر اللہ ہمیں اس سے تلاش کے بغیر ہی ملا رہا ہے۔“

اور وہ سوچ رہا تھا، ایک بار مل تو جائے میں، اگلا پچھلا تمام منساب۔ بے باق کر دوں گا۔

☆-----☆-----☆

شائستہ نے اترپورٹ کے لیج ہال سے باہر آکر سب سے پہلے بشارت کی آنکھوں کو گھور کر دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ”تمہیں نظر آ رہا ہے؟“

”ہاں، وہیں ڈرائیو ان میں بینائی واپس آ گئی تھی۔“

”تم اندھے کیوں نہیں ہو جاتے تاکہ تم سے پیچھا چھوٹے۔“

”پلیز، لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ گھر چل کر غصہ کر لیتا۔“

وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر گھر آئے۔ اس نے پوچھا۔ ”میں نے تاکید کی تھی گھر سے باہر نہ جانا پھر کیوں مرنے گئے تھے؟“

”ایک غلطی ہو گئی۔ اسے بھول جاؤ، آئندہ جہاں بٹھاؤ گی، وہیں بیٹھا رہ جاؤں گا۔ تم آرام سے لیٹ جاؤ۔ اتنی دور سے آئی ہو تھک گئی ہوں گی۔“

”تمہارا کیا خیال ہے، میں لاہور سے پیدل آرہی ہوں؟“

”نہیں، میرا یہ مطلب نہیں ہے، ذہنی تھکن بھی تو ہوتی ہے۔“

”ہاں، تمہارے بارے میں سوچتے سوچتے تھک گئی ہوں۔ جلد ہی تمہارے لیے کہیں سے آنکھوں کا عطیہ نہ ملا تو کیا ہو گا؟“

”میں بھی یہی سوچ کر پریشان ہوتا رہتا ہوں۔ اندھا ہو جاؤں، تو تمہارے کسی کام

کانہیں رہوں گا۔

”میں ایک عمدہ تدبیر سوچ کر آئی ہوں۔ اسی تدبیر پر عمل کرنے کے لیے تمہارا تعاون رہے گا تو میں سرفراز کو دن میں تارے دکھا دوں گی۔“

”میں بھلا تعاون کیوں نہیں کروں گا۔ تمہارے لیے جان بھی حاضر ہے۔“

”مجھے تمہاری جان کی نہیں، تمہاری بینائی کی ضرورت ہے اگر تدبیر پر عمل کرنے کے دوران بینائی جائے گی تو ساری کوششیں غارت ہو جائیں گی۔“

”تم کرنا کیا چاہتی ہو؟“

وہ بھرپور انگڑائی لے کر بستر پر لیٹ گئی۔ بشارت نے زیر و پاور کو آن کیا۔ باقی بتیاں بجھا دیں۔ پھر اس کے پاس آگیا۔ وہ بولی۔ ”سرفراز کلفٹن کے ایک اپارٹمنٹ میں رہتا ہے۔ مجھے پتا معلوم ہو گیا ہے۔“

”کیسے معلوم ہوا؟“

”کیا تم کسی پولیس والے کی اولاد ہو؟ کیسے بھی معلوم ہو گیا۔ پوچھ کر کیا کرو گے؟“

اس کی ڈانٹ ڈپٹ اچھی لگتی تھی۔ آخر اپنی تھی۔ کھلاتی پلاتی تھی۔ دودھ دینے والی گائے تھی۔ دن کو پہلوان، رات کو مہربان ہوتی تھی۔ پھر حسین، تھی، دل نشین تھی۔ اس کی بدمزاجی بھی ایک ادا لگتی تھی۔

وہ گردن میں بانہیں ڈال کر بولی۔ ”سچ میں نہ بولا کرو۔ میں بھول جاتی ہوں، ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی؟“

”تمہیں سرفراز کا پتا معلوم ہو گیا ہے۔“

”ہاں، می بھی وہاں موجود ہیں۔ میں ان سے ملنے جاؤں گی۔ اس سے پہلے ایک اچھی سی کار خرید لوں گی۔ تم اس کار میں اپارٹمنٹ سے ذرا دور رہو گے۔ تمہارے پاس موبائل فون ہو گا۔ جب بھی میں فون پر کہوں آ جاؤ تو فوراً اپارٹمنٹ سے سامنے چلے آنا۔“

وہ خاموش رہی، پھر بولی۔ ”کوئی سوال کرنا چاہو تو کرو۔“

”میں اپارٹمنٹ کے سامنے آ جاؤں گا۔ پھر کیا ہو گا؟“

”ہم سرفراز کو اغوا کر کے اس گھر میں لائیں گے۔ اب یہ نہ پوچھنا کیسے اغوا کیا جائے گا۔ یہ میرا کام ہے، مجھے تمہاری طرف سے اندیشہ ہے۔ اسے یہاں لاتے وقت اور

کارڈ رائیو کرتے وقت تمہاری بینائی دھوکا دے گی تو کیا ہو گا؟“

”بینائی کو اپنے قابو میں رکھنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ میں تو صرف خدا سے دعا کر سکتا ہوں کہ وہ مجھے تمہاری آزمائش میں پوری طرح کامیاب کرے۔“

”میں مانتی ہوں۔ بعض حالات میں ہم بے بس ہوتے ہیں۔ دعائیں مانگ کر ہی کامیابی کا انتظار کرتے ہیں۔ میں تم پر بھروسہ کرنے پر مجبور ہوں۔ اس معاملے میں کسی تیسرے کو رازدار بنانا دانشمندی نہیں ہو گی۔“

وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ زیر و پاور کی خواب آور سی مدھم مدھم روشنی میں جاگے رہے اور ایک دوسرے کو جگاتے رہے۔ اپنے موجودہ مسائل کو ذرا بھولنے رہے۔ ذرا بھلاتے رہے پھر وہ بڑے جذبوں میں ڈوب کر بولی۔ ”تم بہت اچھے ہو، مجھے پاگل کر دیتے ہو۔“

”مجھے اچھا کہتی ہو پھر غصہ بھی دکھاتی ہو۔“

”غلطیاں کرو گے تو ضرور غصہ آئے گا۔ میں خوش ہو کر انعام دیتی ہوں تو ناراض ہو کر گالیاں بھی دے سکتی ہوں۔“

”لیکن یہ مرد کی شان کے خلاف ہے کہ وہ عورت کی زیادتیاں برداشت کرے۔“

”شان صرف مرد کی نہیں ہوتی۔ عورت کماؤ ہو تو مرد سے زیادہ شان دار ہوتی ہے۔ بستر پر آکر بھی یہ نہ بھولنا کہ تمہارا ہاتھ نیچے ہے، لینے والا اور میرا ہاتھ اوپر ہے، دینے والا۔“

مرد کی زبان چپ ہو گئی کیونکہ یہ عورت یا مرد کی برتری کا معاملہ نہیں تھا۔ یہ صرف اور صرف معاشی مسئلہ تھا۔ اگر ایک تانگے والے کا بیٹا بے روزگار ہے اور چار پیسے بھی کما کر نہیں لاتا ہے اور گھوڑا روز چالیس روپے کما کر دیتا ہے تو گھوڑا آدمی سے برتر ہو گا۔

وہ بولی۔ ”تم میری سیلیوں کو جاننے ہو؟“

”ہاں، وہ صفیہ اور رضوانہ جو تمہارے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھا کرتی تھیں۔“

”صفیہ جوانی میں بیوہ ہو گئی لیکن شہر کی چھوٹی ہوئی دولت اور جائیداد کی مالک بن گئی۔ پھر اس نے شادی نہیں کی۔ ایک بے روزگار، کربجیٹ کو رکھ لیا ہے۔ دولت

مند مرد بھی تو داشتائیں رکھتے ہیں۔ داشتہ صرف عورت نہیں ہوتی، مرد بھی ہوتے ہیں۔“
بشارت نے دل میں اعتراف کیا، بے شک اسکول یا یونیورسٹی کا صرف سرٹیفکیٹ ہاتھ میں ہو اور روزگاری ضمانت نہ ہو تو انسانی معاشرے میں مردوں کا بھی چمکھ کھل جاتا ہے۔ اس بازار میں خورد اور کسرتی بدن والے جوانوں کی خریدار مل جاتی ہیں۔ خرید و فروخت کا بازار زنانہ ہو یا مردانہ وہاں غیرت کے مول پر ضرورت پوری ہوتی ہے۔

وہ بولی۔ ”میری دوسری سہیلی رضوانہ کو اس کے شوہر نے چھوڑ کر دیا اور ایک دولت مند بیوہ سے شادی کر لی۔ اب وہ اس بیوہ کا تابعدار بن کر رہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں جب تک تمہاری ضرورتیں پوری کرتی رہوں گی، تم میرے وفادار رہو گے اور میری نرمی گرمی برداشت کرتے رہو گے۔“

وہ بستر پر چاروں شانے چت پڑا تھا۔ حالات نے اسے پچھاڑ دیا تھا۔ کوئی پیدائشی بے غیرت نہیں ہوتا۔ بے روزگاری اور ضرورتیں مجبور کر دیتی ہیں۔ دس جماعتیں پاس کرنے کے بعد وہ ڈرائیور بننے پر مجبور نہ ہوتا اسے تعلیم کے مطابق کوئی ایسی ملازمت ملتی، جس کے سہارے وہ مزید تعلیم جاری رکھتا تو باپ کے خوابوں کی تعبیر کے لیے ضرور کوئی چھوٹا بڑا افسر بن جاتا۔

وہ پنڈ سے بہت بڑے چیلنج کا سامنا کرنے آیا تھا۔ چودھری کی غلامی کو ٹھکرا کر شر سے ایک بڑا افسریا بیٹا کماؤ پوت بن کر واپس جانا تھا۔ افسر بننے کے، رائج میسر نہیں تھے۔ ڈرائیور بن کر وہ تین وقت کی روٹیاں کھا سکتا تھا اور یہ روٹیاں پنڈے کے کچے مکان میں بھی مل جاتی ہیں جبکہ اسے ایک نمایاں محض بن کر چودھری کی بچوں، بیٹی اور باپ کا سرواچھا کرنا تھا۔ ایسا کرنے کے لیے کوئی ہمینہ بہاتا ہے، کوئی خون پیتا ہے، وہ اپنی آبرو بیچ رہا تھا۔ دوسرے دن شانتہ نے ایک کار خرید لی۔ پھر گھر آکر فون کے ذریعے ماں کو مخاطب کیا۔ ”ہیلو می! میں آپ کی نالائق بیٹی ہوں۔ شاید آپ میری آواز بھی نہیں پہچانیں گی۔“

رشیدہ نے کہا۔ ”ایسا نہ کہو میری جان! صبح کا بھلا، شام کو آجائے تو وہ نالائق نہیں عقل مند ہوتا ہے اور تم تو میری ذہین بیٹی ہو۔“
”کیا بیبا! مجھے معاف کریں گے؟“

سرفراز کی آواز آئی۔ ”بیٹی! غلطی ہر انسان سے ہوتی ہے۔ میں تمہیں معافی مانگنے سے پہلے ہی معاف کر چکا ہوں۔ تم کہاں ہو، ہم تمہیں لینے آئیں گے۔“
”میں جہاں تھی، وہ جگہ چھوڑ چکی ہوں۔ آپ کے پاس آ رہی ہوں۔“
”بیٹی! آنے سے پہلے اپنے والدین اور خاندان کی عزت کو پیش نظر رکھو اور اس ڈرائیور کو یہاں نہ لاؤ۔ ہم شرم سے مرجائیں گے۔“

بشارت سامنے ہی بیٹھا یہ باتیں سن رہا تھا۔ شانتہ نے اسے دیکھا پھر کہا۔ ”مجھے اور شرمندہ نہ کریں۔ وہ بد معاش میرے پچاس ہزار روپے چرا کر بھاگ گیا ہے۔“
بشارت نے چونک کر اپنی مالکہ کو دیکھا۔ ادھر سے رشیدہ نے کہا۔ ”لغت بھیجو اس نمک حرام پر۔ تم آجاؤ، ہم لاہور جا کر اس کے خلاف چوری کی رپورٹ درج کرا دیں گے۔“

”ٹھیک ہے می! میں ایک گھنٹے کے اندر آ رہی ہوں۔“
اس نے فون کو آف کیا۔ پھر مسکرا کر بشارت سے پوچھا۔ ”کچھ سمجھے؟“
”تم سمجھاؤ گی تو سمجھوں گا۔ فی الحال یہ بات عقل میں آ رہی ہے کہ تم جب چاہو گی، مجھے اغوا اور چوری کے الزام میں حوالات پہنچا دو گی۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ میں نے تمہیں چور اور بھگواڑ بنا کر می اور سرفراز کا اعتماد حاصل کر لیا ہے۔ میری یہ اٹیچی اٹھاؤ اور مجھے کار میں حسن اسکوائر تک لے چلو۔ وہاں سے میں ٹیکسی میں جاؤں گی۔ تم ٹیکسی کے پیچھے آکر اس اپارٹمنٹ کو دیکھو گے۔ پھر وہاں سے کچھ دور جا کر میرے فون کا انتظار کرو گے۔“

بشارت نے اٹیچی اٹھالی پھر مکان کو لاک کر کے دونوں کار میں آکر بیٹھ گئے۔ راستے میں شانتہ نے کہا۔ ”کوئی ضروری نہیں ہے کہ آج ہی کامیابی ہو۔ دو چار دن لگ سکتے ہیں۔ بہتر یہ ہو گا کہ تم کلفٹن کے قریب کسی ہوٹل میں قیام کرو۔ تاکہ ضرورت پڑتے ہی فوراً میرے پاس پہنچ سکو۔“

وہ سوچ ۲ بج کر اسے ہدایات دیتی رہی۔ پھر حسن اسکوائر پہنچ کر اپنی اٹیچی لے کر بشارت سے جدا ہو گئی۔ اسے چند منٹ کے بعد ایک ٹیکسی مل گئی۔ اس نے ڈرائیور سے کلفٹن چلنے کو کہا اور پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ راستے میں کئی بار پیچھے گھوم کر دیکھا۔ اپنی کار

پڑے اس کے بعد وہ انجکشن لگائے جائیں۔ خدا کرے کہ پھر یہ دورہ نہ پڑے۔“

شائستہ کیریڈ کیریڈ کر معلومات حاصل کرتی رہی پھر وہ دونوں لباس بدل کر کمرے سے باہر آئیں۔ ملازم رضائی نے ڈرائیور کو بلا کر لے آیا تھا۔ وہ تینوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ سرفراز نے ڈرائیور سے کہا ”ٹنکی فل کراؤ اور پہلے ہاکس بے لے چلو۔“

وہ ہاکس بے گئے۔ شام کا وقت تھا۔ وہاں بڑی رونق تھی۔ اندرون ملک سے آنے والوں کے لیے سمندر کا نظارہ دل فریب اور نیا نیا سا ہوتا ہے۔ وہ بڑی دیر تک وہاں کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ پھر رشیدہ نے بیٹی کو ایک طرف لے جا کر آہستگی سے کہا۔ ”کل رات نوبے تمہارے پیلا پر دورہ پڑا تھا۔ ہمیں نوبے سے پہلے گھر پہنچ جانا چاہیے پھر ابھی شاپنگ بھی کرنی ہے۔“

وہ وہاں سے صدر گئے پھر تین تلواروں کے قریب کئی دکانوں سے اتنا کچھ خریدا کہ ڈرائیور کے علاوہ ان کے ہاتھوں میں بھی بڑے بڑے پیکیٹس رہے۔ اس دوران شائستہ کی تمام توجہ نسخے اور دواؤں پر رہی۔ رشیدہ نے یہ دونوں چیزیں ایک شاپنگ بیگ میں رکھی تھیں۔ شائستہ نے ماں کی نظریں بچا کر اس بیگ میں سے نسخہ اور دوائیں نکال لیں۔ پھر کار میں آکر بیٹھتی ہی انہیں باہر پھینک کر دروازہ بند کر لیا۔ کار آگے بڑھ گئی۔

اپارٹمنٹ میں واپس آکر سب ہی تھکے ہوئے انداز میں صوفوں پر بیٹھ گئے۔ سرفراز نے پلنگ پر لیٹتے ہوئے کہا۔ ”پتا نہیں لوگ پیدل کس طرح چلتے ہیں۔ ہم تو کار میں بیٹھ کر بھی تھک جاتے ہیں۔“

رشیدہ نے کہا۔ ”آپ تو یوں بھی کمزور ہو گئے ہیں۔ آرام سے لیٹے رہیں۔ میں دوائیں نکال کر دے رہی ہوں‘ آپ کھالیں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے ان دواؤں سے توانائی بھی حاصل ہوتی رہے گی۔“

وہ شاپنگ بیگ سے سامان نکالنے لگی پھر بولی۔ ”دوائیں کہاں ہیں؟“

سرفراز نے پوچھا۔ ”تم نے کہاں رکھی تھی؟“

”مجھے یاد ہے“ اسی بیگ میں رکھی تھیں۔ دواؤں کے ساتھ نسخہ بھی تھا۔“

شائستہ اپنے شاپنگ بیگ سے سامان نکال چکی تھی اور کچھ تلاش کر رہی تھی پھر اس نے کہا۔ ”میری لپ اسٹک اور ٹوتھ برش بھی نہیں ہے۔“

”تم ماں بیٹی نے یہ چیزیں کسی دکان میں چھوڑ دی ہیں۔ زیادہ شاپنگ کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔“

”پیلا! میری جو چیزیں گم ہوئیں، وہ اتنی ضروری نہیں ہیں، آپ کی دواؤں کا کیا ہوگا؟“

”یہ اپنی مٹی سے پوچھو۔ تمہیں پا کر یہ مجھے اور میری دوائیں بھول رہی ہیں۔“

رشیدہ نے کہا۔ ”خدا نہ کرے کہ کبھی آپ کو بھولوں میں ابھی جا کر دوسری دوائیں لے آؤں گی۔“

”لیکن نسخے کے بغیر کیسے لاؤ گی پھر میں تو اب اتنی دور نہیں جاؤں گا۔“

”آپ آرام کریں۔ شائستہ تم چلو گی؟“

”اوہ‘ نومی! میں بھی تھک گئی ہوں پھر پیلا بھی یہاں اکیلے رہ جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے، تم پیلا کے پاس رہو۔ میں رضائی کو ساتھ لے کر جاتی ہوں جس دکان سے دوائیں لی تھیں۔ شاید اس کیمسٹ کو ان دواؤں کے نام یاد ہوں۔“

”اوہ مٹی! آپ سی بریز اسپتال کے ڈاکٹر کے پاس جا کر وہ نسخہ دوبارہ لکھوا سکتی ہیں۔“

”اگر کیمسٹ کو یاد نہ رہا تو ڈاکٹر کے پاس جانا ہی ہوگا۔“

رشیدہ رضائی کے ساتھ چلی گئی۔ دروازہ بند کر کے آئی پھر پلنگ کے سرے پر بیٹھ کر سرفراز کے پاؤں دابنے لگی۔

وہ خوش ہو کر بولا۔ ”ارے یہ کیا کر رہی ہو؟“

”پیلا! جب میں نے واپس آنے کا فیصلہ کیا تو یہ بھی عہد کیا کہ آپ معاف کر دیں گے اور میری حماقتوں کو بھلا دیں گے تو دن رات آپ کی خدمت کر کے آپ کا دل جیت لوں گی۔“

بھئی، تم نے آتے ہی دل جیت لیا ہے۔ بشارت نے مجھے نقصان پہنچایا ہے مگر فائدہ بھی پہنچایا ہے۔ اس سے دھوکا کھا کر تمہیں ماں باپ کی محبت اور اہمیت معلوم ہوئی ہے۔“

”آپ میرے سامنے اس ذلیل کینے کا نام نہ لیں۔ اگر وہ دوا میرے پاس ہوتی تو میں اسے پلا کر پاگل بنا دیتی۔“

”بیٹی! اس دوا کا ذکر نہ کرو۔ سنتے ہی میرے اندر ہیجان پیدا ہوتا ہے۔“

”ایسے وقت آپ کو ٹھنڈا پانی یا ٹھنڈا مشروب پینا چاہیے۔“

”ڈاکٹر نے بھی یہی ہدایت کی ہے۔ مجھے ایک گلاس لیمن اسکوائش دے دو۔“

”ابھی لاتی ہوں۔“

وہ وہاں سے اٹھ کر کچن میں آئی۔ اس نے فریج کھول کر لیمن اسکوائش کی بوتل نکالی اور ایک گلاس تیار کرنے لگی۔ پھر اسے کچھ کر دیکھا، مزے دار تھا اس نے دروازے کی طرف آکر ادھر ادھر نظر ڈالی۔ کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر واپس آکر گریبان میں ہاتھ ڈال کر وہ شیشی نکالی جسے پنڈی میں بشارت نے استعمال کیا تھا۔ اس کے صرف چار چھ قطرے استعمال کیے تھے۔ ابھی شیشی میں نصف دوا باقی تھی۔ اس نے گلاس میں تین قطرے ڈال دیے۔ اسے جچے سے ہلایا۔ پھر گلاس اٹھا کر بیڈ روم میں آگئی۔ وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا، اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کچھ پریشان نظر آ رہا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ ”میرا دل گھبرا رہا ہے، کہیں پھر طبیعت بگڑے گی تو کیا ہوگا؟“

”آپ پریشان نہ ہوں۔ میں آپ کے پاس ہوں۔ اسے پی لیں، طبیعت سنبھل جائے گی۔“

اس نے گلاس کو دونوں ہاتھوں میں لیا۔ پھر ہونٹوں سے لگا کر غٹاٹ پینے لگا۔ آدھا گلاس پینے کے بعد اس نے اطمینان کی لمبی سانس لی۔ پکے کو ٹھنڈک پہنچ رہی تھی۔ پھر اس نے گھونٹ گھونٹ کر کے باقی مشروب بھی پی لیا۔ وہ خالی گلاس لے کر بولی۔ ”اب آپ کو آرام آئے گا۔ تکیے سے ٹیک لگالیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔“

وہ بیڈ روم سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آئی۔ وہاں موبائل فون رکھا ہوا تھا۔ اس نے بشارت سے رابطہ کیا۔ پھر بولی۔ ”ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرو۔ فوراً چلے آؤ، تمہاری بیٹائی ٹھیک ہے نا؟“

”بالکل ٹھیک ہے، ابھی پہنچ رہا ہوں۔“

رابطہ ختم ہو گیا اس نے کچن میں آکر گلاس کو اچھی طرح دھو کر ایک طرف رکھا۔ پھر سرفراز کے پاس آئی۔ اس سے بولی۔ ”تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟“

وہ چونک کر بولا۔ ”تم اپنے پیپا کو تم کہہ رہی ہو؟“

وہ حیرانی سے بولی۔ ”میں نے آپ کہا ہے۔ آپ غلط کیوں سن رہے ہیں؟“

”آں؟ ہاں، وہ مجھے ایسا ہی لگا جیسے تم کہہ رہی ہو۔“

”پیپا! کہیں یہ دورہ پڑنے کے آثار.....“

اتنا کہہ کر وہ کوئی لفظ ادا کیے بغیر ہونٹ ہلانے لگی۔ جیسے کچھ کہہ رہی ہو۔ سرفراز نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے بات پوری نہیں کی۔ تمہاری آواز کیوں نہیں نکل رہی ہے؟“

وہ کانوں کے قریب آکر اونچی آواز میں بولی۔ ”میں تو بول رہی ہوں، کیا تو بہرا ہو گیا ہے۔ مجھے پاگل بنانے کی سازش کرنے والے، کیا پاگل ہو رہا ہے؟“

وہ زور زور سے چیخنے لگا۔ ”کیا بکواس کر رہی ہے۔ میں تجھے مار ڈالوں گا تو نے واپس آکر اپنی موت کو دعوت دی ہے۔ میں تجھے زندہ نہیں.....“

وہ اٹھتے اٹھتے اونڈھے منہ گرا۔ آدھا بستر پر رہا، آدھا فرش پر آیا۔ وہ جھک کر بولی۔ ”پور پیپا! آپ مجھے دشمن کیوں سمجھ رہے ہیں؟ میں آپ کی بیٹی ہوں۔ اسی لیے ابھی آپ کا بکجا ٹھنڈا کیا ہے۔“

وہ ہنسنے لگا۔ ہنستے ہنستے بستر سے پھسلتے ہوئے پوری طرح فرش پر آکر لوٹنے لگا۔ شائستہ ذرا دور آکر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی بے بسی کا تماشا دیکھنے لگی۔ پندرہ منٹ کے بعد گاڑی کی آواز سن کر باہر آئی۔ بشارت آچکا تھا۔ اس نے اندر بلا کر کہا۔ ”اسے اٹھاؤ اور پچھلی سیٹ پر ڈال دو۔“

اس نے سرفراز کے پاس آکر اسے اٹھایا۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ شائستہ نے کہا۔ ”پیپا! ذرا ہوش میں رہیں، ہم آپ کو اسپتال لے جا رہے ہیں۔“

بشارت نے اسے مضبوطی سے جکڑ کر کھڑا کیا تھا وہ کراہ رہا تھا۔ بشارت اسے گھسیٹتا ہوا کار تک لے گیا پھر کار کی پچھلی سیٹ پر پہنچتے پہنچتے سرفراز بے ہوش ہو گیا۔

شائستہ نے ایک کانڈ پر لکھا ”ممی! پیپا پر شدید دورہ پڑا ہے، میں انہیں اسپتال لے جا رہی ہوں۔ آپ میرے فون کا انتظار کریں۔“

اس نے اس تحریر کو بیرونی دروازے پر چپکایا۔ اسے لاک نہیں کیا۔ ویسے ہی کھلا چھوڑ کر کار کی انگلی سیٹ پر آگئی۔ بشارت نے کار اشارت کی۔ پھر وہ اپارٹمنٹس کے

احاطے سے باہر آگئے۔ وہ رفتار تیز کرتے ہوئے بولا ”اب میں سمجھ رہا ہوں۔ تم نے جو دوا مجھ سے لی تھی، اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔“

”ہاں، اسے اپنے مکان میں لے جا کر قیدی بنا کر رکھنا ہے۔ تم اسے باندھ کر رکھو گے۔ نہ چیخنے دو گے۔ نہ باہر نکلے دو گے۔“

”میں اسے جہاں باندھوں گا وہاں سے ہلنے نہیں دوں گا لیکن اسے کب تک قیدی بنا کر رکھو گی؟“

”ابھی شیشی میں دوا کے کافی قطرے ہیں۔ میں تھوڑا تھوڑا کر کے یہ زہر دوں گی۔ اسے تڑپا تڑپا کر پوری طرح پاگل بنادوں گی۔“

وہ اپنے مکان میں پہنچ گئے۔ بشارت نے کار کو دروازے سے لگا کر کھڑا کیا۔ شائستہ نے مکان کا دروازہ کھولا۔ بشارت نے کار کے پیچھے دروازے کو کھول کر سرفراز کے بغل میں ہاتھ ڈال کر اسے باہر کھینچا۔ اسٹریٹ لائٹ کے نہ ہونے سے رات کا اندھیرا اور گہرا ہو گیا تھا، کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ وہ اسے کھینچ کر اندر لے آیا۔ پھر اسی طرح فرش پر گھسیتا ہوا ایک کمرے میں لا کر اسے اٹھا کر بستر پر ڈال دیا۔ شائستہ نے کہا۔ ”اس کے دونوں ہاتھ پلنگ کی پٹیوں سے باندھ دو۔“

وہ رسی لے آیا۔ پھر پلنگ کے دونوں طرف دونوں ہاتھوں کو باندھتے ہوئے بولا۔ ”وہ دوا زیادہ مقدار میں دی جائے تو ہلاکت کا باعث بن سکتی ہے اگر یہ مر گیا تو کیا ہو گا؟“

وہ ایک کرسی پر آرام سے بیٹھ کر بولی۔ ”مر جائے گا تو گھر لے جاؤں گی، کوئی مجھے قاتل ثابت نہیں کر سکے گا۔ میں کہوں گی، یہ پاگل پن میں ٹیکسی سے نکل کر بھاگ گیا تھا۔ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ بڑی تلاش کے بعد کسی ویران سے راستے کے کنارے مردہ ملا۔ تم اس کی لاش اسی ویرانے میں ڈال آؤ گے۔ میں ٹیکسی میں ادھر جاؤں گی۔ پھر فون کے ذریعے می کو اسی جگہ بلاؤں گی۔ انہیں یقین آجائے گا۔“

وہ گھور کر سرفراز کو دیکھ رہی تھی۔ بشارت نے کہا۔ ”بخدا، اس وقت تم بے حد خطرناک لگ رہی ہو۔“

”میں محسوس کر رہی ہوں۔ میں ابھی میں نہیں ہوں۔ میرے ابو کی روح میرے اندر سمائی ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ میں ایب نارمل ہوں۔ شاید یہ درست ہے۔ بیٹی کے

اندروں میں باپ سا جائے تو بیٹی اوپر سے نارمل اور اندر سے باپ ایب نارمل ہوتا ہے۔“

”مقتول باپ؟ کیا تمہارے ابو کو قتل کیا گیا تھا؟“

”ہاں قاتل یہ سانسے ہے۔ مجھ سے فضول سوالات نہ کرنا کہ کیوں قتل کی واردات ہوئی تھی۔ میں اپنی فیملی، سہیلی، ہمتا ضروری نہیں سمجھتی۔ بس اتنا ہی بہت ہے کہ یہ میرے قابو میں آگیا ہے۔ پہلے میں سے مار ڈالنا چاہتی تھی۔ پھر دماغ میں آیا کہ یہ مجھے پاگل خانے پہنچانا چاہتا تھا۔ پھر میں کیوں نہ اسے وہیں پہنچا دوں۔ میرے ابو کا قاتل زندہ رہے گا اور

اپنی بوٹیاں نوچتا رہے گا تو مجھے آسودگی حاصل ہوتی رہے گی۔“

وہ ایسی خواب ناک نظروں سے قاتل کو دیکھنے لگی جیسے آسودگی حاصل کر رہی ہو۔ پھر وہ بولی۔ ”میں چاہتی ہوں، یہ نہ مرے زندہ رہے۔ خدا اسے لمبی عمر دے۔ کوئی دشمن ایسی دعا نہیں دے گا! میں دے رہی ہوں۔“

”شائی! میرا ایک مشورہ مانو گی؟“

”بولو۔ آج میں بہت خوش ہوں۔“

”خوش تو ہو۔ مگر میں محسوس کر رہا ہوں کہ تمہارے اندر لاوا پک رہا ہے۔ ذرا ایزی فیل کرو۔ اب تو یہ قابو میں ہے۔ کیس جا نہیں سکے گا۔ اپنے اندر کے غصے کو کم کرو۔“

”ہاں، خوش بھی ہوں اور جوش میں بھی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ جنون میں آکر کوئی غلطی کروں۔ اسے زندہ رکھنے کے لیے اس کا خاص خیال رکھنا ہو گا۔ تم ابھی جاؤ اور روٹی سالن کے علاوہ تازہ پھل لے آؤ۔ اسے لین اسکو اکش پسند ہے۔ ایک بوتل وہ بھی لے آؤ۔ ہم اسے ٹھنڈی تاثیر والی غذا کیں دیں گے۔“

وہ جانے لگا۔ شائستہ نے کچھ سوچ کر آواز دی۔ ”ادھر آؤ۔“

وہ آگیا۔ اس نے پوچھا۔ ”کل اسی وقت تمہاری بیٹائی گئی تھی؟“

”ہاں، یہی وقت ہے۔“

”اور تم مرنے کے لیے پھر باہر جا رہے ہو؟ کچھ اپنی عقل سے بھی سوچ لیا کرو۔ باہر جا کر کسی مصیبت میں پڑو گے تو یہاں میں تنہا اس کی نگرانی نہیں کر سکوں گی۔ مجھے بہت سے پرائملز فین کرنے پڑیں گے۔“

وہ ہاتھ باندھے تابعداری میں کھڑا رہا۔ وہ اٹھ کر بولی۔ ”گاڑی کی چابی دو۔ یہاں قریبی دکانوں تک میں بھی ڈرائیو کر کے جاسکتی ہوں۔ تم اندر سے دروازہ بند رکھو اور اس کے قریب ہی رہو۔“

وہ چابی لے کر چلی گئی۔ بشارت نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر سرفراز کے پاس آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے اندر خوف سا رہا تھا۔ اس نے ہزاروں روپے کی آمدنی کے پیش نظر پہلی غلطی یہ کی کہ شائستہ کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے سرفراز کو پاگل بنا دیا۔ دوسری غلطی یہ کی کہ ایک کروڑ پتی کی بیٹی کے ساتھ بھاگ کر اغوا کا مجرم بن گیا۔ اب شائستہ کے تئیں بتا رہے تھے کہ وہ اسے سرفراز کا قاتل بھی بنا دے گی۔

اگرچہ وہ مہربان تھی، دریا دل تھی، ہزاروں روپے دے کر بھول جاتی تھی۔ یہ دریا دلی جاری رہے تو وہ لاکھوں روپے جمع کر لے گا لیکن جیل کا اور پھانسی کا راستہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ پریشان ہو کر سوچ رہا تھا کہ ان حالات میں کیا کرنا چاہیے؟

سیدھی سی بات تھی۔ شائستہ کو انتقامی کارروائی سے باز رکھنا چاہیے تھا لیکن وہ کہہ چکی تھی کہ وہ دراصل وہ نہیں ہے۔ اس کے اندر مقتول باپ سلایا ہوا ہے، وہ انتقام لینے سے باز آنے والی نہیں تھی۔

دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ ساتھ چھوڑ کر بھاگ جائے، اب تک اس نے ہیرا پھیری سے چالیس ہزار روپے جمع کیے تھے۔ اسی کو بہت سمجھ کر کنارہ کشی اختیار کر سکتا تھا لیکن شائستہ لاکھوں روپے کی چوری کا الزام عائد کر کے پولیس والوں کو اس کے پیچھے لگا سکتی تھی۔ پھر کم بنتی یہ تھی کہ بینائی اچانک ساتھ چھوڑ دیتی تھی۔ وہ کہیں بھی جاتا تو اندھا ہوتے ہی پکڑا جاتا۔ کچھ شائستہ نے اور کچھ تقدیر نے اسے نا دیدہ زنجیریں پسنادی تھیں۔

وہ ایک گھنٹے بعد کھانے پینے کا بہت سا سامان لے کر آگئی۔ اندر آتے ہی پہلے بشارت کی آنکھوں کو دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ”کوئی گڑبڑ ہوئی تھی؟“

”نہیں“ میں اچھی طرح دیکھ رہا ہوں اور یہ ابھی تک بے ہوش پڑا ہے۔“
وہ دونوں کھانے بیٹھ گئے۔ کھانے کے دوران کبھی کبھی سرفراز کی طرف دیکھتے رہے۔ بشارت نے کہا۔ ”بڑی طویل بے ہوشی ہے۔ کہیں اللہ کو پیارا نہ ہو جائے۔“
وہ بولی۔ ”ایسے لوگ اللہ کو پیارے نہیں ہوتے۔ حرام موت مرتے ہیں۔“

وہ کھانے کے بعد تھراس میں لائی ہوئی چائے پیتی رہی اور دشمن کو دیکھ کر سوچتی رہی۔ پھر اٹھ کر بولی۔ ”میں سونے جا رہی ہوں۔“
”ہاں، تم چلو، میں برتن دھو کر آتا ہوں۔“
”تم کیوں آؤ گے؟ کیا روز تمہیں چربی پڑھتی ہے؟ یہاں اس کے پاس کون رہے گا؟“

”ٹھیک ہے۔ میں اس کی نگرانی کروں گا۔ تم آرام کرو۔“
”اسے ہوش آنے کے بعد کچھ کھانے کو ضرور دینا، کھانے کے بعد سو جائے تو ٹھیک ہے۔ پریشان کرے تو مجھے جگا دینا۔“

وہ اپنی خواب گاہ کی طرف چلی گئی۔ وہ تھوڑی دیر تک بیٹھا رہا۔ شائستہ کے رویے پر کڑھتا رہا۔ بیویاں بھی شوہر کے رویوں پر کڑھتی ہیں پھر صبر کر کے گھر کے کام کے کام کاج میں لگ جاتی ہیں۔ اس نے بھی برتن دھوئے۔ پھل وغیرہ کو فریج میں رکھا، گھر کی صفائی کی پھر سرفراز والے کمرے میں آگیا۔ وہاں دو بیڈ ذرا فاصلے پر تھے۔ ایک پر سرفراز تھا۔ وہ زیر و پاور کا بلب آن کر کے باقی لائٹس بجھا کر دوسرے بستر پر آگیا۔

شائستہ اپنی خواب گاہ میں بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ نیند نہیں آرہی تھی۔ سوچ رہی تھی۔ ممی کیسٹ کے پاس گئی ہوں گی۔ وہاں دوائیں نہ ملنے پر سی بریز اسپتال کے ڈاکٹر کے پاس گئی ہوں گی، خاصی بھاگ دوڑ کے بعد دوائیں لے کر اپارٹمنٹ میں آئی ہوں گی۔ دروازے پر چپکی ہوئی وہ تحریر پڑھی ہوگی..... اور اب بے چینی سے میرے فون کا انتظار کر رہی ہوں گی۔“

وہ سلامت کی بیٹی بن کر سوچ رہی تھی، ماں اپنے دوسرے شوہر کے لیے زیادہ پریشان ہوگی۔ یا پہلے شوہر کو کھیتوں میں بھاگتے اور کھڑی فصل کے درمیان قتل ہوتے دیکھ کر روٹی ہوگی اور اگر رو کر صبر کیا ہوگا تو دوسرے شوہر کے لیے بھی صبر آجائے گا۔ بات اس پہلو سے نہیں تھی کہ ماں کو دوسری بار وہی صدمہ نہیں پہنچانا چاہیے۔ بات اس پہلو سے تھی کہ پہلے شوہر کے قتل پر احتجاج کیوں نہیں کیا۔ احتجاج تب نہیں کیا جاتا جب شکایت نہیں ہوتی، صدمہ نہیں ہوتا۔ پھر آج بھی صدمہ نہیں ہونا چاہیے۔
اس نے فون اٹھا کر رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے ماں کی آواز سنائی دی۔ وہ بولی۔

”ہیلو می! میں پبلک کال آفس سے بول رہی ہوں۔ پاپا اسپتال میں اب تک بے ہوش ہیں۔ ڈاکٹرز انہیں اینڈ کر رہے ہیں جیسے ہی ہوش میں آئیں گے میں آپ کو فون کروں گی۔“

”انہیں کون سے اسپتال لے گئی ہو۔ میں ابھی وہاں آؤں گی۔“

”آپ نہیں آئیں گی۔ آپ کو کراچی کے حالات کا علم ہے۔ یہاں آئے دن ہنگامے ہوتے رہتے ہیں۔ ایک گھنٹا پہلے یہاں قریب ہی زبردست دھماکا ہوا تھا۔ کوئی سیریس معاملہ ہے۔ فوج آگئی ہے، اس علاقے میں کرفو لگا دیا گیا ہے۔“

”بیٹی! وہ کون سا علاقہ ہے؟ کون سا اسپتال ہے؟ مجھے بتاؤ تو سہی۔“

”شائستہ نے فون کے مائیک پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ ”ہیلو می! آپ خاموش کیوں ہیں؟ کیا میری آواز نہیں آرہی ہے؟“

”ماں نے کہا۔ ”آواز بہت دھیمی ہو گئی ہے۔ ذرا زور سے بولو۔“

”ہیلو ہیلو۔ ادہ نان سنس، یہ فون کو کیا ہو گیا ہے، بالکل آواز نہیں آرہی ہے۔ مسٹر! آپ لوگ پبلک کال آفس کھول کر بیٹھ جاتے ہیں اور فون صحیح نہیں رکھتے۔ اب اس کرفو میں کہاں جا کر فون کروں۔ میری می پریشان ہوگی۔ نان سنس۔“

یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ اس چالاکی سے ماں کو یہ اطمینان دلایا کہ سرفراز اسپتال میں ہے اور ڈاکٹرز اس پر توجہ دے رہے ہیں۔ پھر فون کی خرابی کا بہانہ کر کے اسپتال اور علاقے کا نام بتانے سے کترا گئی۔ اس کے بھی دل کو اطمینان ہوا کہ ماں اب زیادہ پریشان نہیں ہوگی۔ صبر سے صبح کا انتظار کرے گی۔

وہ تھکے ہوئے انداز میں لیٹ گئی۔ ایک بار انگڑائی لی، پھر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ عجیب سی بے چینی تھی۔ وہ کبھی انگلیاں پچھانے اور کبھی جسم کو کھینچنے، سیکنے، توڑنے اور موڑنے لگی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ بدن دکھ رہا ہے، دوا مانگ رہا ہے لیکن وہ اسے بلانا نہیں چاہتی تھی۔ زیادہ مطلوب رہنے سے مرد سرچڑھ جاتے ہیں۔ انہیں تڑپانے ذرا ترسانے اور آئندہ کبھی وصال کی امید دلائے رکھنے سے اپنی قدرو قیمت بڑھتی رہتی ہے۔ لہذا اس نے اسے سرفراز کی چوکیداری کے لیے چھوڑ دیا، پھر سونے کی کوشش کرتے کرتے آخر سوئی گئی۔

دوسرے کمرے میں بشارت کی بھی آنکھ لگ گئی تھی۔ اسے اطمینان تھا کہ سرفراز ہوش میں آنے کے بعد بستر سے اٹھ نہیں سکے گا۔ اس کے دونوں ہاتھ پلنگ کے دونوں طرف کی پٹیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ نیند آتی ہے تو آدمی نیم مردہ سا رہتا ہے۔ آدمی موت اور آدمی زندگی گزارتا ہے۔ یوں حساب کیا جائے تو انسان اپنی آدمی زندگی سوتے سوتے گزار دیتا ہے۔

رات گزر گئی صبح کی اذان ہونے لگی۔ اس وقت سرفراز کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکلی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ ذرا کسمارہا تھا۔ پھر کراہتے ہوئے دونوں مٹھیاں بند کرنے اور کھولنے لگا۔ شاید ہاتھوں کے بندھے رہنے سے تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ پھر اس کے ہاتھ ساکت ہو گئے۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد وہ دائیں بائیں سر ہلانے لگا۔ تکلیف سے کراہنے لگا۔ پھر بڑی دیر تک بے چینی میں جتلا رہنے کے بعد اس نے ذرا سی آنکھیں کھولیں۔ دھندلی دھندلی سی دیوار اور مونا لیزا کی ایک تصویر نظر آئی۔ اس نے پوری طرح آنکھیں کھول کر دیکھا۔ زیر و پاؤر کی روشنی میں ایک بکرا دکھائی دیا۔ باہر صبح روشن نہیں تھی۔ اندر رات کا سا سماں تھا۔ اس نے سر گھما کر دائیں پھر بائیں دیکھا۔ بائیں طرف ایک بستر پر کوئی سو رہا تھا۔

یہ سب کچھ ایک خواب سا لگ رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ کہ کہاں ہے؟ اس کمرے میں کیوں ہے؟ اور وہ دو سرا شخص کون ہے؟ دماغ بو جھل سا ہو رہا تھا، اس نے سر پکڑنے کے لیے ہاتھوں کو اٹھانا چاہا تو دونوں ہاتھ ہل کر رہ گئے۔ ہاتھ کیوں نہیں اٹھ رہے ہیں، یہ دیکھنے کے لیے اس نے اٹھنا چاہا۔ سر ذرا سا اٹھا، پھر تکیے پر گر پڑا۔ سر میں بہت تکلیف تھی۔ بہت دکھ رہا تھا۔ وہ کراہنے لگا۔ اس کے منہ سے ہاں، ہاں، آہ، آہ کی آوازیں نکل رہی تھیں اور کمرے میں دھیرے دھیرے گونجتی جا رہی تھیں۔

یہ آوازیں بشارت کے کانوں میں پہنچیں تو وہ نیند میں کسمایا پھر اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ ایک لمحے کو وہ زیر و پاؤر کا بلب دکھائی دیا۔ پھر بجھ گیا، گہری تاریکی چھا گئی۔ وہ ایک دم سے ڈر گیا۔ دماغ نے چیخ کر کہا۔ بلب نہیں بجھا۔ آنکھیں بجھ گئی ہیں۔ ایسا ہوتا ہے سوچ آن کرو تو وہ ایک ساعت کے لیے روشن ہو کر ہمیشہ کے لیے بجھ جاتا ہے۔ پھر وہ روشنی نہیں دیتا۔ کمرے کو روشن کرنے کے لیے فیوز اوڑنے والے بلب کو ہٹا کر دوسرا

بلب لگانا پڑتا ہے اور دنیا کو روشن دیکھنے کے لیے فیوز اڑنے والی آنکھوں کو ہٹا کر دوسری آنکھیں لگانی پڑتی ہیں۔

وہ گہری تاریکی میں سرفراز کی کراہیں سن رہا تھا اس نے پوچھا۔ ”تم ہوش میں آگئے؟“

”ہوش میں؟“ سرفراز نے پوچھا۔ ”کیا میں بے ہوش تھا؟ مجھے کیا ہوا تھا؟“
”کچھ نہیں، کچھ نہیں ہوا تھا۔ یہ اچھا ہوا کہ بجلی چلی گئی، تاریکی چھا گئی، تم مجھے نہیں دیکھ سکتے؟ کیا میری آواز سے مجھے پہچان رہے ہو؟“
”میں تمہیں نہیں دیکھ سکتا؟ بجلی چلی گئی ہے؟ کیا تم پاگل ہو یا اندھے؟ بجلی تو ہے، میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔“

بشارت کے دماغ کو جھٹکا سا لگا۔ دنیا نہیں سمجھی تھی۔ آنکھیں بھیجی تھیں اور وہ بھی دشمن کے سامنے، اگرچہ اسے بینائی کے سلسلے میں زیادہ تشویش نہیں تھی۔ یہ کئی برس کا تجربہ تھا، بینائی جاتی تھی پھر چند منٹوں میں یا چند گھنٹوں میں واپس آجاتی تھی۔ لیکن وہ سرفراز کے سامنے اپنی یہ کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ بولا۔ ”نہ میں اندھا ہوں، نہ پاگل۔ میں تو مذاق کر رہا تھا بھلا مجھ جیسے آنکھ والے کو یہ بجلی کی روشنی کیوں نظر نہیں آئے گی۔“

وہ پھر کراہنے لگا۔ پریشان ہو کر کہنے لگا۔ ”آہ! ایسا لگتا ہے جیسے میرا سر نہیں ہے۔ میں چھو کر دیکھنا چاہتا ہوں مگر میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ تم بتاؤ کیا میرا سر موجود ہے؟“

وہ اندھی آنکھوں سے گھورتے ہوئے بولا۔ ”صاف نظر آرہا ہے، تمہارا سر تمہارے شانے پر موجود ہے۔ کیا تم اپنے حواس میں نہیں ہو؟ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ سر نہ ہوتا تو کیسے سوچتے، کیسے بولتے اور کیسے دیکھتے؟“

”ہاں، تم سمجھا رہے ہو تو سمجھ میں آرہا ہے۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ تمہیں کہیں دیکھا ہے۔ تمہاری آواز بھی کچھ جانی پہچانی ہے۔ جیسے ابھی تم نے سمجھایا تھا، ویسے ہی پھر سمجھاؤ تو تمہیں پہچان لوں گا۔“

بشارت نے تاریک خلا میں تکتے ہوئے سوچا۔ ”اس کی باتوں سے ظاہر ہو رہا ہے

کہ یہ مجھے نہیں پہچان رہا ہے یقیناً دوا کے اثر سے حافظہ کمزور ہو گیا ہے۔ شائستہ نے کہا تھا۔ یہ ہوش میں آئے تو اسے کچھ ضرور کھانا پلانا مگر میں یہ خدمت کیسے انجام دوں، شائستہ کو جگانا ہوگا۔“

سرفراز نے پوچھا۔ ”اے بھائی! خاموش کیوں ہو؟ مجھے بتاؤ تم کون ہو؟“
”بتاؤں گا۔ پہلے آنکھیں بند کرو۔ پھر جب تک میں نہ کہوں آنکھیں نہ کھولنا۔“
”آنکھیں بند کرنے سے کیا ہوگا؟“
”میں اپنے بارے میں بتاؤں گا تو تم آنکھیں بند کر کے یاد کرو گے پھر مجھے پہچان لو گے۔“

”اچھا یہ لو، میں آنکھیں بند کر رہا ہوں۔“
بشارت نے سوچا۔ وہ آنکھیں بند کر چکا ہے۔ اسے اندھے کی طرح چلتے نہیں دیکھے گا۔ وہ بستر سے اتر گیا۔ اندازے سے راستہ ٹٹولتے ہوئے دروازے تک آگیا۔ پھر دروازے کے باہر دیوار کا سہارا لیتے ہوئے شائستہ کے دروازے پر پہنچا۔ پھر اس نے دستک دی۔ وہ ایک دستک پر جاگئے والی نہیں تھی۔ کئی بار دستک دینے کے بعد اس کی نیند بھری آواز سنائی دی۔ ”کیا مصیبت ہے؟ کیوں آئے ہو؟“
”وہ ہوش میں آگیا ہے۔“

”تو کیا ہوا؟ کیا اسے سنبھال نہیں سکتے؟ مجھے ذرا سونے دو۔“
”پلیز، دروازہ کھول کر میری ایک بات سن لو۔ بہت ضروری بات ہے۔“
وہ ناگواری سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر بیڑ پڑاتی ہوئی بستر سے اتر کر آئی۔ دروازہ کھول کر سخت لمبے میں بولی۔ ”کیا قیامت آگئی ہے۔ کیا بلکنا چاہتے ہو، جلدی بکو۔“

وہ جمہائی لینے لگی۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”وہ۔ وہ میری بینائی.....“
اس نے آگے نہیں کیا۔ اتنا ہی کہنا کافی تھا۔ اس کی نیند اڑ گئی۔ اس نے چونک کر اس کی آنکھوں کو دیکھا۔ پھر دانت پیس کر بولی۔ ”تمہیں کس وقت موت آ رہی ہے۔ تمہارا اندھا ہونا اور مرنا ایک برابر ہے۔ میں بالکل اکیلی ہو جاؤں گی۔“

”پلیز صبر کرو۔ ہمیشہ کی طرح تھوڑی دیر بعد بینائی لوٹ آئے گی۔ سرفراز کے پاس جانے سے پہلے سن لو، اس کا حافظہ کمزور ہو گیا ہے۔ اس نے مجھے نہیں پہچانا ہے۔ وہ کسی

بھی بات کو اچھی طرح سمجھ نہیں پا رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے، تم میرے کمرے میں جاؤ۔ خبردار باہر نہ نکلتا۔“

وہ تیزی سے چلتی ہوئی دوسرے کمرے میں آگئی۔ اب دن کی ہلکی ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی۔ سرفراز آنکھیں بند کیے بستر پر پڑا تھا اور پوچھ رہا تھا۔ ”تم بولتے کیوں نہیں؟ میں کب تک آنکھیں بند رکھوں گا۔“

شائستہ نے زیر و پاؤر کے بلب کو بجھایا پھر کھڑکی کے پردے کو سرکایا۔ کمرے کی چار دیواری میں دن نکل آیا۔ وہ سامنے آکر اسے دیکھنے لگی۔ سرفراز کسی اندھے کی طرح آنکھیں بند کیے ہوئے تھا۔ ایک خیال اچانک ہی بجلی کی طرح لپکا۔ ”اگر یہ اندھا ہو جائے اور اس کی آنکھیں بشارت کو مل جائیں.....“

انتقام کے اندھے آسمان پر برق لہرائی۔ ادھر سے لپکی، ادھر گئی اور شائستہ کے ذہن کو گرما گئی۔ ایک نیا آئیڈیا، ایک نیا دلولہ پیدا ہو گیا، وہ تیزی سے سوچنے لگی۔ ”ایسا ممکن ہے، ایسا ہو سکتا ہے۔ میں اس منصوبے پر اچھی طرح غور کروں گی تو یہ ضرور قابل عمل ہو گا۔“

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے کہا۔ ”اب میں انتظار نہیں کروں گا“ میں آنکھیں کھول رہا ہوں۔ دیکھو آنکھیں کھول رہا ہوں۔“

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ پھر چونک کر شائستہ کو دیکھا۔ حیران ہو کر بولا۔ ”نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم ابھی مرد تھے، عورت کیسے بن گئے؟“

شائستہ کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی وہ بولی۔ ”وہ مرد باہر گیا ہے میں آپ کے پاس آئی ہوں۔“

”تم کون ہو؟ یہ سوچ کر میرا سرد دکھ رہا ہے کہ میں خود کون ہوں، کیا تم میری کوئی مدد کرو گی؟“

”ہاں“ آپ میرے پیلا ہیں۔ میرے باپ ہیں۔ میں آپ کی بیٹی شائستہ ہوں۔“

وہ آنکھیں پھاڑ کر بولا۔..... ”شائستہ! ہاں ہاں، میں نے پہچان لیا تم میری بیٹی ہو۔ میں نے تمہیں کئی بار دیکھا ہے، کہاں دیکھا ہے؟ کچھ اور بتاؤ۔“

”میں تمام باتیں یاد دلاؤں گی لیکن آپ سوچ سوچ کر ذہن کو نہ تھکائیں۔ آپ کل

سے بھوکے ہیں۔ میں پہلے کچھ کھلاؤں گی۔ بھوک لگ رہی ہے نا؟“

”ہاں، کچھ ایسا لگ رہا ہے۔ شاید بھوک کی وجہ سے لگ رہا ہے۔“

”میں ابھی کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔“

وہ اس کمرے سے نکل کر اپنی خواب گاہ میں آئی۔ اس کی آنکھوں کو دیکھ کر بولی۔ ”نظر آ رہا ہے؟“

وہ پریشان ہو کر بولا نہیں۔ میں دعا مانگ رہا ہوں۔ بیٹائی آجائے گی۔“

”کیا ولی اللہ ہو کہ دعا قبول ہو جائے گی؟ تم کھانا گرم کرنے اور چائے بنانے کے قابل بھی نہیں رہے۔ میں نے زندگی میں کبھی چولہا نہیں جلایا۔ آج یہ بھی کرنا ہو گا۔ تمہارے جیسے ہڈ حرام کی وجہ سے اور نہ جانے کیا کیا کرنا پڑے گا۔“

وہ بڑبڑاتی ہوئی کچن میں آئی۔ فریق سے رات کا سالن نکال کر گرم کرنے لگی۔ وہ مضبوط قوت ارادی کی مالک تھی۔ غصے کے باوجود سوچ رہی تھی کہ اسے غصہ آ رہا ہے اور یہ اچھی بات نہیں ہے۔ ٹھنڈے دماغ سے سوچنا ہو گا اور بڑی احتیاط سے عمل کرنا ہو گا۔ سرفراز کو بھولی ہوئی کچھ باتیں یاد دلانا چاہیے اور کچھ چھپانا چاہیے اسے بالکل اپنا بنانے سے ہی کام بنے گا۔

وہ ایک ٹرے میں گرم دودھ گرم سالن اور ڈبل روٹی کے سلائس لے کر آئی، اسے ایک طرف رکھ کر اس کے بندھے ہوئے ہاتھوں کو کھولتے ہوئے بولی۔ ”کل آپ پر دورہ پڑا تھا۔ آپ بہت جنون میں تھے۔ اس لیے باندھا گیا تھا۔ کیا آپ ہاتھ روم جائیں گے۔“

”نہیں، یہ کھانے کی منک اچھی لگ رہی ہے، پلیز مجھے دو۔“

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کراہنے لگا۔ ”آہ! پتا نہیں، سر کیوں دکھ رہا ہے۔“

”میں سر کی ماس کروں گی۔ درد دور ہو جائے گا۔ پہلے آپ کھالیں۔“

اس نے ٹرے سامنے رکھ دی۔ وہ جھک کر جلدی جلدی کھانے لگا۔ شائستہ نے کہا۔ ”آپ کا نام ملک سرفراز خان ہے۔ آپ رشیدہ ٹیکسٹائل ملز کے مالک ہیں۔ رشیدہ آپ کی وائف یعنی میری ماما کا نام ہے۔ آپ کی ایک بیٹی شازیہ بائیس برس کی ہے اور

ایک بیس برس کا بیٹا زیر ہے۔

وہ ایک ایک بات یاد دلا رہی تھی اور اس کے سوالوں کے جواب میں کہہ رہی تھی کہ بیوی اور دو بچے لاہور میں ہیں۔ اسے علاج کے سلسلے میں کراچی لایا گیا ہے۔ اس کی وائف رشیدہ دو چار دنوں میں یہاں آنے والی ہے۔

کھانا ختم ہونے اور دودھ پینے تک اس نے بہت سی باتیں یاد دلائیں۔ چونکہ بھولا ہوا سبق تھا۔ اس لیے یاد آتا گیا۔ وہ جھوٹے برتن اور ٹرے اٹھا کر کچن میں جاتے ہوئے بولی۔ ”آپ ہاتھ روم جائیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔“

اس نے کمرے سے نکل کر دروازے کو باہر سے بند کر دیا تاکہ وہ اس کے لاعلمی میں مکان سے باہر نہ جاسکے۔ اس نے ٹرے کچن میں رکھی۔ پھر خواب گاہ میں آکر بشارت کے کھلے ہوئے دیدوں کو دیکھ کر کہا۔ ”مجھ گئی ابھی تک سو داس ہو۔ جی چاہتا ہے‘ تمہارا سر توڑ دوں۔“

”میری ایک درخواست ہے۔ وہ ہوٹل والی تدبیر آزماؤ۔“

”کون سی تدبیر؟“

”وہی طمانچے والی۔ ایک زور دار طمانچہ مارو۔ اللہ نے چاہا تو آنکھیں روشن جائیں گی۔“

”بکواس مت کرو۔ طمانچوں سے بینائی ملتی تو یہ آئی بینک نہ کھلتے۔ لوگ اندھوں کو طمانچے مار کر ثواب کماتے۔ جانتے ہو‘ میں نے تمہاری لیے کیا سوچا ہے؟“

”خدا بھلا کرے گا اندھے لاچار کے لیے کچھ اچھا ہی سوچو۔“

”میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔ دشمن کی آنکھیں تمہیں دینا چاہتی ہوں۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں۔“

”آئی بینک والوں نے کہا تھا‘ کہیں سے آنکوں کا عطیہ ملے گا تو تمہیں وہ آنکھیں مل جائیں گی۔“

”ہاں‘ انہوں نے کہا تھا پھر؟“

”پھر یہ کہ سرفراز یہ عطیہ دے گا۔“

”کیا کہہ رہی ہو؟ وہ راضی کیسے ہوگا؟“

”وہ اپنے حواسوں میں نہیں ہے۔ میں اسے جدھر گھماؤں گی‘ وہ ادھر ہی چل پڑے گا۔“

”میں نہیں جانتا‘ تم اس مقصد میں کہاں تک کامیاب ہو سکو گی۔ لیکن اتنا جان گیا ہوں کہ تم مجھے دل و جان سے چاہتی ہو اور میری بھلائی کے لیے ایسی چالیں چل رہی ہو۔“

وہ ایک آئی بینک میں بشارت کا نام درج کرا چکی تھی۔ وہاں عطیے کے طور پر دس ہزار روپے دیے تھے۔ اس نے آئی بینک کے کاغذات اور رسید نکال کر دیکھی۔ فون نمبر نوٹ کیا پھر اس نمبر پر رابطہ کیا۔ کسی خاتون نے اٹینڈ کیا۔ شائستہ نے کہا۔ ”میں آئی بینک کے انچارج ڈاکٹر سے بات کرنا چاہتی ہوں اگر انہوں نے ملاقات کی زحمت کی تو میں عطیے کے طور پر ایک لاکھ روپے پیش کروں گی۔“

”ہم آپ کے نیک جذبے کی قدر کرتے ہیں‘ آپ نام بتائیں۔ ڈاکٹر صاحب دس بجے آتے ہیں۔ آپ گیارہ بجے تشریف لاسکتی ہیں۔“

شائستہ نے اپنا نام اور بشارت کا کیس نمبر نوٹ کرایا۔ پھر فون کو آف کر کے بولی۔ ”میں ان مرحلوں سے کسی نہ کسی طرح گزر جاؤں گی۔ صرف ممی کی فکر ہے‘ انہیں کسی طرح دو چار دنوں تک ٹالنا ہوگا۔ یہ مرحلہ بہت مشکل ہے۔ وہ کوئی گڑبڑ کر سکتی ہیں۔“

وہ اپنے سر پر گھونے مارتے ہوئے بولا۔ ”لعنت ہے مجھ پر۔ تم میری خاطر اتنی پریشانیاں اٹھا رہی ہو اور میں بے دست و پا ہو کر بیٹھا ہوا ہوں۔“

”کیوں سر پر گھونے مار رہے ہو۔ دماغ کی کسی رگ کو چوٹ پہنچے گی تو آنے والی بینائی کا سلسلہ ٹوٹ سکتا ہے۔ خاموش بیٹھے رہو میں ابھی آؤں گی۔“

وہ سوچتی ہوئی خواب گاہ سے نکلی۔ پھر دوسرے کمرے کا دروازہ کھول کر سرفراز کے پاس آئی۔ وہ ہاتھ روم سے باہر آ رہا تھا اس نے کہا۔ ”پاپا! آپ کو یاد ہے‘ آج ایک ڈاکٹر سے ملاقات کا وقت مقرر ہے۔“

وہ کرسی پر بیٹھ کر سوچتے ہوئے بولا۔ ”میرا حافظہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ تم نہ ہوتیں تو میں اندھیروں میں بھٹکتا رہتا۔ بائی دے دے ڈاکٹر سے کیوں ملتا ہے؟“

وہ سامنے ایک کرسی پر بیٹھ کر بولی۔ ”ممی ہوتیں تو آپ کو تفصیل سے بتائیں۔“

مختصر آ یہ سمجھ لیں کہ ماضی میں آپ نے ایک بہت بڑا جرم کیا تھا۔ ایک شخص کو قتل کیا تھا۔

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ”نہیں، میں نے کسی کو قتل نہیں کیا ہے۔“
”میں آپ سے اقرار نہیں کرانا چاہتی تھی۔ می نے رشوتیں دے کر قتل کے جرم پر پردہ ڈال دیا ہے۔ آپ کبھی قانونی گرفت میں نہیں آئیں گے لیکن وعدہ کریں کہ آپ کسی ڈاکٹر وغیرہ کے سامنے ایسی واردات کا ذکر نہیں کریں گے۔“
”میں کسی سے ذکر نہیں کروں گا لیکن مجھے کچھ یاد دلاؤ۔“

”آپ یاد کریں۔ برسوں پہلے آپ میرے نانا مالک جان محمد کے ساتھ لاہور آئے تھے۔ سلامت نامی ایک ڈرائیور ہمارے خاندان کی ایک لڑکی کو بھگا کر لے گیا تھا۔ آپ نے غنڈوں کی مدد سے اس ڈرائیور کو پکڑا۔ پھر اسے کھیتوں میں لے گئے۔ وہاں گندم کی کھڑی فصلوں کے درمیان آپ نے اسے گولی مار دی۔“

وہ پوری تفصیل سے وہ واقعہ سنا رہی تھی۔ سرفراز کے حافظے میں گزرے ہوئے مناظر جھلک رہے تھے۔ لاہور کا وہ جنرل پوسٹ آفس، فیصل آباد جانے کا راستہ، پھر کچے راستے پر مڑ کر میلوں دور کھیتوں کے درمیان جانا اور کسی کو گولی مارنا، یہ تمام سچویشن بالکل وہی جھلکیاں پیش کر رہی تھیں۔

وہ سر ہلا کر بولا۔ ”ہاں، کچھ یاد آرہا ہے۔ ایسی واردات ہو چکی ہے۔“
”پاپا! آپ بہت حساس ہیں۔ قتل کرنے کے بعد پچھتاتے رہے، کبھی نیند سے چونک کر اٹھ جاتے تھے۔ کبھی بہت زیادہ شراب پی کر بہکنے لگتے تھے۔ اس طرح آپ رفتہ رفتہ ذہنی مریض بن گئے۔ آخر ایک بات آپ کے ذہن میں نقش ہو گئی۔ آپ نے فیصلہ کیا کہ کفار ادا کریں گے۔ ایسی نیکی کریں گے جو آپ کی وفات کے بعد بھی دنیا میں رہے گی۔“

”ہاں بیٹی! میں نے اپنی دنیا خراب کی، عاقبت خراب نہیں کروں گا۔ میں ضرور نیکی کروں گا۔“

”آپ نے فیصلہ کیا تھا کہ آپ آئی بینک والوں کو اپنی آنکھوں کا عطیہ دیں گے۔“
وہ گھبرا کر بولا۔ ”کیا میں نے اندھا ہونے کا فیصلہ کیا تھا؟“

”نہیں پاپا! آپ کے دشمن اندھے ہوں۔ آپ بھول رہے ہیں، کسی زندہ انسان کی آنکھیں نہیں نکالی جاتی ہیں۔ مرنے کے بعد وہ آنکھیں کسی ضرورت مند کو دی جاتی ہیں۔ آپ صرف یہ لکھ کر اپنے دستخط کریں گے کہ آپ کی وفات کے بعد یہ نیکی کی جائے۔“
”ہاں، ایسی نیکی کی جاسکتی ہے۔ میں یہ نیکی کروں گا۔“

”یہ نیکی تو آپ کی وفات کے بعد ہوگی۔ ہم سب آپ کی لمبی عمر کی دعا مانگتے رہتے ہیں۔ لیکن آج آپ..... زندگی میں ایک اور نیکی کرنے والے ہیں۔ آپ آئی بینک والوں کو ایک لاکھ روپے دیں گے تاکہ غریب نابینا لوگوں کو آنکھوں کی روشنی ملتی رہے۔“
”بیٹی! یہ تو بہت بڑی نیکی ہے مگر اتنی بڑی رقم کہاں ہے؟“

”آپ نے مجھے رکھنے کو دی تھی۔ وہ ایک لاکھ میرے پاس ہیں۔ ہم آج گیارہ بجے اس ڈاکٹر سے ملاقات کریں گے اور آپ یہ رقم اسے پیش کریں گے۔“

اسی وقت بشارت کی آواز سنائی دی۔ شائستہ نے ادھر دیکھا۔ وہ دروازے پر کھڑا خوشی سے دونوں بازو پھیلائے کہہ رہا تھا۔ ”شائی! آئی ایم آل رائٹ۔“

وہ بھی خوش ہو گئی۔ سر سے ایک بوجھ اتر گیا۔ وہ مسکرا بولی۔ ”پاپا! آپ نے اسے پچھانا؟ یہ میری خالہ کا بیٹا، آپ کا بھانجا بشارت ہے۔ بشارت، انکل کو سلام کرو۔“

اس نے سلام کیا۔ سرفراز نے کہا۔ ”وعلیکم السلام تم اسی کمرے میں سو رہے تھے۔ پہلے کیوں نہیں بتایا کہ میرے بھانجے ہو؟“

”انکل! آپ یقین نہیں کرتے۔ آپ صرف شائستہ کی باتیں مانتے ہیں اور ہر معاملے میں اس پر بھروسہ کرتے ہیں۔“

”پاپا! آپ کو یہ تو یاد ہو گا کہ بشارت کی آنکھیں خراب ہیں اور کسی وقت بھی بینائی جاسکتی ہے۔“

سرفراز نے کہا۔ ”اوہ سویڈ، اس جوانی میں آنکھیں بیکار ہو رہی ہیں۔ بیٹی! کیوں نہ میں اپنی آنکھوں کا عطیہ اس کے نام کر دوں؟“

وہ ہنس کر بولی۔ ”آپ کو تو یاد نہیں رہتا۔ آپ یہ فیصلے پہلے ہی سنا چکے ہیں۔ بشارت، ہم ٹھیک ساڑھے نو بجے یہاں سے نکلیں گے۔ قریبی مارکیٹ سے پاپا کے لیے نئے جوتے اور ریڈی منیڈ سوٹ خریدیں گے۔ پھر پاپا یہاں آکر چیئنج کریں گے اس کے بعد ہم

آئی بینک جائیں گے۔

”بیٹی! کیا گھر میں میرے کپڑے اور جوتے نہیں ہیں؟“

”میں آپ کو بہت سی باتیں یاد دلاؤں گی تو آپ کا سر دکھنے لگے گا۔ ہم ٹرین میں سفر کر رہے تھے۔ آپ پر دورہ پڑا تھا، آپ نے پورا سوٹ کیس اٹھا کر ٹرین سے باہر پھینک دیا تھا۔ آپ ابھی زیادہ سوالات نہ کریں۔“

بشارت کی بینائی لوٹ آنے سے شائستہ کی بہت سی مشکلیں آسان ہو گئی تھیں۔ وہ پروگرام کے مطابق سرفراز کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر مارکیٹ گئی۔ بشارت نے ڈرائیور کے فرائض انجام دیے۔ مارکیٹ سے سرفراز کی ضرورت کی چیزیں خرید کر وہ گھر واپس آئے۔ سرفراز نے شیو کیا۔ نیا لباس اور جوتے پہنے پھر وہ مقررہ وقت پر آئی بینک پہنچ گئے۔

وہاں کے انچارج اور آئی اسپیشلسٹ وغیرہ نے شائستہ کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ انچارج نے کہا۔ ”مس شائستہ آپ ہیں، آپ تین دن پہلے اپنے ان کزن کے ساتھ آئی تھیں، ان کا نام ویننگ لسٹ میں درج کرایا تھا اور دس ہزار کا عطیہ دیا تھا۔“

وہ بولی۔ ”جی ہاں، آج اپنے والد صاحب کے ساتھ آئی ہوں۔ یہ میرے پاپا ہیں۔“ انچارج نے ہاتھ بڑھایا۔ سرفراز نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ملک سرفراز کہتے ہیں۔ آپ کی خدمت میں یہ حقیر سی رقم پیش کرنے آیا ہوں۔“

شائستہ نے اسے جیسے سکھایا تھا وہ ویسے ہی بول رہا تھا۔ اس نے ایک کانڈ میں لپی ہوئی نوٹوں کی گڈیاں پیش کیں۔ پھر کرسی پر بیٹھ کر کہا ”میں ایک گناہ گار بندہ ہوں۔ خدا سے ڈرتا ہوں۔ اس لیے زندگی میں اور زندگی کے بعد نیکیاں کمانا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میری موت کے بعد میری آنکھوں کا عطیہ قبول کریں گے؟“

وہ اتنی بڑی رقم دے رہا تھا۔ اپنی آنکھوں کا عطیہ پیش کر رہا تھا۔ وہاں سب ہی اس کے نیک جذبوں کی تعریفیں کرنے لگے۔ انچارج نے کہا۔ ”آپ آنکھوں کے عطیے کے سلسلے میں یہ فارم پر کر کے دستخط کر دیں۔ آپ کے سب سے قریبی عزیزوں کی گواہی لازمی ہے۔ دو یا دو سے زائد رشتے دار اس فارم پر دستخط کریں گے اور آپ سب اپنے شناختی کارڈز کی کاپیاں اس سے منسلک کریں گے۔“

شائستہ نے فارم پُر کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اور میری امی دستخط کریں گی۔ امی لاہور سے آنے والی ہیں، میں انہیں یہاں لے آؤں گی۔“

اس فارم میں آنکھوں کا عطیہ کسی خاص شخص کے نام کرنے یا نہ کرنے کے متعلق پوچھا گیا تھا۔ شائستہ نے اس میں بشارت کا نام اور کیس نمبر درج کر دیا۔ پھر سرفراز کے دستخط کے بعد اپنے دستخط کیے۔ انچارج نے بشارت کے بھی دستخط کرائے۔ بڑی حکمت عملی سے یہ مرحلہ طے ہو گیا۔ پھر وہاں سے واپس آتے ہوئے راستے میں خوب ہنستے بولتے رہے۔ ایک ریسٹوران میں لچ کیا۔ آکس کیم کھائی۔ سرفراز کو پھلوں کا جوس پلایا گیا تاکہ اس کا پیٹ اور دماغ ٹھنڈا رہے پھر وہ گھر واپس آ گئے۔

سرفراز نے بستر پر تھکے ہوئے انداز میں لیٹتے ہوئے کہا۔ ”میں نے بہت انجوائے کیا ہے اور نیکیاں بھی کی ہیں۔ بیٹی! تم بہت اچھی ہو۔“

”پاپا! آپ تھک گئے ہو۔ آرام سے سو جائیں، شام کو گھونٹنے چلیں گے۔“

”بیٹی! تمہاری امی سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔“

”آج رات کو کسی وقت ان کا فون آئے گا پلیز ابھی آرام کریں، میں بھی سونے جا رہی ہوں۔“

وہ بشارت کو اس کے پاس چھوڑ کر اپنی خواب گاہ میں آئی۔ دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر موبائل فون اٹھا کر بستر پر آکر لیٹ گئی۔ اسے بھی جھکن سی ہو رہی تھی۔ صبح عادت کے خلاف جلدی بیدار ہو گئی تھی اس لیے نیند آ رہی تھی لیکن سو نہیں سکتی تھی۔ بہت سے کام پڑے تھے۔ ماں کی طرف سے زیادہ پریشانی تھی کہ وہ کامیابی کو ناکامی میں نہ بدل دے۔

اس نے فون کو آن کیا۔ پھر نمبر ڈائل کیے۔ رابطہ قائم ہوتے ہی رشیدہ کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو شائستہ! کیا تم ہو؟“

وہ رک رک کر بولی۔ ”ہاں میں، میں ہوں۔“

”تم کل سے کہاں ہو؟ فکر اور اندیشوں سے جان نکلی جا رہی ہے۔ تمہارے پاپا کیسے ہیں؟“

”ممی! رمضان کی کہاں ہے؟“

”رمضانی سے تمہیں کیا لیتا ہے۔ میری بات کا جواب دو۔“

”آپ کیوں چیخ رہی ہیں۔ اپنا جوش اپنی آواز کم کریں۔ پہلے رمضانی کو اپارٹمنٹ سے باہر بھیج دیں۔ میں نہیں چاہتی کہ ہماری کوئی بات اس کے کانوں میں پڑے۔“

”رمضانی بازار گیا ہے۔ اس رازداری کا مطلب کیا ہے؟“

”آپ باہر والا دروازہ اندر سے بند کر لیں اور یاد رکھیں، آپ ذرا بھی چیخنا چلانا چاہیں گی تو میں فون بند کر دوں گی۔ آپ پولیس میں رپورٹ لکھوائیں کہ سوتیلی بیٹی نے سوتیلے باپ کو اغوا کیا ہے۔ آپ کی حماقت سے پولیس والے ہمارے معاملے میں آئیں گے تو پھر گڑے مودے اکھاڑے جائیں گے۔ میں قانون کی گرفت میں آنے سے پہلے اپنے باپ کے قاتل کو قتل کروں گی۔“

رشیدہ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ گھر لوٹ آنے والی بیٹی پھر دشمنی پر اتر آئے گی۔ بیٹی کہہ رہی تھی۔ ”ممی! ابھی بات بگڑی نہیں ہے، صرف ہمارے درمیان ہے۔ میں دشمنی کو اپنی گردن میں پھانسی کے پھندے تک لے جاؤں گی۔ آپ ماں کے رشتے کو کہاں تک نبھیں گی، یہ آپ اچھی طرح سوچ لیں۔“

وہ چیخنا بھول گئی۔ التجا آمیز لہجے میں بولی۔ ”میری اچھی بیٹی! میری جان! تم تو اپنے کپے پر بچھتا رہی تھیں۔ کیا پھر تم پر دورہ پڑ رہا ہے؟“

”میں پاگل نہ تھی، نہ ہوں۔ اگر دشمن سے انتقام لینا پاگل پن ہے تو پھر مجھ سے بڑے پاگل میرے نانا جان تھے۔ سرفراز تھا اور آپ تھیں کہ اپنے پہلے شوہر کو ان پاگلوں کے حوالے کر دیا تھا۔“

”تم طعنے دے لو۔ مکرانا تاتا دو، تمہارے پاپا کہاں ہیں اور کیسے ہیں؟“

”میرے پاپا نہیں، آپ کا شوہر زندہ ہے، نارمل ہے۔“

”خدا کے لئے مجھے ان سے باتیں کرنے دو۔“

”آپ اس شخص کے لئے تڑپتی ہیں تو میں اپنے ابو کی توہین محسوس کرتی ہوں۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ میرے باپ سے اتنی محبت نہیں کرتی تھیں، جتنی شازیہ کے باپ سے کرتی ہیں۔“

”یہ باتیں پھر کر لیتا۔ مجھے گالیاں بھی دے لیتا۔ پہلے ان سے بات کراؤ۔“

”وہ سو رہا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اسے آرام کرنے دیا جائے۔ آپ شام چھ بجے تک اس سے گفتگو کر سکیں گی۔“

”خدا کے لیے مجھے یقین دلاؤ کہ وہ زندہ اور نارمل ہیں۔“

”کیا آپ مجھے یقین دلائیں گی کہ میرا باپ زندہ ہے؟ کیوں مجھے غصہ دلا رہی ہیں؟ آپ میرے دشمن کے لیے جتنا تڑپتی ہیں، میں اتنا ہی غصے سے کھولنے لگتی ہوں۔ میں فون بند کر رہی ہوں۔ شام چھ بجے آپ اس سے ضرور باتیں کریں گی۔“

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ اسے ماں پر غصہ آ رہا تھا، اس نے اس کے ابو کے لیے ایسی محبت اور تڑپ کا اظہار کبھی نہیں کیا تھا۔ اس وقت دوپہر کے دو بجے تھے۔ وہ سونا چاہتی تھی مگر غصے سے نیند نہیں آ سکتی تھی۔ اس نے فریج سے ٹھنڈی بوتل نکال کر پی۔ ذرا ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ وہ دوسرے کمرے میں آئی۔ سرفراز سو رہا تھا۔ بشارت کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اس نے باہر بلا کر پوچھا۔ ”کیا اسی طرح اونگھتے اونگھتے پھر ادو گے؟ اگر یہ نکل بھاگا تو؟“

”میں غنودگی سے لڑ رہا تھا۔ سونے کی حماقت نہیں کروں گا۔ بستر ہے، باہر سے دروازہ بند کر دو۔“

”دروازہ کھلا رہے گا۔ تاکہ تم پانچ بجے آکر مجھے جگاؤ۔ میں سونے جا رہی ہوں۔“ وہ اپنی خواب گاہ میں آگئی۔ بستر پر لیٹ کر سوچتی رہی پھر سوچتے سوچتے سو گئی۔ دماغ میں پیچیدہ منصوبے ہوں اور اندیشوں میں گھر کر ان پر عمل ہو رہا ہو تو نیند نہیں آتی۔ آجائے تو گمری نہیں ہوتی۔ پیچیدہ خواب پریشان کرتے ہیں۔ بشارت نے پانچ بجے آکر جگایا تو اسے یوں لگا جیسے وہ نیند میں بھی اپنے حالات سے لڑ رہی تھی۔

اس نے بستر پر بیٹھ کر کہا۔ ”دروازہ اندر سے بند کرو اور میری باتیں توجہ سے سنو۔“

وہ دروازہ بند کر کے اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا۔ ”میں ایک گھنٹہ بعد باہر جاؤں گی۔ رات نو بجے تک کھانے کے لیے کچھ لے کر واپس آؤں گی۔ تم رات دس بجے تک میرا انتظار کر دو گے۔ اس کے بعد سمجھ لیتا، میں کسی مصیبت میں پڑ گئی ہوں۔“

”شانی! تم تنہا مصیبتوں سے لڑ رہی ہو۔ کچھ تو بتاؤ کیا کرتی پھر رہی ہو؟“

”یہ میری جنگ ہے۔ اس لیے میں ہی لڑ رہی ہوں۔ تم سے صرف تعاون حاصل کر رہی ہوں۔ تم ہی تعاون کر سکتے ہو کہ میری عدم موجودگی میں سرفراز کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دو۔ اسے کبھی ایک منٹ کے لیے بھی چھوڑ کر کہیں نہ جاؤ۔“

”تم رات دس بجے تک واپس نہ آسکو تو پھر مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

”میں دس بجے تک فون کر کے اپنی خیریت کی اطلاع دوں گی۔ اگر فون پر یہ کہوں کہ میں خیریت سے نہیں ہوں تو فون بند کرتے ہی سرفراز کو قتل کر دیتا۔“

وہ ایک دم سے گھبرا کر بولا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں‘ میں قتل کروں؟“ وہ گھور کر بولی۔ ”کیا تمہاری جان نکل رہی ہے۔ کبھی تو تم خود پر لعنت بھیجتے ہو کہ میرے لیے کچھ نہیں کر رہے ہو۔ کبھی اپنی جان قربان کر دینے کا دعویٰ کرتے ہو۔ مجھے تمہاری نہیں‘ دشمن کی جان چاہیے‘ بولو کیا کرو گے؟“

”جو کہو گی‘ وہ کروں گا لیکن انجام کیا ہوگا؟ میری بینائی قابل اعتماد نہیں ہے‘ میں قتل کے بعد کہیں بھاگ کر نہیں جاسکوں گا۔“

”تم پر قتل کا الزام نہیں آئے گا۔ میں ممی سے کہہ چکی ہوں کہ تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہو۔ یہ لو چاہی اور وہ الماری کھولو پھر اس کے اندر کے سیف کو کھولو۔“

اس نے چابی لی۔ الماری کے پاس آکر اسے کھولا‘ پھر سیف کو بھی کھولا۔ وہاں نوٹوں کی گڈیاں ایک پر ایک رکھی ہوئی تھیں۔ دوسرے خانے میں ہیرے موتیوں سے جڑے ہوئے زیورات تھے۔ وہ بولی۔ ”یہ لاکھوں روپے کے زیورات ہیں اور بائیس لاکھ سے زیادہ نقد رقم ہے۔ یہ میں تمہارے حوالے کر کے جاؤں گی۔ اس یقین کے ساتھ کہ تم چوری کر کے نہیں بھاگو گے کیونکہ تمہارا اندھا پن تمہارے پاؤں کی زنجیر بن جائے گا۔“

”قتل کے بعد بھی کہیں نہیں بھاگ سکوں گا۔“

”عقل سے کام لو۔ اس کی لاش کو کار کی ڈکی میں ڈال کر کہیں پھینک آؤ گے تو نہ تم پر الزام آئے گا‘ نہ کہیں بھاگنا پڑے گا۔ تم یہیں میری واپسی کا انتظار کرتے رہو گے۔“

”ایسے کو نہ کہہ سکتے تھے کہ تم واپس آؤ گی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ آج دس بجے تک نہ آئیں تو پھر کبھی مجھ سے نہیں ملو گی۔“

”تم اپنی عقل استعمال ہی نہیں کرتے ہو۔ جب میں یہ کہہ رہی ہوں کہ تم میرے زیورات اور نقد رقم لے کر فرار نہیں ہو سکو گے تو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ میری امانت ہے اور میں کسی دن بھی واپس آؤں گی۔“

”پھر تو سمجھ لو کہ تمہیں دوبارہ پانے کے لیے تمہارے تمام احکامات کی تعمیل کروں گا۔“

شائستہ نے گھڑی دیکھی۔ چھ بجنے میں بیس منٹ تھے۔ وہ بولی۔ ”تم وہاں جاؤ اور اسے جگا کر کہو کہ منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جائے۔ چھ بجے تمہاری خالہ جان یعنی میری ممی فون پر بات کریں گی۔ میں چھ بجے یہ فون لے کر اس کمرے میں آؤں گی۔“

وہ چلا گیا اس نے دروازے کو اندر سے بند کر کے اپنی ماں سے رابطہ کیا۔ وہ بولی۔ ”مجھے یقین تھا‘ میری بیٹی وعدہ پورا کرے گی۔ وہ کہاں ہیں؟ بات کراؤ۔“

”ابھی چھ نہیں بجے ہیں۔ پھر وہ ہاتھ روم میں ہے۔ اس سے باتیں کرنے سے پہلے آپ میری باتیں ذرا صبر سے سن لیں۔ اس کا حافظہ کمزور ہو گیا تھا۔ میں نے اسے اپنے اور آپ کے متعلق بہت کچھ یاد دلایا ہے اور اس سے کہا ہے کہ آپ لاہور میں ہیں اور ابھی فون پر بات کرنے والی ہیں۔ آپ ابھی یہی کہیں گی کہ لاہور سے بول رہی ہیں اور کوئی ایسی بات نہیں بولیں گی جس سے ہماری آپس کی دشمنی ظاہر ہو۔ میں یہاں اس کی سگی بیٹی بنی ہوئی ہوں۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ دشمنی نہ رہے مگر یہ دکھ کی بات ہے کہ الزام کا حافظہ کمزور ہو گیا ہے۔ بیٹی! میں ہاتھ جوڑتی ہوں‘ مجھے ان سے ملنے دے۔“

”پھر آپ اس کے لیے تڑپ رہی ہیں۔ پھر میں پوچھوں گی‘ یہ تڑپ میرے ابو کے لیے کیوں نہیں تھی۔“

وہ روتی ہوئی بولی۔ ”کیوں گڑے مردے اکھاڑتی ہے۔ ماں کو صدمہ پہنچا کر کیا حاصل کر رہی ہے۔“

”اس کا جواب پھر دوں گی۔ ابھی وارننگ دے رہی ہوں اگر آپ ابھی شوہر سے باتیں کرتے ہوئے ذرا بھی روئیں گی یا کسی بھی طرح باتیں بنا کر اسے کسی شبہ میں مبتلا کرنا چاہیں گی تو میں فون بند کر دوں گی۔ پھر آپ قیامت کے دن اس کی آواز سن سکیں گی۔“

”تم جیسا کہہ رہی ہو، ویسا ہی کروں گی۔ گھڑی دیکھو چھ بجنے والے ہیں۔ وہ ہاتھ روم سے نکل آئے ہوں گے۔ ان سے جلدی بات کراؤ۔“

”آپ انتظار کریں، میں دیکھتی ہوں فون کو آن رکھیں۔“

وہ صرف مائیک والے بٹن کو آف کر کے دوسرے کمرے میں آئی۔ سرفراز کو دیکھ کر بولی۔ ”ممی کا فون ہے لیکن آپ یہ یاد رکھیں کہ ممی کا دل بہت کمزور ہے۔ آپ ان سے آئی بینک والی کوئی بات نہیں کریں گے۔“

”اچھا ہوا تم نے بتا دیا۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں بولوں گا۔“

اس نے مائیک اور اسپیکر کو آن کیا تاکہ ادھر سے ماں کی باتیں بھی سنتی رہے۔ پھر کہا۔ ”ہیلو ممی! یہ لیس میرے پیارے پیارے باتیں کریں۔“

اس نے اپنے اور سرفراز کے درمیان فون رکھ دیا۔ سرفراز نے کہا۔ ”ہیلو رشیدہ! میں بول رہا ہوں، سرفراز بول رہا ہوں۔“

”ہاں، میں پہچان رہی ہوں، آپ کیسے ہیں؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں، میری بیٹی میرا بہت خیال رکھتی ہے۔ تم کب آرہی ہو؟“

”میں، میں کیسے بتاؤں؟ کچھ کہہ نہیں سکتی۔“

”کیوں نہیں کہہ سکتیں، کوئی مجبوری ہے؟“

شائستہ نے موقع کی نزاکت دیکھ کر کہا۔ ”ممی! آپ کہہ رہی تھیں، شازیہ کے امتحانات ہو رہے ہیں اور آپ مل کے معاملات میں زیر کی مدد کر رہی ہیں۔“

”آں؟ ہاں! یہ مجبوریاں ہیں لیکن تمہارے پیلا اتنی محبت سے بلا رہے ہیں۔ سوچ

رہی ہوں کم از کم ایک دن کے لیے آجاؤں۔“

”ٹھیک ہے ممی! آپ پیلا سے یہ پراس کریں کہ پرسوں شازیہ کا آخری پرچا ہوتے ہی آپ رات کی کسی فلائٹ سے آجائیں گی۔“

”میری بیٹی! میری جان! پرسوں تک.....“

بات پوری ہونے سے پہلے شائستہ نے فون کے مائیک کو بند کرتے ہوئے کہا۔ ”پیلا! ممی کو میں نے سمجھایا تھا کہ آپ یہاں آگئے ہیں۔ وہاں سے ممی بھی آجائیں گی تو شازیہ اور زیر اکیلے رہ جائیں گے۔ آپ ان سے کہہ دیں کہ پرسوں تک آپ خود لاہور آئیں

گے وہ یہاں ہرگز نہ آئیں۔“

اس نے مائیک کو پھر آن کیا۔ سرفراز نے کہا۔ ”رشیدہ! ہیلو رشیدہ! یہ ہماری بیٹی اچھا مشورہ دے رہی ہے۔ تم یہاں ابھی نہ آؤ۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ مشورہ غلط ہے۔ میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ.....“

وہ بات کاٹ کر بولا۔ ”مجھے نہ سمجھاؤ تم سمجھو پرسوں میں ہی لاہور آؤں گا، وہاں اپنے دونوں بچوں کے ساتھ رہوں گا۔“

شائستہ نے کہا۔ ”اور ممی! یہاں ڈاکٹر نے پیلا کو زیادہ باتیں کرنے سے منع کیا ہے۔ اس لیے آپ پیلا کو خدا حافظ کہہ دیں۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا؟“

”ہاں، سمجھ رہی ہیں۔ تمہارے پیلا سے کہتی ہوں۔ رات کو پھر کسی وقت باتیں کریں۔“

”پیلا! دوائیں کھا کر سوتے ہیں۔ کل صبح آپ سے باتیں کریں گے۔“

سرفراز نے ہنسنے ہوئے کہا ”رشیدہ! دیکھو ہماری بیٹی ڈاکٹر بن گئی ہے۔ مجھے زیادہ باتیں کرنے نہیں دیتی ہے۔ ٹھیک ہے، کل صبح سہی۔ خدا حافظ۔“

شائستہ نے مائیک کو آف کیا۔ پھر اٹھ کر بولی۔ ”پیلا! ابھی آتی ہوں۔“

وہ اپنی خواب گاہ میں آئی۔ پھر دروازے کو اندر سے بند کر کے مائیک کو آن کرنے کے بعد بولی۔ ”بہت خوب ممی! آپ چالاکی دکھا رہی تھیں۔ یہ بھول گئیں کہ میں آپ ہی کی بیٹی ہوں۔ آپ کے پیٹ سے ہی آپ کو پہچان کر آئی ہوں۔“

”مجھے معلوم ہوتا کہ ایسی اولاد ہوگی تو تجھے پیدا ہی نہ کرتی۔ دیکھ شائستہ! میں کہہ دیتی ہوں اگر تو نے ان سے نہ ملایا۔ یہاں انہیں واپس نہ لائی تو بہت برا ہوگا۔“

”ماں کا فرض ہے کہ برا بھلا سمجھائے۔ آپ پہلے یہ سمجھا دیں کیا برا ہوگا؟ بات سمجھ میں آئے گی۔ میں ڈر جاؤں گی تو اس خبیث کو آپ کے پاس لے آؤں گی۔“

”میں تیری پروا نہیں کروں گی۔ یہاں کے اسپیکر جزل آف پولیس سے ہماری اچھی واقفیت ہے۔ وہ انہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔“

”ڈھونڈنے سے میں مل جاؤں گی۔ آپ کے شوہر کو لاش کے ساتھ۔“

سمجھایا کہ جب تک وہ فون پر حکم نہ دے، تب تک سرفراز کو کوئی نقصان نہ پہنچائے پھر وہ سرفراز کے پاس آکر بولی۔ ”ایک ڈاکٹر سے آپ کے سلسلے میں ملنے جاری ہوں۔ پھر اس سے آئندہ ملاقات کا وقت لے کر آپ کو لے چلوں گی۔ خدا حافظ۔“

وہ مکان سے باہر آئی۔ پھر پیدل چلنے لگی۔ مین روڈ کے چوراہے پر ٹیکسی مل گئی۔ کلفٹن کی طرف جاتے ہوئے اس کے دماغ میں ماں سے ملاقات کا ایک خاکہ تھا کہ کس طرح کی نرم و گرم اور جذباتی گفتگو ہوگی۔ اس نے ایک ہی بات گہ میں باندھ لی تھی کہ ماں چاہے رو رو کر اپنی آنکھیں پھوڑ ڈالے یا جان پر کھیل جائے خون پھر خون ہے۔ ٹپکے گا، جم جائے گا، سوکھ جائے گا اور مٹی میں مل جائے گا، تب بھی پچیس برس کے بعد بولے گا۔

اس نے اپارٹمنٹس سے دو سو گز کی دوری پر ٹیکسی رکوائی۔ اتر کر کرایہ ادا کیا۔ وہ ٹیکسی گھوم کر جانے لگی۔ وہ سڑک کے کنارے دور تک جانے والی ٹیکسی کو دیکھتی رہی۔ جب یقین ہو گیا کہ کوئی جاسوسی نہیں کر رہا ہے۔ نہ تعاقب کر رہا ہے، نہ ٹیکسی کا نمبر نوٹ کر رہا ہے تب وہ پیدل چلنے لگی۔ اپارٹمنٹس کے قریب پہنچنے پر رشیدہ نے اسے دیکھ لیا۔ وہ گیٹ سے باہر کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کار آگے بڑھ کر شائستہ کے پاس آکر رک گئی۔ وہ ماں کے پاس بیٹھ کر ڈرائیور سے بولی۔ ”سمندر کے کنارے جہاں فلیٹس کی قطاریں ہیں، وہاں آخر تک لے چلو۔“

کار ادھر چل پڑی۔ رشیدہ ڈرائیور کی موجودگی میں کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ اس نے چپ چاپ بیٹی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ماں کا وہ ہاتھ سوالی بن کر آیا تھا۔ بیٹی کے ہاتھ نے جواب نہیں دیا۔ ادھر سے بے حسی رہی۔ ماں نے اس ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ اسے محبت سے سسلانے لگی۔ ممتا کی گرمی پہنچانے لگی لیکن وہ ہاتھ سرد رہا۔ ایک گونگی فریادی اور کیا کر سکتی ہے، زنجیر عدل کہاں سے پائے گی؟ ماں نے اس ہاتھ کو دوپٹے کے نیچے دھڑکتے ہوئے کیلچے پر رکھ لیا۔ ہاتھ اولاد کا تھا۔ اگر نہیں تھا تو پھر ماں نے کیلچے پر پتھر رکھ لیا تھا اسی طرح غیر شعوری طور پر انسان کو صبر آتا ہے۔

سمندر کے بمقابلہ پر کار رک گئی۔ ادھر دیرانی سی تھی۔ ساحلی پختہ سڑک ختم ہو گئی تھی۔ وہ دونوں کار سے نکل آئیں۔ شائستہ نے ڈرائیور سے کہا۔ ”گاڑی وہاں دور

چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ پھر اس کے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ شائستہ نے کہا۔ ”میرے باپ کا جتنا خون بہا ہوگا، اتنے آنسو آپ کی آنکھوں میں نہیں ہوں گے۔ یہ فون بند کرتے ہی سمجھ لوں گی کہ آپ آئی جی آف پولیس سے رابطہ کر رہی ہیں۔ میں سرفراز کا رابطہ موت سے کرا دوں گی۔“

”نہیں، نہیں بیٹی! میں قسم کھاتی ہوں۔ تیری، شازیہ اور زبیر کی قسم کھاتی ہوں۔ میں پولیس کے پاس جانے کی دھمکی دے رہی تھی۔ میں نہیں جاؤں گی ورنہ خاندان کی عزت مٹی میں مل جائے گی۔“

”آپ نے عزت کی بات کی ہے تو یہ بتادوں۔ بشارت مجھے دھوکا دے کر نہیں گیا ہے۔ وہ میرا وفادار ہے۔ آپ یہ باتیں چار دیواری سے باہر لاسکتی ہیں تو میں بشارت کے ساتھ تھانے پکھری اور جیل تک جانے کو تیار ہوں۔“

”یا خدا! میں کیا کروں شائستہ! میں تجھ سے جیت نہیں سکتی۔ میری ایک بات مان لے، انہیں مجھ سے ملانا نہیں چاہتی خود آکر تو مل سکتی ہے۔“

”آپ میری مئی ہیں، ضرور ملوں گی۔“

”تو پھر آجاؤ۔“

”ملاقات کی چند شرائط ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ ملاقات کھٹنے یاد دو کھٹنے سے زیادہ نہیں ہوگی۔ میں رات کے دس بجے واپس نہیں جاؤں گی تو بشارت اسے قتل کر دے گا۔“

”ایسی بات زبان سے نہ نکالو۔ تم نوبتے ہی واپس چلی جانا۔“

”دوسری شرط یہ ہے کہ ملاقات کسی چار دیواری میں نہیں، کھلی فضا میں ہوگی۔“

”تم جہاں کہو گی، چلی آؤں گی۔“

”آپ کے ساتھ صرف ڈرائیور ہوگا اور آپ کسی کو میرے تعاقب میں نہیں

لگائیں گی۔“

”میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گی۔“

”میں سات بجے تک آپ کے اپارٹمنٹس کے بڑے گیٹ کے پاس پہنچ جاؤں

گی۔“

اس نے فون بند کر کے بشارت کو بلایا۔ پھر اسے بہت ساری ہدایات دیں۔ یہ

گی؟“

لے جاؤ اور انتظار کرو۔“

وہ گاڑی واپس موڑ کر لے گیا۔ رشیدہ نے کہا۔ ”تیری خاموشی میری جان نکال رہی ہے۔“

”میں کیا بولوں؟ بلایا تو آپ نے ہے۔“

چاند کی چودھویں تاریخ تھی۔ ساحل پر جوار بھانا کا شور تھا جنونی لہریں ساحلی دیوار سے ٹکرا کر، منتشر ہو کر، چھینٹے اڑا کر واپس جا رہی تھیں۔ پھر سر ٹکرائے آ رہی تھیں۔ دیوار پتھر کی تھی۔ اس کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔

رشیدہ نے کہا۔ ”یہاں کیوں آئی ہو؟ اتنا شور ہے کہ اونچی آواز میں بولنا ہوگا۔“

”اسی لیے آئی ہوں۔ آپ غصے سے میں چیخ کر بولیں گی۔ تب بھی ادھر کھڑی ہوئی فیل کو سنائی نہیں دے گا۔“

وہ کان کے قریب آکر بولی۔ ”میں صلح اور سمجھوتے کے لیے آئی ہوں۔ مجھے بتاؤ تم اپنے باپ کا خون کیسے معاف کر سکتی ہو۔ میں خون بھرا ادا کرنے کے لیے اپنی کروڑوں کی مل تمہارے نام کر دوں گی۔“

”ممی! جذباتی مکالموں سے پرہیز کریں۔ شاید اور زبیر میرے ماں جائے ہیں، میں ان کا حق نہیں ماروں گی۔ پھر آخری بات یہ ہے کہ میرے باپ کے خون کی قیمت کوئی ادا نہیں کر سکے گا۔“

”کیا تو خون کے بدلے خون کرے گی؟“

”میں جواب دینے سے پہلے پوچھنا چاہتی ہوں، آپ کو کیا تکلیف ہے؟“

”کیسی باتیں کرتی ہے؟ کیا مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی؟ کیا کوئی عورت راضی خوشی بیوہ ہوتی ہے؟“

”میں دوسری عورتوں کو نہیں جانتی۔ آپ کو بیوہ بننے کی پریکٹس ہے۔“

رشیدہ نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”مجھے کیسے سمجھاؤں کہ تیرے باپ کے وقت میں کتنی مجبور تھی۔“

”آج بھی آپ مجبور ہیں۔ آپ میرے باپ کو نہیں بچا سکتی تھیں۔ آج سرفراز کو بھی کسی طرح نہیں بچا سکیں گی۔ اس وقت مجبور ہو کر صبر کیا تھا۔ آج صبر کیوں نہیں کریں

”تب اور اب میں فرق ہے۔ آج ہمارے خاندان کی جو عزت ہے اس عزت کو برقرار رکھنے کے لیے ہی میں نے اس وقت خاموشی اختیار کر لی تھی۔“

”آج پھر وہی ڈراما ہے، وہی آقا زادی ہے اور آپ کے اونچے خاندان کی عزت اچھلنے والی ہے۔ آج پھر آپ کو وہی عزت برقرار رکھنا ہے۔ قدیم زمانے میں آندھی، سیلاب اور ناگمانی بلاؤں کو ٹالنے کے لیے انسانی جانوں کی قربانیاں دی جاتی تھیں، ایک بار بدنامی اور رسوائی کی بلا کو ٹالنے کے لیے میرے باپ کی قربانی دی گئی۔ آج اسی بلا کو ٹالنے کے لیے آپ سرفراز کی قربانی کیوں نہیں دیں گی؟“

”میری سمجھ میں نہیں آتا۔ سرفراز کی موت سے رسوائی کیسے ختم ہوگی؟“

”سیدھی سی بات ہے۔ میں بشارت کو اپنی زندگی سے دور کر دوں گی۔ میرے گھر سے بے گھر ہونے والی بات کسی کو معلوم نہیں ہے۔ میں عزت دار بیٹی بن کر واپس آ جاؤں گی۔“

”میں ہاتھوں جوڑتی ہوں۔ تیرے پاؤں پکڑتی ہوں۔“

وہ بیٹی کے قدموں میں جھکی۔ بیٹی نے جھک کر اپنا پرس گرا دیا۔ ماں کے ہاتھوں کو پکڑ کر بولی۔ ”ہمیں دیکھنے والے یہی سمجھیں گے کہ ہم گرا ہوا پرس اٹھا رہے ہیں۔ آپ سیدھی کھڑی ہو جائیں۔ ورنہ عزت دو کوڑی کی ہو جائے گی۔“

وہ پرس اٹھا کر ماں کے ساتھ سیدھی کھڑی ہو گئی۔ پھر بولی۔ ”میں جانتی تھی کہ آپ پاؤں پر گرنے یا خودکشی کرنے کا ڈراما کریں گی۔ میں آپ کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ بارہا دیکھ چکی ہوں کہ آپ موت سے ڈرتی ہیں۔ آپ کو سرفراز سے محبت ہے تو جائیں سمندر میں چھلانگ لگادیں۔ میں قسم کھاتی ہوں کہ سرفراز کو معاف کر دوں گی۔“

رشیدہ نے پورے چاند کی روشنی میں سمندر کو دیکھا۔ بڑی منہ زور اور خوف ناک لہریں تھیں۔ لامحدود سمندر جیسے جڑے کھول کر لہروں کی صورت میں آتا تھا اور موت کی دعوت دے کر ساحلی دیوار سے ٹکرا جاتا تھا۔ اور چھینٹے چھینٹے ہو کر کتا تھا، دیکھو، موت اسی طرح ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔

رشیدہ کو جھرجھری سی آئی۔ اتنے بڑے سمندر کے سامنے حلق سوکھ گیا۔ وہ

تھوک نکل کر حلق تر کرتے ہوئے بولی۔ ”کیا تو میرے ڈوبنے اور مرنے کا تماشا دیکھنے مجھے یہاں لائی ہے؟“

”مئی! آپ سوچ بھی نہیں سکتیں کہ آپ کو جان دے کر بھی خوشیاں دے سکتی ہوں۔ جانتی ہیں کیوں؟ اس لیے کہ آپ نے سلامت کو مرنے دیا مگر اس کے خون کو نابود ہونے نہیں دیا۔ اسے سمیٹ کر بہت سلامت کو وجود میں لے آئیں۔“

وہ چاند کی روشنی میں بیٹی کو ایک نئے انداز سے دیکھنے لگی۔ دل میں سوچنے لگی۔ میں نے اسے کیوں پیدا کیا تھا؟ اماں نے لاکھ زور لگایا تھا کہ اسے ضائع کر دوں، لیکن میں نے ایسا ہونے نہیں دیا۔ اماں کا اور سب ہی کا یہ خیال تھا کہ سلامت کی موت کے بعد بھی میں اسے چاہتی ہوں اس لیے اس کی یہ نشانی ضرور رکھوں گی۔ لیکن نہیں، دنیا والے نہیں جانتے صرف میں اپنے اندر جانتی ہوں کہ میں واقعی موت سے ڈرتی ہوں۔ میں نے دو عورتوں کو اسقاط حمل کے باعث مرتے دیکھا تھا۔ میں نے سلامت کی چاہت کو غلطی سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا لیکن اس بیٹی کو پیدا کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

وہ سوچ رہی تھی مگر سمجھ نہیں رہی تھی کہ بیٹی کو اس نے نہیں، قدرت نے مکانات عمل کے طور پر پیدا کیا تھا۔ اسقاط حمل سے ڈرنا، محض ایک بہانہ تھا۔ آدمی ڈرتا ہے، تب ہی آگے جا کر پچیس برس کے بعد بھی اسی عمل کے نتیجے میں عذاب اٹھاتا ہے۔ رشیدہ نے کہا۔ ”مجھے سے محبت کا دعویٰ کرتی ہے۔ جان دے کر بھی مجھے خوشیاں دے سکتی ہے پھر کیوں میری خوشیاں چھین لینا چاہتی ہے؟“

”سرفراز آپ کی خوشی نہیں ہے۔ موت سے ڈرنے والی کی خوشی اس کی زندگی اور سلامتی میں ہے۔ اپنے بچوں کی خوش حالی میں اور خاندان کی عزت میں ہے۔ اگر میرا یا شازیہ کا ایک گردہ خراب ہو جائے اور آپ سے گردہ دینے کو کہا جائے تو آپ انکار بھی نہیں کریں گی اور دیں گی بھی نہیں۔ نوٹوں کی گڈیاں لے کر گردے خریدنے نکل پڑیں گی۔“

”تو یہ فضول باتیں کیوں کر رہی ہے؟“

”یہ ثابت کرنے کے لیے کہ نہ آپ کو سلامت ڈرائیور سے محبت تھی، نہ سرفراز سے ہے۔ آپ محبت نہیں کرتیں، صرف ضرورت کا حساب کرتی ہیں۔ ایک ڈرائیور کو

ہلاک کر کے خاندانی عزت کو بحال رکھنے کے لیے وہ ضروری تھا۔ میں ناجائز نہ کسلاؤں لہذا مجھے باپ کا نام دینے کے لیے ضروری تھا۔ اب بھی وہ ضروری ہے۔ اس لیے کہ آپ کے دو بچوں کا باپ ہے۔ محبت اور ضرورت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وہ آپ کا محبوب سرتاج نہیں ہے، ایک ضرورت ہے۔ زندگی کے تقاضوں کے مطابق ضرورت بدلتی ہے۔ محبت کسی تقاضے سے بھی نہیں بدلتی۔ محبت خود سے پیدا ہوتی ہے اور ضرورت خود غرضی سے پیدا ہوتی ہے۔“

رشیدہ نے ذرا پیچھے ہٹ کر کہا۔ ”ہاں، میں خود غرض ہوں۔ تو میرے لیے جان دینے کا دعویٰ کرتی ہے۔ میں خود غرضی سے پوچھتی ہوں، کیا تو سمندر میں میری خاطر پھلانگ لگا سکتی ہے؟“

وہ ساحلی دیوار کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ”ہاں، میں ابھی کوڈ پڑوں گی۔“ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ کوڈ پڑے گی۔ رشیدہ کے دماغ میں بات آئی۔ یہ مرے گی تو سرفراز کو زندگی ملے گی لیکن کس دل سے بیٹی کو مرنے دے؟ وہ دیوار پر چڑھ کر بولی۔ ”میں اپنی موت سے پہلے یہ واضح کر دوں کہ دس بجے تک واپس نہ گئی تو سرفراز کو قتل کر دیا جائے گا۔“

رشیدہ نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔ ”اتر جا دیوار سے کیا باؤلی ہوئی ہے۔ میں ماں ہوں، تجھے مرنے نہیں دوں گی۔“

شائستہ نے زور دار قہقہہ لگایا۔ انسان کو انسان کی موقع پرستی پر ہنسی ضرور آتی ہے۔ اسے بھی آرہی تھی۔ وہ ہنس ہنس کر بولی۔ ”میں بھی آپ کی طرح ہوں، موت سے ڈرتی ہوں اور زندگی سے پیار کرتی ہوں۔ میں جانتی تھی کہ آپ ماں کی محبت سے نہیں، ضرورت سے بچانے کے لیے لپک کر آئیں گی۔ ابھی میں آپ کے لیے بہت ضروری ہوں۔“

وہ بیٹی کو گھور کر دیکھنے لگی۔ شائستہ نے کہا۔ ”اب ہمیں چلنا چاہیے۔“

”میں نہیں روکوں گی۔ کیونکہ تمہیں دس بجے سے پہلے وہاں پہنچنا ہے۔ لیکن میں کسی نتیجے پر پہنچنا چاہیے تھا۔“

”نتیجہ میرے منانے ہے۔ آپ کے ذہن میں بھی ہے مگر آپ اتنی بڑی واردات

کو تسلیم کرنے سے کترا رہی ہیں۔ میری منزل ہے، دشمن کی موت۔ آپ کی منزل ہے خاندان کی عزت۔ میں بازاری بن جاؤں گی یا ایک ملازم سے شادی کر دوں گی تو شاذیہ کا رشتہ کسی عزت دار گھرانے سے نہیں آئے گا۔ ہمارے خاندان میں ایک ہی بیٹا ہے زبیر، وہ ایک ملازم کاسالا اور آپ ساس کہلائیں گی۔ آپ فیصلہ کریں، ساس کہلائیں گی یا بیوہ؟“

وہ دور کھڑی ہوئی کار کی طرف جانے لگی۔ رشیدہ ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ ”تم مجھے آزمائش میں مبتلا کر کے جا رہی ہو۔“

”کوئی نئی آزمائش نہیں ہے۔ آپ نے عزت اور شرافت کے لیے ایک کو قربان کیا۔ سوچیں کہ دوسرے کو قربان کیوں نہیں کریں گی؟ سرفراز آپ کے لیے کتنا ضروری ہے؟ اور کس حد تک غیر ضروری ہے۔ میں پیدائش سے پہلے ہی یتیم ہو گئی۔ باقی دو بچے بھی یتیم کہلائیں گے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

وہ کار سے چند قدم کے فاصلے پر رکی، پھر بولی۔ ”ڈرائیور کے سامنے باتیں نہیں ہوں گی۔ لہذا آخری بہترین مشورہ دے رہی ہوں۔ سرفراز کی اہمیت کم کر کے میرے باپ کی طرح اسے بھی نظروں سے گرا کر سوچیں، فیصلہ آسان ہو جائے گا۔“

وہ کوئی جواب نہ بغیر تیزی سے چلتی ہوئی کار کی پچھلی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئی۔ رشیدہ چند لمحوں تک کھڑی رہی۔ پھر وہ بھی پچھلی سیٹ پر آگئی۔ کار واپس جانے لگی۔ سمندر کا شور دور ہوتے ہوتے معدوم ہو رہا تھا۔ دماغ میں حالات کا پیدا کردہ درندہ سرفراز چیخ رہا تھا۔ خاندان کی عزت کو جانے دو۔ مجھے بچالو۔ رشیدہ! مجھے بچالو۔

رشیدہ نے چور نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔ تھوڑی دیر پہلے بیٹی نے مشورہ دیا تھا کہ سرفراز کی اہمیت کو ذرا کم کر دو۔ کسی حد تک اسے نظروں سے گرا کر سوچو تو فیصلہ کرنا آسان ہو جائے گا۔

صحیح فیصلہ کرنے کا یہ بنیادی اصول ہے کہ فریقین میں سے کسی کو زیادہ اہمیت نہ دی جائے۔ کسی سے رشتے داری یا جذباتی وابستگی نہ رکھی جائے تب فیصلہ عین انصاف کے تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے۔ شائستہ کے مشورے نے اسے اس حد تک مائل کیا کہ وہ سرفراز کے اہم اور غیر اہم ہونے کا حساب کرنے لگی۔

وہ اپارٹمنٹ کے سامنے کار سے اتر کر ڈرائیور سے بولی۔ ”بی بی جی جہاں جانا چاہیں، انہیں پہنچا کر آؤ۔“

وہ بیٹی سے رخصت ہو کر اپارٹمنٹ کے اندر آئی۔ دروازے بند کیا پھر ایک صوفے میں دھنس گئی۔ گھر میں، دل میں اور دماغ میں ماتمی ویرانی تھی۔ جب یہ یقین ہو جائے کہ گھر کا ایک فرد کینسر سے، پھانسی کے پھندے سے یا کسی بھی طرح موت سے ہلکتا ہونے والا ہے اور بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے تو اس فرد کی موت سے پہلے صرف صدمہ رہ جاتا ہے اور صبر آنے لگتا ہے۔

وہ اس پہلو سے غور کر چکی تھی کہ شائستہ کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکے گی۔ اس پر نہ نصیحت کام آئے گی اور نہ قانون کے محافظ شائستہ کی قید میں سرفراز کو زندگی دے سکیں گے۔ قانون کی مدد لینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سرفراز کے قتل کے جرم میں وہ گرفتار ہوگی۔ پھر عدالتوں میں، جیلوں میں اور اخباروں میں اس خاندان کی عزت اور نیک نامی کی دھجیاں اڑائی جائیں گی۔ یہ تصور ہی ناقابل برداشت تھا کہ عزت دار کہلانے والی بیٹی کے ساتھ ایک ڈرائیور کا نام لیا جائے۔

پہلے وہ یہ سوچ کر پریشان ہوتی رہی کہ سرفراز نہ رہا تو کروڑوں کے کاروبار کا کیا ہوگا؟ اب سوچ میں یہ لچک پیدا ہو گئی کہ لوگ جیتے مرتے رہتے ہیں۔ کسی کے مرنے سے کاروبار نہیں رکتا۔ اس کے والد ملک جان محمد کا انتقال ہوا تھا تو اس کی اماں نے فیجر اور سپروائزر کے تعاون سے مل کی آمدنی کو برقرار رکھا تھا اور اب تو رشیدہ کا جوان بیٹا زبیر تھا۔ فیجر اور سپروائزر بھی ایماندار اور وفادار تھے۔ سرفراز اب اس مل میں ریڑھ کی ہڈی نہیں رہا تھا۔ البتہ ایک اہم پرزہ تھا، اگر ٹوٹ جاتا تو اس کی جگہ دو سرا لگایا جاتا۔

وہ نہیں چاہتی تھی کہ سرفراز ٹوٹ جائے لیکن ایسی کوئی واردات ہونے سے پہلے وہ خاموشی سے خود کو صدمہ سہنے کے قابل بنا رہی تھی۔ رات کے دو بج چکے تھے اور وہ بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ نیند کانٹوں کے بستر پر بھی آجاتی ہے مگر نہیں آ رہی تھی۔ موبائل فون نے اسے مخاطب کیا۔ اس نے سر ہانے سے فون کو اٹھا کر مائیک اور اسپیکر کو آن کیا، پھر پوچھا۔ ”ہیلو!“

شائستہ کی آواز آئی۔ ”میں جانتی تھی کہ آپ جاگ رہی ہوں گی۔“

وہ ٹکست خوردہ سی آواز میں بولی۔ ”ہاں، جاگ رہی ہوں اور اندر سے ٹوٹ رہی ہوں۔“

”میں آپ سے رخصت ہو کر یہاں آئی تو سرفراز پر پھر پاگل پن کا دورہ پڑا تھا۔ ابھی یہ بے ہوش پڑا ہے۔“

رشیدہ یہ سن کر خاموش رہی۔ جواباً کوئی بے چینی نہیں تھی۔ چپکے پتھر کا مجسمہ بن گئی تھی۔ اس پر سے احساسات اور جذبات پانی کی طرح پھسلتے جا رہے تھے۔ شائستہ نے پوچھا۔ ”آپ خاموش کیوں ہیں؟“

”میں سارے الفاظ ضائع کر چکی ہوں۔ بولنے کے لیے کچھ نہیں رہا ہے۔“

”سرفراز شوگر کا مریض ہے، اسے ایک بار جان لیوا دل کا دورہ پڑا تھا۔ اس کی تمام متعلقہ میڈیکل رپورٹس آپ ساتھ لائی ہیں؟“

”یہاں، میرے پاس ہیں۔ میں یہ سوچ کر لے آئی تھی کہ ان کی ذہنی بیماری کے سلسلے میں شاید ان کاغذات کی ضرورت پیش آئے گی۔“

”مجھے ان کاغذات کی ضرورت ہے۔ آپ دیں گی؟“

اس نے ایک لمبی سانس لی پھر کہا۔ ”آؤ اور لے جاؤ۔“

”مجھے خوشی ہے کہ آپ نے کوئی سوال نہیں کیا۔“

بات جواب طلب نہ ہو تو وہ خاموش رہتی تھی۔ شائستہ نے کہا۔ ”سرفراز نے دو بڑی نیکیاں کی ہیں۔ آپ سنیں گی؟“

وہ چپ رہی۔ شائستہ نے کہا۔ ”سرفراز نے آئی بینک میں ایک لاکھ روپیہ کا عطیہ دیا ہے۔“

نہ تعجب کا اظہار ہوا۔ نہ خوشی کا۔ شائستہ نے اس کے بولنے کا انتظار کیا۔ پھر خود بولی۔ ”اس نے اپنی آنکھوں کا عطیہ دینے کے لیے وہاں کے متعلقہ ضروری کاغذات پر دستخط کیے ہیں۔ تائید اور گواہی کے طور پر میرے بھی دستخط ہیں۔ صرف ایک کمی رہ گئی ہے۔ وہاں کے قاعدے اور قوانین کے مطابق آپ کے دستخط لازمی ہیں۔“

اس نے چپ ہو کر جواب کا انتظار کیا۔ رشیدہ ہاں کہہ رہی تھی، نہ انکار کر رہی تھی۔ اس بار اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ شائستہ نے کہا۔ ”سرفراز اتنی بڑی نیکی کر

رہا ہے کہ اس کی عاقبت روشن ہو جائے گی اور یہ نیکی آپ کے تعاون اور فراخ دلی سے ہوگی۔ آپ کاغذات پر دستخط کریں گی نامی؟“

اس بار صبر و ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ موبائل فون سے لپٹ کر دھانڑیں مار کر رونے لگی۔ ”ہائے رہا! جوانی میں ایک غلطی کی۔ والدین کے اعتماد کو دھوکا دے کر گھر سے بھاگی تھی۔ ہائے! یہ عزت کی دہلیز چھوڑتے وقت انجام سمجھ میں کیوں نہیں آتا کہ پچیس پچاس برس کے بعد بھی غلطی کی سزا ملتی ہے۔ میں نے سلامت کی موت پر اپنی خاموشی کی مر لگائی تھی۔ آج پھر آج پھر وہ آئی بینک کا کاغذ نہیں ہے، سرفراز کی موت کا پروانہ ہے۔ میں اس پر دستخط کروں گی۔ دستخط کروں گی۔ نہیں کروں گی تو تمام بچوں کا مستقبل اور پورے خاندان کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ آہ! ایک غلطی کتنی بھیانک ثابت ہوئی ہے کہ توبہ بھی قبول نہیں ہو رہی ہے، پھر بھی توبہ کر رہی ہوں خدا یا توبہ توبہ.....“

انسان اپنے اعمال سے جو لکھتا ہے، وہی انجام کار مقدر بنتا ہے۔ وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ بہت ہی قاتل رحم ہو گئی تھی۔ لیکن مقدمہ کسی کو معاف نہیں کرتا۔ وہ روتے روتے یوں ہائے توبہ کر رہی تھی جیسے منہ پر جوتے اور پیٹھ پر لاتیں پڑ رہی ہوں۔

☆-----☆-----☆

شائستہ فون بند کر کے بستر سے اٹھ گئی۔ گہرے سنانے میں دیوار گھڑی کی ٹیک ٹیک سنائی دے رہی تھی۔ رات کے دو بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔ وہ خواب گاہ سے نکل کر دوسرے کمرے میں آئی۔ سرفراز اپنے بستر پر بے ہوش پڑا تھا۔ دوسرے بستر پر بشارت سو رہا تھا۔ اس نے قریب آکر دیکھا۔ سرفراز کی آدھی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ شائستہ کو یوں لگا جیسے وہ اسے دیکھ رہا ہو اور اس کے انتہائی ارادوں کو سمجھ رہا ہو۔

اسے شبہ ہوا کہ وہ بے ہوش نہیں ہے۔ شاید نیند میں آنکھیں کھلی ہیں، اس نے اپنی تسلی کے لیے ہولے سے آواز دی۔ ”بیٹا! پھر ذرا قریب ہو کر پکارا۔ اس کے بعد پیچھے ہٹ گئی۔ یوں لگا جیسے وہ مرچکا ہے۔ اس نے پھر قریب آکر اس کی ناک پر ہاتھ رکھا، نتھنوں سے دھیمی دھیمی سانس محسوس ہوئیں۔ اس نے سینے پر ہتھیلی رکھی۔ پہلے دھڑکن محسوس نہیں ہوئی۔ کیونکہ دھڑکنیں بہت ہی کمزور سی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد کچھ کچھ محسوس ہوئیں۔ وہ پیچھے ہٹ کر بشارت کے پاس آگئی۔

گی۔“

”ایک منٹ شائی! اس کی کلائیوں پر رسیوں کے نشانات پائے جائیں گے تو ہم پر شبہ ہوگا۔“

”ہاں، کوئی ترکیب آزمائی ہوگی۔“

وہ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد ہاتھ روم سے میلے کپڑے اٹھا کر لائی۔ اس کی دونوں کلائیوں کو کپڑوں سے اچھی طرح لپیٹ کر انہیں پلنگ کی پٹیوں سے باندھ دیا۔ پھر بشارت کے پاس آئی۔ وہ بے نور دیدے پھیلائے خلا میں تک رہا تھا۔ وہ ہاتھ پکڑ کر بولی۔

”میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں اس کے سرہانے لے جا رہی ہوں۔ تم اسے ٹٹول کر اچھی طرح دیکھ لو کہ کہاں سر ہے؟ اور کہاں دو ٹکیے ہیں۔ میں اس کے دونوں ہاتھ باندھ چکی ہوں۔“

وہ اسے سرہانے لے آئی۔ اسے سرہانے کی پوزیشن سمجھنے کے لیے چھوڑ دیا۔ ایک میلی قیص لے کر بولی۔ ”اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا جائے تو منہ سے سانس نہیں لے سکے گا۔ کیا میں اس کا منہ کھولوں؟ کہیں ہوش میں نہ آجائے۔“

”ہوش میں آنے دو۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔“

وہ ایک جھج لے آئی۔ سرفراز کے ہونٹوں اور دانتوں کے درمیان اسے رکھ کر اس کا منہ کھولا۔ پھر تھوڑا تھوڑا کر کے کپڑا ٹھونسنے لگی۔ اسی وقت وہ ذرا کمسنایا۔ شائستہ نے کہا۔ ”شاید یہ ہوش میں آ رہا ہے۔“

بشارت نے اس کے سر کے نیچے سے ایک تکیہ کھینچا۔ پھر چہرے کو ٹٹول کر اس پر تکیہ رکھ کر اسے پوری قوت سے دبوچ لیا۔

وہ یکبارگی پھڑپھڑایا۔ ہاتھ نہیں ہلا سکتا تھا۔ دونوں پاؤں بیٹخنے لگا۔ شائستہ فوراً ہی اس پر چھا گئی۔ اس کی دونوں ٹانگوں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر جکڑ لیا۔ آہ! بچا رہا! کیا اس کا یہ حال دیکھنے والے اس پر ترس کھائیں گے اور اسے معاف کرنے کی سفارش کریں گے؟ کیا اس کا انجام سننے اور پڑھنے والے بھول جائیں گے کہ اس نے بھی ایک بے قصور غریب ملازم کو کھیتوں میں دوڑا دوڑا کر اسے قتل کیا تھا؟ کیا اسے بے چارہ! آہ! لے جا رہا کہیں گے؟

وہ خراٹے لے رہا تھا۔ اس نے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے ہلایا۔ اس کی آنکھ نہیں کھلی۔ وہ نیند میں گردن کھجراتے ہوئے کروٹ لینے لگا۔ اس نے ہولے سے آواز دی۔

”بشارت! اٹھو۔ اے بشارت!“

”آں؟“ اس نے آنکھیں کھول کر پوچھا۔ ”کون؟“

پھر اس نے شانے پر رکھے ہوئے ہاتھ کو تھام کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم آئی ہو اور آتے ہی لائٹ بجھا دی۔ آخر نہیں رہ سکیں میرے بغیر۔“

اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ شائستہ نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کر پوچھا۔ ”کیا پھر بینائی چلی گئی ہے؟“

”بینائی؟ اودہ خدایا! کیا لائٹ بجلی ہوئی ہے۔ پھر مصیبت آگئی ہے۔“

وہ جل کر بولی۔ ”تم پر کیا خاک مصیبت آئی ہے؟ اس اندھے پن سے میرا منصوبہ خاک میں مل رہا ہے۔ میں ابھی اس کا کام تمام کرنا چاہتی تھی۔ اب کیا کروں؟ کچھ نہیں ہو سکے گا۔ میں تنہا کیا کروں گی؟ لعنت ہے، میں بھی کیسا بندہ اٹھا لائی ہوں۔ عین وقت پر اندھا لاچار ہو کر مجھے لاچار کر دیتا ہے۔“

”شائی! پلیز تمہیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ تم نے دیکھا ہے، بینائی لوٹ آتی ہے۔“

”اس وقت تین بج رہے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے صبح ہو جائے گی۔ آج اس قہے کو ختم کرنا ضروری ہے۔ میں نے می کو کسی حد تک قابو میں کیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ پھر پراہلم بن جائیں۔“

”کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ صرف کھٹے دو کھٹے کی بات ہے۔“

”اتنی دیر میں اسے ہوش آجائے گا۔ ابھی اس کی بے ہوشی کے دوران آسانی ہوگی۔ وہ اپنے لیے زیادہ جدوجہد نہیں کر سکے گا۔“

”درست کہتی ہو۔ وہ مجھ جیسے اندھے سے بھی نہیں لڑ سکے گا۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔ میں اس کی گردن دبوچ لوں گا۔“

”اس طرح قتل ظاہر ہوگا۔ تم اس کے منہ پر تکیہ رکھو گے۔ اسے سانس لینے نہیں دو گے۔ ٹھہرو، میں انتظام کر کے آتی ہوں۔ پہلے اس کے دونوں ہاتھ باندھ دوں۔“

یہ تو انسانوں کے درمیان ایک دوسرے کے خلاف چالیں چلنے اور موقع سے فائدہ اٹھانے کی بات ہوتی ہے۔ اگر بشارت پڑی بدل کر شائستہ کے پاس نہ آتا اور سرفراز کا وفادار رہ کر شائستہ کو وہ دوا پلا دیتا تو آج وہ پاگل خانے میں ہوتی یا اسی طرح پلنگ سے بندھی ہوتی اور سرفراز اس کے منہ پر تکیہ رکھے اسے دبوچ رہا ہوتا۔ جہاں ایک دوسرے کو مار کر زندہ رہنے کا مسئلہ ہو، وہاں کسی پر تکیہ نہیں کرنا چاہیے۔

اس بیمار میں دم ہی کتنا تھا۔ ذرا ہی دیر میں وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ لیکن وہ دونوں کئی منٹ تک اسے دبوچے رہے پھر شائستہ نے دل پر ہاتھ رکھ کر اس کی دھڑکنوں کو محسوس کرنا چاہا۔ دھڑکنیں خاموش ہو گئی تھیں۔ اس نے اندھے کو ہٹا کر اس کی ناک کے پاس ہاتھ رکھا، سانس ختم ہو چکی تھیں۔ دبوچنے کے باعث دونوں نتھنے چپک سے گئے تھے۔ اس نے نتھنوں میں انگلی ڈال کر ناک کو معمول پر رکھا۔ منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکالا۔ پھر اس کی دونوں کلائیوں کھول دیں۔ میلے کپڑوں کو ہاتھ روم میں اور رسیوں کو اسٹور روم کے سامان میں ڈال دیا۔ ہر چیز صحیح جگہ رکھنے کے بعد بولی: ”یہاں بیٹھو۔ میں ابھی آئی بینک والوں کو فون کر کے آتی ہوں۔“

وہ لاش سے ذرا دور اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔ دیدے پھیلا کر خلا میں تنکے لگا۔ اس کا دل خوف اور گھبراہٹ سے دھڑک رہا تھا۔ وہ بزدل نہیں تھا لیکن اتنی بڑی واردات پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ اس لیے خود کو سمجھانا بھی چاہتا تھا کہ اس نے ایسا نہیں کیا ہے اور یہ اس حد تک سچ تھا کہ اس نے کچھ دیکھا نہیں تھا۔ قتل کے کیس میں چشم دید گواہ کی اہمیت ہوتی ہے اور ایک اندھا چشم دید گواہ تسلیم نہیں کیا جاتا ہے۔

وہ تو اس دنیا کی گہری تاریکی میں تھا۔ ایک لڑکی ہاتھ پکڑ کر لے گئی تھی۔ اسے حکم دیا تھا کہ وہ نیچے کا تکیہ اوپر کر دے۔ تکیہ بھی کیا چیز ہے۔ سر کے نیچے رکھو تو ماں کی گود کی طرح نرمی اور گرمی دیتا ہے۔ منہ کے اوپر رکھو تو زندگی کی حرارت چھین لیتا ہے۔ وہ خود کو سمجھا رہا تھا کہ اس نے کسی زندگی نہیں چھینی ہے۔ وہ تو نوکر بے حکم کا بندہ ہے۔ قاتل نہیں ہے، مقتول کا خون آقا زادی کے سر ہے۔

☆-----☆-----☆

رشیدہ کو ایک ہی خواب آور گولی سے نیند آ جاتی تھی۔ جبکہ اس نے دو گولیاں

کھائی تھیں پھر بھی آنکھیں کھلی رہی تھیں۔ ان آنکھوں کو انتظار تھا کہ بیٹی آئے گی یا پھر فون آئے گا۔ وہ کبھی لیٹ جاتی تھی، کبھی بیٹھ جاتی تھی۔ جس روز سلامت کو قتل کیا گیا تھا، اس رات بھی ایسی ہی بے چینی اور گھبراہٹ سی تھی۔ اس کی ضمیر پوچھ رہا تھا، کیا اس غریب عاشق کا قتل واجب تھا؟ کیا وہ مجرم تھا؟ وہ اسے گھر سے بھگا کر لے گیا تھا یا آقا زادی نے ہی دیوانی ہو کر اسے ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا؟

اب پھر رشیدہ کی زندگی میں وہی رات آئی تھی۔ وہ دوسری بار بیوہ ہونے کی خبر سننے والی تھی اور جان بوجھ کر وہی خاموشی اختیار کر رہی تھی، جو سلامت کی موت پر روا سمجھی گئی تھی۔ وہ خاموشی بڑے گھر کی بیٹی کی عزت کا بھرم رکھنے کے لئے تھی۔ یہ خاموشی بھی شائستہ کو عزت کے ساتھ گھرانے کے لیے تھی۔ اصل چیز عزت ہے۔ عزت کے بغیر زندگی کچھ نہیں ہے۔ جینے کو کتے بھی جیتے رہتے ہیں۔ عزت وہ چاندی کا ورق ہے جسے اپنی ذات پر چڑھانے کے لیے سلامت اور سرفراز کو کتوں کی موت مارا جاسکتا ہے۔ ابھی ایک کتاباقتی تھا، شائستہ کے پیچھے دم ہلا رہا تھا۔

صبح چھ بجے شائستہ آگئی۔ رمضان نے دروازہ کھلا۔ اس نے پوچھا۔ ”مئی کہاں ہیں؟“

”بیڈ روم میں ہیں۔“

”تم جاؤ اور ڈرائیور سے کمو، گاڑی تیار رکھے۔ تم بھی ساتھ چلو گے۔“

وہ چلا گیا۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ ٹی وی لاؤنج سے خواب گاہ کا دروازہ کھلا نظر آ رہا تھا۔ وہ دروازے پر آئی۔ ماں ایک صوفے پر بیٹھی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ سامنے والے صوفے پر آکر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ جو کتنا چاہتی تھی وہ کہنے سے جھجک رہی تھی۔ اس نے پھر سر اٹھا کر دیکھا، ماں کی آنکھوں میں غمی چمک رہی تھی۔ وہ پھر سر جھکا کر بڑی آہستگی سے بولی۔ ”اللہ وانا الیہ راجعون.....“

ایک دم سے رشیدہ نے چیخ ماری۔ ”نہیں.....“ پھر اٹھ کر اس پر پل پڑی۔

اس کے گردن کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے، کبھی اسے ہاتھ مارتے کہنے لگی۔ ”تو دشمن ہے۔ دشمن ہے۔ بیٹی نہیں ہے۔ ہائے تیری بنا پڑتے ہی میری کوکھ جل جاتی۔ میں زہر کھاتی تو آج تو رہتی، نہ میں۔ تو کیسی منحوس گھڑی میں پیدا ہوئی تھی چڑیل!

ڈائن! میرے سہاگ کو کھاگئی کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا۔ بول تیرے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ گئی؟“

بٹی خاموشی سے مار کھاری تھی۔ جانتی تھی، ماں کے ماتم کی مدت کتنی ہے۔ وہ مارتے مارتے بولتے بولتے تھک کر بیٹی کی گود میں گر گئی پھر سکنے لگی۔ شائستہ کبھی ماں کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی، کبھی اسے تسلی کے لیے تھپکنے لگی۔ یوں اسے آرام سے رونے اور اندر کا غبار نکالنے کا وقت دیتی رہی۔ پھر گھڑی میں وقت دیکھ کر بولی۔ ”میں نے آئی بینک والوں سے کہا ہے کہ آپ ابھی سات بجے کی فلائٹ سے آرہی ہیں۔ میں آپ کو انرپورٹ سے سیدھی اسپتال میں لے آؤں گی۔ پھر آپ آئی بینک کے کانڈنات پر دستخط کریں گی۔“

وہ رو رو کر بولی۔ ”میں نہیں کروں گی۔“

”آپ کریں گی۔ میری باعزت واپسی کا یہ آخری مرحلہ ہے۔“

”ذلیل! کمینہ! تو کیسی ظالم اور سنگدل ہے۔ تو نے یہ بھی نہ سوچا کہ ان کی موت

کی خبر سن کر شازیہ اور زہیر پر کیا گزرے گی؟“

”وہی جو تازہ یتیم ہونے والے دنیا کے دوسرے بچوں پر گزرتی ہے اور وہی جو ثانی

اماں کی زبان سے اصل روداد سننے کے بعد مجھ یتیم پر گزری تھی۔“

وہ پھر بیٹی کی گود میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ بیٹی بولی۔ ”ڈاکٹر نے کہا ہے، لاش کا

پوسٹ مارٹم ہو گا۔ آپ وہ تمام میڈیکل رپورٹس لے چلیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ

وہ ذیابیطس کا مریض تھا اور ایک بار اس پر دل کا جان لیوا دورہ پڑ چکا ہے۔ مجھے یقین ہے،

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ یہی کہے گی کہ حرکت قلب بند ہونے سے اس کی موت واقع

ہوئی ہے۔“

”اری دشمن! اب تو وہ نہیں رہے۔ اب تو ان کا ذکر ادب سے کر سکتی ہے۔“

”بے ادب مرنے کے بعد بھی ادب و آداب کا مستحق نہیں ہوتا۔ میں نے یہاں

آتے ہوئے سوچا تھا کہ آپ کے سامنے اس کا ذکر کیسے کروں گی؟ اسے شہید نہیں کہہ

سکتی۔ میرے ابو عشق کی راہ میں شہید ہوئے تھے۔ ایک قاتل کو اس کی موت کے بعد

مرحوم بھی نہیں کہا جاسکتا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس پر نازل نہیں ہوگی۔ اس

لیے کہ اس نے موت سے پہلے اپنی چچن سالہ زندگی میں کبھی توبہ نہیں کی تھی۔ جو خدا

سے رجوع نہیں ہوا، جو کبھی نہیں پچھتایا، جس نے کبھی مغفرت نہیں چاہی، اسے اللہ کی معافی ملے گی، نہ رحمت۔ اس کی موت پر مجھے اور آپ کو توبہ توبہ کرنا چاہیے۔“

اس کی باتوں کے دوران رشیدہ نے اٹھ کر ایک چھوٹی سی لٹینی میں کچھ کپڑے اور میڈیکل رپورٹس وغیرہ رکھ لیں۔ پھر ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو کر بولی۔ ”شازیہ، زہیر اور تمام رشتے داروں کو یہ المناک خبر سنا دینا چاہیے۔“

”ابھی نہیں۔ اسپتال کے معاملات سے نمٹ کر تمام رشتے داروں کو اطلاع دی جائے گی۔ پہلے آپ خالہ جان سے کہیں گی۔ تاکہ چند بزرگ گھر جا کر شازیہ اور زہیر کو یہ خبر سنانے کے بعد انہیں صدمات سے سنبھالیں۔“

وہ دونوں اپارٹمنٹ سے نکلیں۔ کار میں آکر بیٹھ گئیں۔ پھر اسپتال پہنچ گئیں۔ آئی بینک والوں کو حیرانی تھی بلکہ شبہ تھا کہ ایک شخص کل آنکھوں کا عطیہ دینے پر آمادہ ہوا۔ کانڈنات پر دستخط کیے۔ پھر دوسرے دن اچانک مر گیا لیکن رشیدہ نے جو میڈیکل رپورٹس پیش کیں، ان سے شبہ دور ہو گیا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے بھی حرکت قلب بند ہونے کی تصدیق کی۔ پھر رشیدہ کے سامنے وہ فارم پیش کیا گیا۔ جس پر سرفراز نے آنکھوں کے عطیے کے سلسلے میں دستخط کیے تھے۔ رشیدہ نے فارم کو پڑھا پھر گھور کر شائستہ کو دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ڈاکٹروں کے سامنے خاموشی سے دستخط کر دیے۔

پھر وہ ویننگ روم میں آکر بیٹھ گئیں۔ ڈاکٹر نے کہا تھا، ایک بجے تک سرفراز کی لاش ان کے حوالے کر دی جائے گی۔ رشیدہ نے غصے سے پوچھا، ”فارم میں بشارت کا نام اور اس کے دستخط ہیں۔ تم سرفراز کی آنکھیں اسے کیوں لگوانا چاہتی ہو؟ وہ اندھا تو نہیں ہے؟“

”آپ نہیں جانتیں، وہ اندھا ہو چکا تھا۔ اسے عین وقت پر آنکھیں مل رہی ہیں۔“

”لیکن تمہیں اس سے کیا ہمدردی ہے۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ اسے ٹھکرا دو گی اور میرے ساتھ گھر چلو گی۔“

”بے شک یہی کروں گی۔ لیکن اس سلسلے میں ہمارے درمیان کچھ اور باتیں ہوں گی۔ ابھی ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ آپ کار میں جا کر خالہ جان وغیرہ کو فون کریں

چونکہ لاش کو لاہور لے جانا ہے اس لیے پی آئی اے کی کسی بھی فلائٹ میں آپ کو خصوصی سیٹ مل جائے گی۔

”کیا تم نہیں جاؤ گی؟“

”آپ میرے ابو کی تجیزو تکفین میں شریک نہیں ہوئی تھیں۔ جس سے میرا دور کا بھی رشتہ نہ ہو“ میں اس کی آخری رسومات کے وقت موجود نہیں رہوں گی۔ پھر وہاں ماتمی ماحول میں رشتے داروں کے درمیان میرے آنسو نہیں ٹکلیں گے، نہ ہی چہرے سے غم یا افسوس کا اظہار ہوگا تو عورتیں باتیں بنائیں گی۔ آپ کہہ سکتی ہیں کہ میں ملک سے باہر ہوں اور سرفراز کی موت سے بے خبر ہوں شاید دو چار روز میں آجاؤں۔“

رشیدہ فون کرنے اپنی کار میں چلی گئی۔ آنکھوں کے آپریشن کے سلسلے میں بشارت کا وہاں داخلہ ہو چکا تھا۔ شائستہ اس کے کمرے میں آئی۔ وہ بستر پر بیٹھا خلا میں تنگ رہا تھا۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ پانچ گھنٹے گزر جانے کے بعد بھی بینائی واپس نہیں آئی تھی۔ رشیدہ نے پوچھا تھا کہ جب اسے ٹھکانے والی ہو تو اسے نئی آنکھیں کیوں دے رہی ہو؟

یہ اپنے اپنے احساسات کی بات ہوتی ہے۔ شائستہ انتقام کے معاملے میں بہت حساس تھی۔ سرفراز کو ہلاک کرنے کے بعد بھی تسلی نہ ہوئی، قتل کے بعد اس کی آنکھیں نکلوا کر عجیب سی خوشی محسوس کر رہی تھی۔ اسے انتظار تھا کہ وہ آنکھیں بشارت کی آنکھوں کے حلقے میں آجائیں۔ پھر وہ دیکھے گی کہ دشمن کو مردہ کر کے کسی کی زندہ آنکھوں میں قید کر کے رکھنے سے انتقامی جذبوں کی اور کتنی تسکین ہوتی ہے۔

وہ دروازے کی طرف سرگھما کر بولا۔ ”کون ہے؟“

شائستہ نے جواب نہیں دیا۔ اس سے جتنا کام لینا تھا، لے چکی تھی۔ اب وہ اپنی اوقات کے مطابق معمولی سا ملازم لگ رہا تھا۔ اس کی ذات سے محض اتنی دلچسپی رہ گئی تھی کہ آئندہ وہ سرفراز کو اس کی آنکھوں میں قیدی کی حیثیت سے دیکھنا چاہتی تھی اور رہی سہی انتقامی بھڑاس نکالنا چاہتی تھی۔

اس نے پھر آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ ”شائی! کیا تم ہو؟“

وہ چپ رہی۔ اتنے دنوں میں پہلی بار اس کا شائی کہنا ناگوار گزرا۔ اگر وہ اونچی سوسائٹی میں اسے شائی کہہ کر مخاطب کرے گا تو کیا عزت رہ جائے گی؟ ٹھیک ہے کہ اسی

نے ایسی بے تکلفی کی اجازت دی تھی لیکن ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ تنہائی میں بے لباس ہوا جاتا ہے، کوئی کتنا ہی بے شرم ہو، محفل میں کپڑے نہیں اتارتا۔ موسم سرما میں شائیں شائیں کرتی ہوئی ہوائیں چلتی ہیں۔ موسم گزر جائے تو شائی شائی کی تکرار بے وقت کی راگنی لگتی ہے۔

وہ دروازے کی طرف رخ کیے بول رہا تھا۔ ”اس کے بدن کی ہلکی سی آہی ہے جیسے وہ کمرے میں آگئی ہو۔ آہ! ابھی جائے تو یہ کتنی بڑی بد بختی ہوگی کہ میری آنکھیں اسے نہیں دیکھ سکیں گی۔ یا خدا! مجھے بینائی چاہیے۔ اپنے لیے نہیں اسے دیکھنے کے لیے۔“

وہ خاموشی سے پلٹ گئی۔ ویننگ روم کی طرف جاتے ہوئے سوچنے لگی اس میں شبہ نہیں کہ یہ میرا دیوانہ ہے۔ میری خوشامدیں کرتا ہے لیکن ایک اس کی ہی بات نہیں ہے۔ میں جسے لفٹ دوں گی، وہی مجھے خوش رکھنے کے لیے چالوسی اور تابعداری کرے گا۔ زیادہ دولت مند ہونے میں یہی برائی ہے، مرد کی وفاداری مشکوک ہو جاتی ہے۔ یہ سمجھنا ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ عورت کو چاہتا ہے یا اس کی دولت کو؟

پھر اس کے دل نے کہا۔ ”وہ خواہ دولت کی وجہ سے ہی چاہتا ہو مگر بے زبردست“ اس کے بعد پھر کوئی اچھا نہیں لگے گا۔

اس کے دماغ نے پوچھا۔ ”کیوں اچھا نہیں لگے گا؟ اونچی سوسائٹی میں ایسے زبردست نہیں ہوتے؟ ضرور ہوتے ہیں۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ بلکہ خوب سے خوب تر ملتے ہیں۔ پرانے اتار کر پھینکو تو نئے ڈیزائن کے مضبوط سینڈل پہننے کو مل جاتے ہیں۔ یہ سوچنا حماقت ہے کہ آئندہ بہتر ساتھی نہیں ملے گا۔ می کو کیسے مل گیا تھا؟“

وہ ویننگ روم میں آئی۔ تھوڑی دیر بعد رشیدہ بھی اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اس نے بتایا کہ چند قریبی رشتے داروں کو اطلاع دے دی ہے۔ وہ رشتے دار باقی تمام رشتے داروں کو مطلع کریں گے۔ شام کی ایک فلائٹ سے سیٹ کنفرم ہو گئی تھی۔ لاش کو لاہور لے جانے کے انتظامات ہو رہے تھے، اس سلسلے میں رمضان اور ڈاڈائیور بھی مصروف ہو گئے تھے۔ رشیدہ نے بیٹی سے کہا۔ ”میں جانے پہلے یہ معلوم کروں گی کہ تم کب آ رہی ہو اور اس کعبت سے کیسے پیچھا چھڑا رہی ہو؟“

”اسے ایک ٹیکسی خرید کر دوں گی اور اسے تاکید کروں گی کہ وہ کبھی لاہور اور فیصل آباد نہ آئے۔“

”تمہیں یہ خوش فہمی ہے کہ تم اسے اپنی زندگی سے نکالو گی تو اس کے بعد بھی وہ تمہارے حکم کی تعمیل کرے گا اور جن شہروں میں ہمارے رشتے دار زیادہ ہیں وہاں کبھی نہیں جائے گا۔“

”وہ روزگار کے لیے پنڈ سے آیا تھا۔ جب میں اسے اچھا خاصا روزگار فراہم کر دوں گی تو وہ میری بات ضرور مان لے گا۔“

”اگر میں تم سے بیس لاکھ کی کار چھین کر لاکھ دو لاکھ کی گاڑی دوں تو کیا یہ ناانصافی نہیں ہوگی اور ناانصافی بغاوت پر آمادہ نہیں کرے گی۔ وہ کروڑوں کی حسرت کو چھوڑ کر ڈھائی یا تین لاکھ کی ٹیکسی سے نہیں بیلے گا۔ باغی ہو جائے گا۔“

”دو کوڑی کا باغی ہمارا کیا پاگلے گا؟“

”تمہارا باپ بھی دو کوڑی کا تھا مگر تمہارے نانا جان نے ایک عقل کی بات سمجھائی کہ وہ دو کوڑی کا آدمی میری بے آبروئی اور اعلیٰ خاندان کی بے شرمی کا رازدار ہے۔ اگر چہ وہ شریف ہے، مجھ پر کچھ نہیں اچھالے گا۔ مگر میرے باپ کی آنکھیں اس کے سامنے جھکی رہیں گی۔ پھر یہ فطری امر ہے کہ دال روٹی کھانے والے کو مرغن مرغی ملے یا کھار کے بیٹے کو شنزادی ملے تو وہ اپنی خوشی اپنے اندر چھپا کر نہیں رکھ پاتا۔ چاہتا ہے کہ دنیا اس کے نصیب پر رشک کرے۔ اس لیے وہ دوست احباب میں بیٹھ کر چٹارے لے کر شب وصال کے قصے چھیڑتا ہے اور ایسا نہ بھی کرے، بات چھپائے رکھنا چاہے تب بھی شنزادی کی جدائی میں ٹکلی ہوئی ایک آہ کبھی شاعری بن کر اور کبھی نقارہ بن کر گھر گھر پہنچ جاتی ہے۔“

شائستہ کے دل کو ماں کی بات لگ رہی تھی کہ بشارت آقا زادی کے حسن و شباب اور بے انتہا دولت سے محروم ہو کر دوست کبھی نہیں رہے گا۔ وہ لالچی ہے۔ اس کی اپنی کوئی عزت نہیں ہے، وہ اسے مختلف ہتھکنڈوں سے بلیک میل کر کے بڑی بڑی رقیں حاصل کرنے کی راہ اختیار کرے گا۔

رشیدہ نے کہا۔ ”میں تیری باعزت واپسی چاہتی ہوں۔ اس کے لیے بشارت کی

زبان کو ہمیشہ کے لیے بند کرنا ہوگا۔“

”میں لیلیٰ نہیں ہوں۔ بشارت سے دیوانہ وار محبت نہیں کرتی ہوں، اسے دودھ کی کچی کی طرح نکال پھینکنے والی ہوں۔ لیکن اب سلامت اور سرفراز والا ڈراما دہرانا مجھے پسند نہیں ہے۔“

”تمہیں پسند نہ ہو۔ مجھے تو اپنی خاندانی روایات پر چلنا ہے۔ سلامت کو خاک میں ملانا میرے باپ کے لیے لازمی ہو چکا تھا۔ سرفراز کو حرام موت مارنے کی قسم تم نے پوری کی۔ آج میں بشارت کو جہنم میں پہنچانے کی قسم کھاتی ہوں۔ میں نے اپنے باپ کے اور تمہارے معاملات میں مداخلت نہیں کی۔ اب تم میرے معاملے میں کچھ نہیں بولو گی۔ مجھے صرف تمہیں ہی نہیں شازیہ کو بھی عزت سے بیاہنا ہے اور ایک ڈراما یور بشارت کے سامنے اپنے بیٹے زہیر کا سر نہیں جھکانا ہے۔“

شائستہ نے بحث نہیں کی۔ چپ چاپ سنتی رہی۔ رشیدہ نے کہا۔ ”یہ ہمارے لیے بہتر تھا کہ وہ اندھا ہو گیا تھا۔ تم اسے نئی آنکھیں دے کر گویا سانپ کو دودھ پلا رہی ہو۔ وہ پھر سے آنکھوں والا ہو کر پراہلم بن سکتا ہے۔ میں پوچھتی ہوں، اسے بینائی دینے کا مقصد کیا ہے؟“

”ممی! میرا جواب شاید پوری طرح آپ کی سمجھ میں نہ آئے۔ جب سے آنکھیں مل جائیں گی اور آپ اس کے سامنے جائیں گی، تب اس کی آنکھوں میں جھانک کر معلوم ہوگا کہ میں نے سرفراز کو مار کر بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا ہے، اس کی جاگتی ہوئی زندہ نگاہوں کو بشارت کی آنکھوں میں قید کر دیا ہے۔“

رشیدہ نے اس پہلو پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ وہ سرفراز کی موت کے بعد بھی بشارت کی آنکھوں میں اسے جاگتے ہوئے دیکھے گی۔ اس بات نے اس کے دل کی دھڑکنوں کو تیز کر دیا تھا۔ کوئی اپنا مرجائے تو اسے دیکھنے کے لیے صرف اس کی تصویر ہی رہ جاتی ہے۔ پہلے مقتول شوہر کی تو تصویر بھی دیکھنے کو نہیں ملی تھی۔ یہ خیال دل دھڑکا رہا تھا کہ دوسرا شوہر قتل ہونے کے بعد بھی اسے آنکھیں دکھاتا رہے گا۔

☆-----☆-----☆

آپریشن کے بعد ہوش آیا تو چند لمحوں تک اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس پر کیا

گزری تھی اور وہ کہاں ہے۔ پھر رفتہ رفتہ ذہن صاف ہونے لگا۔ یاد آگیا کہ اسے نئی بینائی کے لیے آپریشن تھیٹر لے جایا گیا تھا۔ پھر ایک انجکشن لگاتے ہی وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ پتا نہیں بے ہوشی کے دوران اس پر کیا گزرتی رہی۔ اب یقین تھا کہ بینائی بحال کر دی گئی ہے۔ پتی ہٹائی جائے گی پھر آنکھیں کھولی جائیں گی تو دنیا نظر آئے گی۔ اس کے بعد پھر کبھی بینائی آنکھ مچولی نہیں کھیلے گی۔

ابھی آنکھیں بند تھیں۔ وہی اندھے پن کی تاریکی مسلط تھی۔ یہ تاریکی احساس دلا رہی تھی کہ روشنی کتنی اہم ہوتی ہے۔ اس کے بغیر آدمی اپنا ایک ناخن بھی نہیں دیکھ سکتا۔ خلوت اور جلوت میں سرستیں دینے والی محبوبہ کا جاذب نظر حسن و شباب نظر نہیں آتا۔ اس کے گلابی ہونٹوں پر تبسم بھی دکھائی نہیں دیتا۔ چھوٹے سے بدن ملتا ہے، تبسم نہیں ملتا۔ لوگ میٹھے بول کے پیچھے کڑوا اگلتے ہیں۔ ایسے میں میٹھاسنائی دیتا ہے کڑوا دکھائی نہیں دیتا۔ جو اندھے ہو جاتے ہیں، وہ زندہ رہتے ہیں، نہ مردہ کہلاتے ہیں۔ ان حالات میں وہ شائستہ کو پا کر خود کو دنیا کا سب سے خوش نصیب شخص سمجھ رہا تھا۔ حسینہ مل رہی تھی، دولت مل رہی تھی اور حسینہ کی مہربانیوں سے نئی بینائی حاصل ہو رہی تھی۔ ایسے وقت اس کی آواز سنائی دی۔ ”کیسے ہو؟“

وہ خوش ہو کر بولا۔ ”شائ! تم؟ تم آگئیں؟ کہاں چلی گئی تھیں؟“

”لاہور گئی تھی۔ دکھاوے کا ماتم کرنے۔ ویسے تم آئندہ مجھے شائی نہ کہنا۔“

”کیوں؟ وہ۔ وہ تم نے ہی کہا تھا کہ.....“

”پہلے وہ کہا تھا اب یہ کہہ رہی ہوں۔ میں دشمن سے انتقام لینے گھر سے بے گھر ہوئی تھی۔ وہ دشمن جہنم میں پہنچ گیا ہے۔ اب مجھے اپنے اعلیٰ خاندان کے عزت داروں میں رہنا ہے۔ ان رشتوں کو پھر سے جوڑنے کے لیے یہ رشتہ توڑنا ضروری ہے۔“

”تم یہ کہہ کر دل توڑ رہی ہو کہ میں تمہارے لائق نہیں ہوں۔ عزت دار نہیں ہوں۔“

”تمہارے جیسے لوگ اپنے گھروں میں اور اپنے چھوٹے سے حلقوں میں عزت دار ہوتے ہیں۔ یہ عزت کو ٹھیوں تک ریگ کر آتے آتے دو کوڑی کی نہیں رہ جاتی۔ غلامی اور خدمت گزاری میں بدل جاتی ہے۔ تم اگلی سیٹ کے ڈرائیور ہو اور میں پچھلی سیٹ کی

آقا زادی ہوں۔ کیا میری باتیں تمہارے لیے پڑ رہی ہیں؟“

”ہاں۔ پتا نہیں ڈاکٹر یہ پتی کب کھولیں گے۔ مگر آپ نے آنکھیں کھول دی ہیں۔“

آئندہ آپ کو بی بی جی کہا کروں گا لیکن.....“

”ہاں بولو۔ رک کیوں گئے؟“

”کیا مجھے اس اسپتال میں بے یار و مددگار چھوڑ جائیں گی؟“

”میں نے آپریشن اور اسپتال کے تمام بل ادا کر دیے ہیں۔ تم یہاں سے اسی مکان میں جاؤ گے، جسے ہم نے کرائے پر لے رکھا ہے۔ میں کسی دن وہاں آؤں گی۔ پھر تم سے معاملات طے کروں گی۔ تمہارے مستقل روزگار کا بندوبست کرنے کے بعد چلی جاؤں گی۔“

وہ جانے لگی۔ فرش پر سینڈل کی اونچی ایڑیاں بج رہی تھیں۔ اس نے آواز دی ”شائ۔ نن۔ نہیں۔ بی بی جی! بی بی جی!“

مگر اونچی ایڑیوں کی آوازیں دور ہوتے ہوتے معدوم ہو گئیں۔ کچھ دیر پہلے وہ خود کو خوش نصیب سمجھ رہا تھا۔ اب وہ مہربان حسینہ اپنا دامن جھٹک رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہزاروں لاکھوں روپے کی عیاشی بھی گزرا ہوا خواب بننے والی تھی۔ پنڈ سے چلا تھا، بڑا آدمی بننے کے لیے، اب سکر کر پھر سے بہت چھوٹا ہو رہا تھا۔ بہت بلندی سے لڑھکتا ہوا پستی کی طرف جارہا تھا۔ کوئی بلندی سے پستی اور جنت سے جہنم کی طرف جانا نہیں چاہتا۔ وہ بھی نہیں چاہتا تھا۔ شائستہ کے بدلے ہوئے رویے پر حیران بھی ہو رہا تھا۔ پریشان بھی ہو رہا تھا۔ پھر تھلا رہا تھا۔ اپنی ناقدری پر غصہ آ رہا تھا۔

اور ایک وفادار بندہ مالک کی گالیاں برداشت کر لیتا ہے، ناقدری برداشت نہیں کرتا۔ اس نے شائستہ کی گالیاں سنیں۔ طمانچہ کھایا۔ اس کے تلوے چاٹے۔ اس کے لیے ایک قاتل بن گیا۔ ایسی تابعداری سے اس کی قدروقیمت میں اضافہ ہونا چاہیے۔ تھا۔ اس کے برعکس وہ اسے ٹھکرا رہی تھی۔ یہ تو سراسر غصہ دلانے اور باغی بنانے والی بات تھی۔

اس کے اندر دھواں سا بھر رہا تھا۔ وہ عیش و آرام والی جو زندگی گزار رہا تھا اسے کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ تمام عیش و آرام کی کتنی شائستہ تھی۔ عقل یہی سمجھا

رہی تھی کہ وہ شائستہ کو پکڑے رہے ہاتھ سے نہ جانے دے۔ وہ گئی تو ساری زندگی ہزار دو ہزار روپے کی ڈرائیوری رہ جائے گی۔ اب وہ مفلسی اور محتاجی کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ سوچنے لگا۔ ابھی سنبھلنے کا وقت ہے۔ شائستہ کسی دن اس مکان میں ملنے آئے گی۔ وہ محبت سے، اطاعت سے اور غلامی سے کسی طرح بھی پھر اس کے دل میں جگہ بنائے گا۔ پھر اس کی محبت اور مہربانیاں حاصل کر لے گا۔

اس روز وہ اسی پہلو سے سوچتا رہا اور اسے محبت سے جیت لینے کی تدبیریں ذہن میں پکاتا رہا۔ اب تو وہ تھا، اس کی تنہائی تھی اور چاروں طرف تاریکی تھی۔ ایسے میں ہر پہلو سے سوچنے سمجھنے کا وقت مل رہا تھا۔ دوسرے تیسرے دن عقل نے سمجھایا، اس نے حسینہ کو محبت دی، مردانگی دی، خدمت گزار ہوا اور اس کی خاطر قتل جیسی بھیانک واردات کا مرتکب ہوا۔ وہ پھر بھی اپنے مطلب کی بندی رہی۔ مطلب نکل گیا ہے تو پہلی ٹھوکر مار کر گئی ہے۔ پھر آخری ٹھوکر مارنے کے لیے آنے والی ہے۔ اگر دانشمندی سے بلکہ مکاری سے کام نہ لیا گیا تو وہ مکار حسینہ ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ وہ قیمتی کاروں سے نکل کر تمام عمر پیدل چلنے والوں کی دنیا میں پہنچ جائے گا۔

سوچتے سوچتے دن رات گزرتے گئے پھر ایک دن ڈاکٹر نے پٹی کھولنے سے پہلے پوچھا۔ ”تمہیں نئی آنکھیں نئی زندگی ملنے والی ہے، پہلے کسے دیکھنا چاہو گے؟“

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ ”جسے دیکھنا چاہتا ہوں، وہ لاہور میں ہے۔ کل رات اس کا فون آیا تھا کہ وہ آج شام کو آنے والی ہے۔“

ڈاکٹر نے اس کی آنکھوں سے پٹی ہٹائی۔ بند آنکھوں کو کھلی روٹی سے صاف کر کے کہا۔ ”آہستہ آہستہ آنکھیں کھولو۔“

اس نے بسم اللہ پڑھتے ہوئے آہستگی سے آنکھیں کھولیں۔ کمرے کا دروازہ اور کھڑکی بند تھی۔ پردے پڑے ہوئے تھے۔ اس لیے دن کو بھی دھیمی دھیمی سی روشنی تھی۔ نگاہوں کے سامنے تازہ کھلے ہوئے پھولوں کا گلدستہ کچھ فاصلے پر تھا۔ بشارت کو صاف طور سے دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے خوش ہو کر نرس کو پھر ڈاکٹر کو دیکھا۔ وہ سب مسکرا رہے تھے اور اسے مبارکباد دے رہے تھے۔ اس نے پوچھا۔ ”ڈاکٹر صاحب! اب

بیٹائی تو نہیں جائے گی نا؟“

”انشاء اللہ ایسی کوئی بات نہیں۔ ہمیشہ خوش رہا کرو۔ ہر دوسرے دن آکر معائنہ کرواؤ۔ یہ دوا آنکھوں میں ڈالتے رہو۔ ایک ہفتے بعد پھر یہاں آنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔“

شائستہ اسے مکان کی چابیاں دے کر گئی تھی۔ وہ اسپتال سے ٹیکسی میں آیا۔ مکان کے احاطے میں کار کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے ہر کمرے کا دروازہ کھول کر دیکھا۔ تمام سامان اپنی جگہ جوں کا توں تھا۔ شائستہ کا بڑا سوٹ کیس اور کچھ چیزیں رکھی ہوئی تھی۔ وہ دوسرے کمرے میں آکر ذرا ٹھٹک گیا۔

اس خالی بستر پر نظر آگئی، جہاں اس نے سرفراز کو دبوچ کر مار ڈالا تھا۔ اب وہ نہیں تھا۔ لیکن وہ تصور میں تروتازہ زندگی کے لیے لڑتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ فوراً ہی پلٹ کر کمرے سے باہر آگیا پھر شائستہ کے کمرے میں آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کے خالی بستر کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم نے مجھے قاتل بنا دیا ہے۔ جبکہ مقتول سے میری کوئی دشمنی نہیں تھی۔ میں نے جو کیا، تمہارے لیے کیا۔ تم میرے لیے کیا کر رہی ہو؟ مجھے دھکے مار کر اپنی زندگی سے نکال رہی ہو؟“

اس نے الماری کی طرف دیکھا۔ اس میں لاکھوں روپے اور زیورات تھے۔ اس نے سوچا۔ جب وہ تمام سامان چھوڑ کر گئی ہے تو مال و زر بھی چھوڑ گئی ہوگی۔ اس نے چابیوں کے گچھے سے ہر چابی آزمائی۔ الماری کو کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں کھلی۔

اس نے پٹنگ کے سرہانے والی میز کی دراز کو کھول کر دیکھا۔ اس میں کار کے کانڈات کے ساتھ اس کی چابی بھی تھی۔ وہ چابی لے کر باہر آیا۔ مکان کے دروازے کو مقفل کیا۔ پھر کار لے کر قریبی مارکیٹ میں آیا۔ وہاں تالے مرمت کرنے اور چابیاں بنانے والے کی دکان تھی۔ اس نے کہا۔ ”میری ڈبل لاک والی الماری کی چابیاں گم ہو گئی ہیں۔ میرے گھر چل کر اس کی چابیاں بنا دو۔ میں تمہیں کار میں واپس لا کر چھوڑ دوں گا۔“

وہ اس کارمگر کو گھر لے آیا۔ اس نے پندرہ منٹ میں ڈبل لاک کی دو چابیاں بنادیں۔ بشارت نے اسے کھول کر دیکھا۔ اس..... اندرونی سیف کی چابیاں وہاں رکھی

ہوئی تھیں۔ کاریگر نے دو سومانگے تھے اس نے ڈھائی سو دے کر کہا۔ ”تم رکشایا نہیں
میں چلے جاؤ۔ میں تھک گیا ہوں۔“

وہ چلا گیا۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کیا، پھر آکر الماری کھولی۔ اندر رکھی
ہوئی چابیاں اٹھا کر سیف کو کھولا تو وہ تقریباً خالی تھا۔ نوٹوں کی چند گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔
پچاس ساٹھ ہزار سے زیادہ رقم نہیں تھی۔ وہ تقریباً بائیس چوبیس لاکھ نقد اور ہیرے موتی
بڑے ہوئے لاکھوں کے زیورات لے گئی تھی۔ سیف کے اندر نوٹوں کی گڈیوں کے پاس
دوا کی وہ شیشی تھی جس نے سرفراز کا دماغ الٹ دیا تھا۔ اس نے مایوس ہو کر سیف اور
الماری کو بند کر دیا۔ یہ ارادہ کیا تھا کہ لاکھوں روپے ہوں گے تو چرا کر لے جائے گا تو کسی
دور افتادہ چھوٹے سے علاقے میں جا کر رہے گا۔ دو چار برس بعد معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو
کسی گنجان آبادی والے شہر میں رہ کر دوبارہ کرے گا۔ اس کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ
ہوا۔

اس نے بدن کھاتے ہوئے سوچا۔ کئی دنوں سے غسل نہیں کیا ہے۔ شیو بھی بڑھ
گیا ہے۔ شائستہ شام کی فلائٹ سے آنے والی ہے۔ اپنا حلیہ درست رکھنا چاہیے۔ وہ
شیونگ کا سامان لے کر ہاتھ روم میں آیا۔ پھر واش بیسن کے پاس آئینے کے سامنے پہنچا۔
اپنے بڑھے ہوئے شیو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آئینے میں دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا۔ ایک
دم سے گھبرا کر ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ آئینے کے اندر سے سرفراز اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ چیخا چاہتا تھا مگر اسی لمحہ میں اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ آئینے میں سرفراز نہیں
تھا۔ وہ خود ہی تھا۔ یہ محض احساس تھا کہ سرفراز دیکھ رہا ہے جبکہ وہ سرفراز کی آنکھوں
سے خود کو دیکھ رہا تھا۔

آنکھوں کی پتلیوں کا ایک ننھا سا حصہ تبدیل ہو جائے تو شخصیت تبدیل نہیں ہوتی
اور نہ ہی صورت بدل جاتی ہے۔ بندہ وہی رہتا ہے۔ بشارت بھی وہی پہلے والا ہی بشارت
تھا۔ مگر احساسات بدل گئے تھے۔ ایک تو یہ ناقابل انکار حقیقت تھی کہ سرفراز کی آنکھوں
سے دنیا کو دیکھ رہا ہے۔ یہی بات یوں سمجھ میں آرہی تھی کہ اس نے جسے قتل کیا ہے وہ
اس کی آنکھوں میں چھپ کر اسے آئینے کے اندر سے دیکھ رہا ہے۔ سرفراز کی آنکھیں
زندہ ہیں اور وہ جب بھی آئینہ دیکھے گا وہ آنکھیں اپنے قاتل کو گھورتی رہیں گی۔

وہ تھوڑی دیر تک نظریں چراتا رہا۔ پھر اس نے حوصلہ کر کے آئینے میں دیکھا۔
آئینے کے عکس میں اپنے چہرے کے دوسرے حصوں کو دیکھا صرف آنکھوں کو نہیں دیکھا
اور دل میں کہتا گیا کہ یہ میں ہی ہوں، سر سے پاؤں تک میں ہی ہوں۔

پھر اس نے جھپکتے ہوئے اپنی آنکھوں میں جھانکا تو یوں لگا، سرفراز کی آنکھوں میں
جھانک رہا ہے۔ وہ وہاں سے لگا ہیں ہٹا نہ سکا۔ وہ آنکھیں اسے سحرزدہ کر رہی تھیں، اس
پر تنویدی عمل کر رہی تھیں اگر وہ کسی سے کہتا کہ آنکھیں آئینے سے جھانک کر اسے جکڑ
رہی ہیں تو کوئی یقین نہ کرتا مگر ہاں علم نفسیات کو جاننے اور سمجھنے والے سمجھ لیتے کہ ماجرا
کیا ہے؟

حقیقت یہ تھی کہ احساس جرم اسے جکڑ رہا تھا۔ اس کے اندر چھپا ہوا خوف اسے
پکڑ رہا تھا۔ اس نے پہلے سرفراز سے وعدہ کیا تھا کہ اس کا وفادار رہے گا لیکن اسے وہ دکا
دے کر شائستہ کا دیوانہ بن گیا تھا۔ اب سرفراز کی آنکھیں اسے جکڑ کر پوچھ رہی تھیں۔
”بولو! مجھے فریب دے کر کیا پایا؟ اس حرافہ کے بستر سے بڑے بے آبرو ہو کر نکل رہے
ہو۔“

وہ جواب نہیں دے سکتا تھا۔ وہاں سے نظریں ہٹا کر جانا چاہتا تھا مگر نظریں تھیں کہ
سرفراز کی آنکھوں سے ملنے کے بعد اسی کی تابع ہو کر رہ گئی تھیں اور وہ آنکھیں کہتی ہوئی
سی لگ رہی تھیں۔۔۔ ”مجھ سے کترا کر کہاں جاؤں گے؟ اب تو میں سوتے جاگتے تمہارے
ساتھ رہا کروں گی۔ اگر مجھے دوست رکھنا چاہتے ہو تو میرا قرض ادا کرو۔ میں نے تمہیں
دس ہزار روپے دیے تھے۔“

تب وہ آئینے سے بولا۔ ”ہاں، میں نے تمہارا کام نہیں کیا۔ میں تمہاری رقم لوٹا
دوں گا۔“

”کہاں لوٹاؤ گے؟ کیا وہ رقم میری قبر میں رکھنے آؤ گے؟ میں نے اس لیے ادا کی
کی تھی کہ وہ دوا شائستہ کو پلاؤ گے لیکن تم نے مجھے پلا دی۔ میرا جو انجام ہونا تھا وہ ہو چکا
ہے، تم میرا قرض ادا کرو۔“

”کیسے ادا کروں؟“

”وعدہ پورا کرو۔ مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ شائستہ کو دوا پلاؤ گے۔ وعدہ پورا کرو، جاؤ“

وعدہ پورا کرو۔ ورنہ یہ آنکھیں تمہیں سونے نہیں دیں گی۔“

بشارت نے آنکھیں بند کیں۔ آئینہ گم ہو گیا۔ اس نے منہ پھیر کر آنکھیں کھولیں۔ اب سرفراز سے سامنا نہیں ہو رہا تھا۔ وہ گھبراہٹ میں ڈگمگاتا ہوا ہاتھ روم سے باہر آیا۔ کمرے میں پہنچ کر ایک صوفے پر گر پڑا۔ اسے وہ منظر یاد آ رہا تھا جب لاہور میں سرفراز نے اسے دس ہزار روپے دیے تھے۔ پھر دوا کی وہ شیشی دی تھی۔

بشارت نے چونک کر الماری کی طرف دیکھا۔ وہ شیشی الماری کے سیف میں رکھی ہوئی تھی۔ وہ پچھلے کئی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ شائستہ کو اپنے قابو میں رکھنے کے لیے اس کی مکاری کا جواب مکاری سے دینا چاہیے۔ اب آئینے میں اور سرفراز کی آنکھوں میں جھانک کر دماغ میں یہ تدبیر روشن ہو گئی کہ وہ دو تیند حینہ کو نیم پاگل اور کمزور بنا کر اسے اپنے ساتھ رہنے پر مجبور کر سکتا ہے۔

وہ فوراً ہی اٹھ کر الماری کے پاس آیا۔ اسے کھول کر سیف سے وہ شیشی نکالی۔ اسے مسکرا کر دیکھا۔ تیزی سے چلتا ہوا آئینے کے سامنے آیا۔ پھر سرفراز کی آنکھوں کو وہ شیشی دکھا کر ہنسنے لگا۔ ”میں تم سے خوف زدہ ہو رہا تھا۔ تم تو دوست ثابت ہو رہے ہو۔ تم نے صرف میری آنکھیں ہی نہیں، کھوپڑی بھی روشن کر دی ہے۔“

پھر وہ اپنے عکس کی آنکھوں میں گہری سنجیدگی اور خاموشی سے یوں دیکھنے لگا جیسے پھر ان عامل آنکھوں کی باتیں سن رہا ہو اور ان باتوں کی تائید میں کبھی کبھی سر ہلا رہا ہو۔ وہ دراصل یہ نہیں سمجھ رہا تھا کہ خود ہی سوچ رہا ہے اور جو تدبیر سوچ رہا ہے، اس کی تائید میں سر ہلا رہا ہے۔ اس کا اپنا ذاتی خیال یہ تھا کہ سرفراز کی آنکھیں اسے سحر زدہ کر کے اپنا قرض وصول کر رہی ہیں۔

پھر وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گیا۔ سرفراز کی آنکھوں نے اسے جو تدبیر بتائی تھی، اسی پر عمل کرنے لگا۔ وہ اسٹور روم میں پڑی ہوئی ایک خالی شیشی لے آیا۔ اسے اچھی طرح دھونے کے بعد اس نے سیف سے نکالی ہوئی شیشی کی دوا اس خالی شیشی میں ڈال دی۔ اسے بند کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ پھر پہلی شیشی کو اچھی طرح دھو دیا تاکہ اندر رہی سہی دوا بھی حل جائے۔ اس دوا کا رنگ ایک مشروب کے رنگ سے ملتا جلتا تھا۔ اس نے فریق سے وہ ٹھنڈی بوتل نکالی اسے کھول کر اس شیشی میں اتنی مقدار ڈالی

جتنی پہلے اس میں قہر اسے بند کر کے وہ ٹھنڈی بوتل پیتا ہوا الماری کے پاس آیا۔ سیف کے اندر وہ شیشی جمل رکھی ہوئی تھی، وہیں اس نے رکھ دی۔ الماری کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ روپے کی گڈیوں میں سے ایک نوٹ بھی نہیں نکالا۔ سیف اور الماری کو لاک کر کے باہر لان میں آکر الماری کی ڈپٹی کیٹ چابیاں ایک پودے کے پاس مٹی میں چھپا دیں۔

باہر کسی نے کال بیل کاٹن دلیا۔ اس نے آہنی گیٹ سے اوپر سر نکال کر دیکھا۔ ڈاکے نے ایک لفافہ بڑھا دیا۔ لفافے کے پیچھے اس کے باپ دینو کھمار کا نام تھا۔ اس نے خوش ہو کر ڈاکے کو دس روپے دیے۔ پھر لفافہ چاک کرتا ہوا برآمدے میں آکر بیٹھ گیا۔ یہ کیا ہوا خط کھول کر پڑھنے لگا۔ لکھا ہوا تھا۔

”پتر بشارے! تو سلامت رہے ہزار برس۔ پر ہماری سلامتی کے برس گزر چکے ہیں۔ تجھے صدمہ تو ہو گا۔ لیکن بتانا ہی ہو گا تیری ماں اللہ کو پیاری ہو گئی ہے۔“ وہ پڑھتے پڑھتے رک گیا۔ اس خبر سے ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ دل دکھ رہا تھا۔ نگاہوں کے سامنے ماں کا مسکراتا ہوا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ متا ہمرے لمبے میں کہہ رہی تھی۔ ”غم نہ کر پتر! خوب محنت سے علم حاصل کر اور وڈا افسر بن کر آ.....“

اس کا سر نہامت سے جھک گیا۔ ماں باپ اسے علم و عمل کے ذریعے بڑا آدمی بننے دیکھنا چاہتے تھے اور وہ بے علم و بے عمل ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا پھر پڑھنے لگا، آگے لکھا ہوا تھا۔

”تیری ماں ہر دوسرے تیرے روز کہتی تھی۔ دیکھ بشارے کے ابا! چھت پر کاگا بول رہا ہے۔ آج ہمارا بیٹا ضرور آئے گا۔ پنڈ میں اس بات کا خوب چرچا تھا کہ تو ہر ماہ ہزار ڈیڑھ ہزار روپے بھیجتا رہتا ہے۔ جس دن تیرے پانچ ہزار روپے ہمیں ملے، پورے پنڈ میں دھوم مچ گئی۔ تیری ماں کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ میری عقل کہتی ہے کہ وہ خوشی برداشت نہیں کر سکی۔ رات میں نے اسے کروٹیں بدلتے دیکھا۔ صبح ہوئی تو وہ چوکھٹ پر بیٹھی باہر تک رہی تھی۔ پتہ نہیں کب اس کا دم نکل گیا تھا۔ ہماری چھت پر کاگا بول رہا تھا۔“

اس کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ خط کی تحریر دھندلا گئی۔ وہ قیص کے دامن

سے آنکھیں پونچھ کر پھر پڑھنے لگا۔ آگے لکھا ہوا تھا۔

”بیٹے! تیری ماں کے بعد میری باری ہے۔ میں موت سے نہیں گھبراتا۔ ایک دن تو مرنا ہی ہے۔ مگر یہ سوچ کر پریشان ہوتا ہوں کہ تجھے بڑا افسریا بڑا آدمی بننے دیکھ سکوں گا یا نہیں؟ پتا نہیں تو شمریں کیا کر رہا ہے۔ ایسا کون سا درخت اگایا ہے جس میں ہزاروں نوٹ پھل رہے ہیں اور تو انہیں توڑ توڑ کر بھیج رہا ہے۔ ایک دن چودھری کہہ رہا تھا تو اسمگلر بن گیا ہے یا منشیات کا دھندا کرتا ہے۔ کسی ملازمت کرنے والے کی ایسی اندھی کمائی نہیں ہوتی۔

”میں جانتا ہوں‘ چودھری دشمن کی زبان سے بولتا ہے۔ پرچ بات تو یہ ہے کہ میرا دل بہت کمزور ہو گیا ہے۔ مجھے ڈر سا لگنے لگا ہے۔ میری ایک بات ماں لے بیٹا! ایک دن کے لیے یہاں آجا۔ پنڈ کے حامد لوگ چودھری کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں۔ تیرے آنے سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ پھر چرچی بات یہ ہے کہ میں مرنے سے پہلے تجھے دیکھ لوں گا۔

”اس تھوڑے لکھے کو بہت سمجھ کر آجا بیٹا! اب میں بھی چو کھٹ پر بیٹھنے لگا ہوں۔ میرے سر پر بھی کاگا بولتا ہے۔ آجا پتر آجا۔ فقط تیرا ابا دین محمد۔“ وہ خط پڑھنے کے بعد اس کی تحریر کو نکلتا رہا۔ پھر وہاں سے اٹھ کر کمرے میں آگیا۔ کاغذ قلم لے کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا اور سوچ سوچ کر لکھنے لگا۔

”پیارے ابا جان! میں بہت بد نصیب ہوں۔ اپنی ماں کو آخری بار نہ دیکھ سکا۔ وہ ماسا کی ماری میرا انتظار کرتے کرتے اتنی دور جا چکی ہے کہ میں کبھی اسے اپنی صورت نہیں دیکھ سکوں گا۔ میں آج سے ماں کے لیے قرآن خوانی کروں گا۔“

وہ اتنا لکھ کر رک گیا۔ اسے یاد آیا‘ جب بھی بیٹائی جایا کرتی تھی تو گڑگڑا کر معافی مانگتا تھا اور توبہ کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ سے وعدہ کرتا تھا کہ اب کی بار بیٹلی واپس آئے گی تو وہ کلام پاک کی تلاوت کرے گا لیکن بیٹلی جاتی آتی رہی‘ وہ تلاوت کلام پاک کی مقدس گھڑی کبھی نہیں آئی۔ وہ دنیاوی چال بازیوں میں الجھا رہا۔

اب بھی وہ خط میں جھوٹ لکھ رہا تھا کہ ماں کے ایصالِ ثواب کے لیے قرآن پڑھے گا۔ پہلے تو وہ شائستہ کی فوج میں بھرتی ہوا تھا اور سرفراز کو ٹھکانے لگانے میں

مصروف رہا تھا۔ اب شائستہ کے خلاف اپنی لالچی خواہشات کی فوج بنائی۔ آج پہلا حملہ کرنے والا تھا۔ نہ جا۔ یہ جنگ کب تک جاری رہنے والی تھی اور کب اللہ کا نام لینے کی فرصت ملے والی تھی۔

اس نے - ۴ - ”کیا ہوا اگر مجھے فرصت نہیں ملے گی۔ کچھ رقم خرچ کر کے مسجد میں قرآن خوانی یادوں گا۔“

اس نے آگے لکھا۔ ”ابے! تیری یاد بہت آتی ہے‘ جی چاہتا ہے ابھی تیرے قدموں میں آ جاؤں لیکن کاروبار نے مجھے بری طرح الجھا رکھا ہے۔ پھر بھی میں جلد ہی آنے کی کوشش کروں گا بلکہ آکر تجھے اپنے ساتھ شہر لے آؤں گا۔

”چودھری بکواس کرتا ہے۔ میں شائستہ بلڈرز کا مالک و مختار ہوں۔ آج کل بہت اونچی عمارت بنا رہا ہوں۔ جب اس موچائی پر پہنچ جاؤں گا تو چودھری کا گریبان پکڑ کر اسے اپنی بلندی دکھاؤں گا۔ تو فکر نہ کر کتوں کو بھونکتے رہنے دے اور بتا‘ نکے ماما کا کیا حال ہے بیٹو کی شادی ہوئی یا ماما‘ داماد ڈھونڈتا پھر رہا ہے؟ مجھے بیٹو پر بڑا ترس آتا ہے۔ پنڈ کے تمام بزرگوں کو میرا بہت بہت سلام کہنا۔ ماؤں‘ بہنوں اور بھائیوں کو بھی اسلام علیکم۔ اگلے خط میں آنے کی تاریخ لکھوں گا۔ تو فکر نہ کر۔ بس سمجھ لے آیا ہی آیا۔ فقط تیرا کماؤ پتر بشارت۔“

اس نے خط لکھ کر قلم کیا۔ اس کے بعد پھر شیو کرنے آئینے کے سامنے آیا پھر جب تک شیو کرتا رہا‘ سرفراز کی آنکھیں اس سے باتیں کرتی رہیں اور اس سے دوستی بڑھاتی رہیں۔ بے شک آنکھیں زبان سے زیادہ بولتی ہیں بلکہ زبان جو بول نہیں پاتی وہ دیدہ دلیری سے بول دیتی ہیں۔ دنیا سمجھے نہ سمجھے آنکھیں اندر کے چھپے ہوئے جرائم کے بھید کھولتی رہتی ہیں۔ بشارت نے سمجھ لیا تھا اسی لیے سرفراز کی آنکھوں کا مطبوعہ فرمانبردار بن گیا تھا اور اس کی خاموش زبان کو خوب سمجھنے لگا تھا۔

وہ مکان کو لاک کر کے کار میں بیٹھ کر باہر گیا۔ ایک جگہ اس خط کو پوسٹ کیا۔ پھر شام کو واپس آیا۔ مکان کا دروازہ خلا ہوا تھا۔ اس کی دوسری چابی شائستہ کے پاس تھی۔ وہ لاہور سے آگئی تھی۔ بشارت اس کی خواب گاہ میں آیا۔ وہ غصے سے ٹہل رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی بولی۔ ”کہاں گئے تھے؟ وہ تمہارے باپ کی کار ہے‘ جسے تم لے گئے تھے؟

وہ حکم کی تعمیل کرتا ہوا دوسرے کمرے میں آگیا۔ یہ خوب سمجھ رہا تھا کہ وہ اسے

وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر سنگار میز کے آئینے کے سامنے آیا اور اپنے عکس میں سرفراز کو دیکھنے لگا۔ آئینے سے جھانکنے والی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ ”یہ بڑے گھومنی شروع

غلام بنائے رکھنے کے لیے پہلے نیم پاگل بنائے گی۔ اسے چائے میں دوا ملا کر دے گی۔ پھر جب وہ پوری طرح پاگل ہو جائے گا اور یہ اندیشہ نہیں رہے گا کہ وہ اونچے خاندان کی لڑکی کو بدنام کرے گا اور کرے گا تو اس پاگل کی باتوں کا کوئی یقین نہیں کرے گا تب وہ اسے پاگل خانے بھیج دے گی۔

وہ تھوڑی دیر بعد کمرے میں آئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں چائے کی پیالی اور دوسرے ہاتھ میں ٹھنڈی بوتل تھی۔ وہ اسے پیالی دیتے ہوئے بولی۔ ”فرنج میں یہی ایک بوتل تھی۔ تم نے ساری بوتلیں خالی کر دی ہیں۔ کیا صبح شام بوتلیں ہی پیتے رہتے ہو؟“

بشارت نے دانستہ ایک ہی بوتل فرنج میں چھوڑی تھی اور اس میں دوا ملا رکھی تھی۔ شائستہ کے لیے دوسری چوائس نہیں تھی۔ بشارت کی تدبیر کے مطابق وہ وہی اکلوتی بوتل پی رہی تھی اور اسے غور سے چائے پیتے دیکھ رہی تھی۔

وہ آدمی پیالی پینے کے بعد بولا۔ ”چائے کا مزہ کچھ عجیب سا ہے۔“

اس نے پیالی ایک طرف رکھ دی۔ شائستہ پیالی کو اٹھا کر بولی۔ ”میں اتنی محبت سے تمہارے لیے لائی ہوں اور تم انکار کر رہے ہو۔“

”اگر مگر کچھ نہیں۔ تمہیں میری جان کی قسم اسے پی لو۔“

”تم اتنی محبت سے کہہ رہی ہو تو میں زہر بھی پی لوں گا۔ تمہاری بھی بوتل آدمی وہ گئی ہے۔“

”میں پی رہی ہوں۔“

وہ دونوں پینے لگے۔ بشارت نے دیر سے پیالی خالی کی۔ تاکہ وہ ساتھ ساتھ بوتل خالی کرتی رہے۔ پھر وہ ہنسنے لگی۔ اس نے پوچھا۔ ”کیوں ہنس رہی ہو؟“

وہ بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”میں نے سرفراز کو پاگل بنا کر اس بستر پر سلایا تھا اور وہیں اس کی موت ہوئی تھی۔ تو بھی اس بستر پر چلا جا اب تیری باری ہے۔“

”یہ۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“

وہ قہقہہ لگا کر بولی۔ ”میں نے چائے میں وہ دوا ملائی تھی جو تم نے سرفراز کو دی تھی۔ میں نے مشورہ دیا تھا کہ میرے ڈرائیور باپ کی طرح تمہیں بھی بیٹھ کے لیے ختم کر دیا جائے لیکن میں نے یہ راہ اختیار کی ہے۔ کل صبح تمہیں دوسری خوراک دوں گی۔“

تمہیں خطرناک پاگل بنا کر پاگل خانے بھیج دوں گی۔ وہاں تم کبھی ہوش میں آکر میرے خلاف کچھ بولو گے تب بھی پاگل ہی کھلاؤ گے۔“

وہ مست ہو کر قہقہے لگا رہی تھی۔ پھر اچانک ہی چکرا گئی۔ لڑکھرائی، سنبھل نہ سکی۔ ایک کرسی سے ٹکراتی ہوئی کرسی سمیت فرش پر گر پڑی۔ بشارت نے اس پر جھک کر کہا۔ ”کیا ہوابی بی بی؟ قہقہے نہیں لگاؤ گی؟“

وہ فرش پر سے اٹھ نہ سکی۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بولی۔ ”میرا سر چکرا رہا ہے۔ خالی خالی سالگ رہا ہے۔ میرا دل ڈوب۔ ڈوب۔ ڈوب۔“

وہ آگے کہہ نہ سکی۔ گہری گہری سانس لینے لگی۔ بشارت نے اس کے چہرے پر ذرا اور جھک کر کہا۔ ”ایک طمانچے کے ایک ہزار لات یا جوتے کے ڈیڑھ ہزار اور منہ پر تھوکنے کے دو ہزار روپے۔ آخ تھو.....“

اس نے منہ پر تھوک دیا۔ یہ اتنی بڑی توہین تھی کہ وہ حلق پھاڑ کر چیخ پڑی۔ چیخنے کا اثر کمزور دماغ پر پڑا دماغ کی کوئی رگ متاثر ہوئی۔ اس کے بعد حلق سے دوسری چیخ نہ نکل سکی۔ وہ بے ہوش ہو گئی۔ بشارت نے اسے بلایا پھر جھنجھوڑ کر آواز دی۔ وہ آواز کی چیخ سے دور ہو چکی تھی۔ اس نے فرش پر سے اسے اٹھایا۔ کاندھے پر لا کر پلنگ کے قریب آیا۔ پھر اسے بے دردی سے بستر پر پھینک دیا۔

ہائے کیا خوب صورت بدن تھا۔ نگاہوں کو پکارا رہا تھا لیکن بشارت نے نگاہیں پھیر لیں۔ جی چاہتا تھا اس کی بوٹیاں نوج ڈالے لیکن بے اختیار ایک آئینے کی طرف کھنچا چلا آیا۔ اس آئینے میں سرفراز کی آنکھیں مسکرا رہی تھی۔ اپنے تابعدار کو شاباشی دے رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں۔ ”اس پاگل لڑکی سے مال و زر حاصل کرنے کی امید نہ کر۔ سیف میں مھنچاں ساٹھ ہزار روپے ہوں گے۔ تجھے تیرے نصیب سے زیادہ نہیں ملے گا۔ اب اپنی جان سلامت رکھنے کی فکر کر۔ تجھ سے اب بھی کوئی چوک ہو گئی تو ماں بیٹی تجھے زندہ نہیں رہنے دیں گی۔“

”میں بچا کچھا مال سمیٹ کر چلا جاؤں گا۔“

”ابھی نہیں۔ اس نے تیرے ذریعے مجھے پاگل بنایا تھا۔ میرا قرض ادا دے۔ اسے ایک خوراک اور دے پھر چلا جا۔“

”ہاں کل صبح دوسری خوراک دوں گا۔ ابھی رات ہے۔ تنہائی ہے، اس کا بدن مجھے بلا رہا ہے۔ میں جا رہا ہوں۔“

”خبردار! اسے ہوس کی نظروں سے نہ دیکھنا۔“

”کیوں نہ دیکھوں؟“

”اس لیے کہ یہ باپ کی آنکھیں ہیں، جس سے تو بیٹی کو دیکھ رہا ہے۔“

”یہ کیا بکواس ہے۔ یہ تیری بیٹی نہیں ہے۔“

”میں اس کی ماں کا خاوند رہ چکا ہوں۔ اس رشتے سے یہ میرے لیے محترم ہے۔“

اگرچہ میں اس کی جان کا دشمن ہوں۔ اسے بدترین پاگل بنانا چاہتا ہوں۔ میرے آنکھیں اس کی ہر طرح کی تباہی دیکھیں گی لیکن بے شرمی نہیں دیکھیں گی کیونکہ شرم آنکھوں میں ہوتی ہے، خواہ وہ آنکھیں دوست کی ہوں یا دشمن کی۔“

وہ آئینے سے دور ہٹ گیا۔ وہاں سے گھوم کر بستر پر پڑی ہوئی شائستہ کو دیکھا پھر سر جھکا کر اس کمرے سے باہر آگیا۔ اگرچہ حقیقت میں سرفراز کی آنکھیں بول نہیں سکتی تھیں مگر ان آنکھوں کے پیچھے مجرمانہ احساسات بول سکتے تھے۔ اس لیے وہ احساسات مختلف پیرائے میں بول رہے تھے۔ سوچ کا مختلف انداز اس لیے تھا کہ وہ آنکھیں دشمن قاتل کی بھی تھیں، مقتول کی بھی تھیں اور ایک باپ کی بھی تھیں۔ کچھ مقدر نے اور کچھ ضمیر نے بشارت کو مختلف ذبیحوں میں جکڑ لیا تھا۔

وہ خواب گاہ میں آیا۔ شائستہ لاہور سے جو اپنی لائی تھی وہ ایک طرف رکھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی کو دیکھ کر سوچا۔ ”اس میں بھی کچھ مال ہوگا۔ دانشمندی یہی ہے کہ کل اسے ایک خوراک اور پلا کر یہاں سے تمام مال سمیٹ کر چلا جاؤں۔“

اس نے قریب آکر اپنی کو کھولنا چاہا۔ وہ لاک تھی۔ اس نے ادھر ادھر دروازہ وغیرہ میں چابی تلاش کی۔ پھر اپنی اٹھا کر دوسرے کمرے میں آگیا۔ اسے سینئر نمیل پر رکھ کر شائستہ کے پاس آکر اس کی تلاشی لی چابی مل گئی۔

وہ کبھی سوچ رہا تھا، مال غنیمت لے کر چلا جائے پھر خیال آتا تھا کہ کوٹھی والے اس پر چوری کا الزام لگائیں گے۔ وہ جہاں جائے گا کبھی نہ کبھی پکڑا جائے گا۔ اور اگر کہیں نہ جائے، شائستہ کو کمزور بنا کر اپنے قابو میں رکھے تو اس کی ماں اور دوسرے رشتے دار

بدنامی کے خیال سے قانونی کارروائی نہیں کریں گے۔ اگر مختلف ذرائع سے اسے ہلاک کرانا چاہیں گے تو وہ اپنے ساتھ شائستہ کو بھی لے ڈوبے گا۔

اس نے اپنی کو کھولا۔ اندر کپڑے، میک اپ کا سامان اور پرفیوم وغیرہ جیسی چیزیں تھیں۔ کپڑوں کے نیچے ہزار روپے کی نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ موبائل فون بھی رکھا ہوا تھا۔ پتا نہیں کب سے اس کا بزر بول رہا تھا۔ اس نے فون کو اٹھایا۔ پھر آرام سے کرسی پر بیٹھ کر اسے آن کرتے ہوئے بولا۔ ”ہیلو! کون ہے؟“

دوسری طرف سے رشیدہ کی آواز آئی۔ ”میں بول رہی ہوں، فون بی بی جی کو دو۔“

وہ چمک کر بولا۔ ”ہیلو رشیدہ! تم نے مجھے پہچانا؟ میں سرفراز بول رہا ہوں۔“

”کیا بکواس ہے؟ کیا میں تمہاری آواز نہیں پہچانتی ہوں؟“

”بے شک پہچانتی ہو۔ مگر میں بشارت نہیں ہوں۔ بشارت کے اندر سے اور اس کی زبان سے بول رہا ہوں۔ اگر یہ وڈیو فون ہوتا تو تم میری آنکھیں دیکھتے ہی خوشی سے رو پڑتیں۔ مجھ سے ملنے کے لیے دوڑی چلی آتیں۔“

ادھر رشیدہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ اسے یاد آگیا کہ بشارت کو اس کے مقتول شوہر کی آنکھیں ملی ہیں۔ مقتول کی ان آنکھوں نے شائستہ کو بھی دیکھا ہوگا اب اسے بھی پکار رہی ہیں۔ وہ گھبرا کر بولی۔ ”شائستہ کہاں ہے؟ اس سے بات کراؤ۔“

”تمہاری بیٹی جہاں بھی ہے، زندہ ہے اور خیریت سے ہے۔ تم کوئی حماقت کرو گی، میرے خلاف کوئی قدم اٹھاؤ گی تو تمہیں بیٹی کی لاش ملے گی۔“

وہ چیخ کر بولی۔ ”نہیں، ایسا نہ کہو۔ تم جو تاوان چاہتے ہو، میں ادا کروں گی۔ اسے کوئی نقصان نہ پہنچاؤ۔ بولو کیا چاہتے ہو؟“

”یہاں شائستہ کی اپنی میں لاکھوں روپے ہیں۔ لیکن مجھے رقم نہیں چاہیے، عزت چاہیے۔ وہ عزت نہیں چاہتا، جس کے لیے ایک بیوی دو شوہروں کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔ وہ عزت نہیں چاہتا جو ذلالت اور کینے پن سے قائم رکھی جاتی ہے۔ عزت ایک مقدس عطیہ ہے، جو خدا ایک انسان کے، دوسرے انسان کو دیتا ہے۔ کیا تمہارے پاس ایسی کوئی بے داغ عزت ہے؟“

”میری بیٹی کی سلامتی کا معاملہ ہے۔ اس لیے مانتی ہوں کہ ہمارے پاس بے داغ عزت نہیں ہے۔ مگر مختلف ذرائع سے حاصل کی ہوئی عزت ہے اور جو ہمارے پاس ہے وہی میں دے سکتی ہوں۔ آج سے میں تمہاری عزت کروں گی۔ مجھے بتاؤ، میری بیٹی کہاں ہے؟“

”جب بیٹی نے تمہیں یہ جگہ نہیں بتائی تو میں کیوں بتاؤں؟ میں تم سے صاف اور سیدھی بات کرتا ہوں۔ میں نے شائستہ کو وہی دوا پلائی ہے، جس کے اثر سے میں یعنی سرفراز پاگل ہو گیا تھا۔ میں اسے نیم پاگل اور کمزور بنا کر اپنے قابو میں رکھوں گا۔ یہ ہمیشہ میرے رحم و کرم پر رہے گی۔“

”تم میری بیٹی کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کر رہے ہو؟“

”میں ایسا نہ کرتا، تو تم ماں بیٹی میرے ساتھ یہی کرتیں۔ میں تمہاری بیٹی کے فریب میں آکر گھر کا رہا، نہ گھاٹ کا۔ میری سلامتی اسی میں ہے کہ میں شائستہ کو اپنی گرفت میں رکھ کر تم لوگوں کی سازشیں ناکام بناتا رہوں۔ وہ جب تک میرے قبضے میں رہے گی، تم اور تمہارے خاندان والے بدنامی کے ڈر سے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔“

”ذرا عقل سے کام لو۔ یہاں شائستہ کے ساتھ کب تک چھپے رہو گے؟“

”میں اسے لے کر ملک سے باہر چلا جاؤں گا۔ تم ہمارے اخراجات کے لیے رقم بھیجتی رہا کرو گی۔“

”میں تم دونوں کے اخراجات بھی پورے کروں گی اور لندن میں تمہاری رہائش کا انتظام بھی کر دوں گی۔ میرے تعاون کے بغیر تمہیں دشواریاں پیش آئیں گی۔ مجھے اپنا سمجھو۔ مجھے اپنے پاس بلاؤ۔ میں تمہیں اپنا داماد بنا لوں گی۔“

”داماد؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اب میں شائستہ سے شادی کر سکتا ہوں نہ اسے بری نیت سے دیکھ سکتا ہوں۔ اب وہ میری بیٹی ہے۔“

”یہ کیا بکواس ہے؟ اسے بھگا کر لے گئے۔ اس کے ساتھ بد معاشیاں کرتے رہے، اب اسے بیٹی کہتے ہو؟ تمہیں شرم آنی چاہیے۔“

”شرم آ رہی ہے۔ اسے سرفراز کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں اور جب باپ کی آنکھیں دیکھتی ہیں تو ہر لڑکی بیٹی نظر آتی ہے۔ خبردار! تم میرے سامنے کبھی نہ آنا جب یہ

بیٹی ہے تو تم جو رو دکھائی دو گی۔“

”اے پاگل کے بچے! میں تیرا منہ توڑ دوں گی۔“

”منہ توڑ کر کیا کرو گی؟ میری آنکھیں پھوڑ دو۔ مگر یاد رکھو، یہ میری نہیں،

تمہارے شوہر کی ہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ رشیدہ نے ”ہیلو ہیلو“ کہہ کر اسے مخاطب کیا پھر ریپور رکھ کر سوچنے لگی۔ کیا کرے؟ شائستہ نے حماقت کی تھی کہ ماں کو گلشن والا مکان نہیں بتایا تھا۔ دوسری حماقت یہ کی تھی کہ بشارت کو ٹھکرانے کے لیے تنہا گئی تھی۔ اسے یہ زعم تھا کہ وہ اس کے پیروں کو چومتا ہے، سر پر کبھی نہیں چڑھے گا۔ اب جو چڑھا ہے تو اسے اتارنے کے لیے میزھی نہیں مل رہی تھی۔ بیٹی تک پہنچنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔

وہ اٹھ کر ٹھٹھلنے لگی۔ اصل مسئلہ یہی تھا کہ بیٹی تک کیسے پہنچے؟ اس کا پتا ٹھکانا معلوم ہو جاتا تو وہ کسی نہ کسی تدبیر سے اسے بشارت کی قید سے نکال کر لے آتی۔ اور وہ جو عزت کا دشمن بن گیا تھا اسے بھی خاک میں ملا دیتی۔

بڑی دیر تک سوچتے رہنے کے بعد عقل نے کام کیا۔ یہ خیال آیا کہ جب وہ آنکھوں کے عطیہ کے فارم پر دستخط کر رہی تھی تو ذہنی طور پر بری طرح الجھی ہوئی تھی۔ شائستہ کی انتقامی کارروائی اور دوسرے شوہر کی موت کا صدمہ تھا۔ یہ پڑھ کر صدمہ اور بڑھ گیا تھا کہ شوہر کی آنکھیں بشارت کو دی جا رہی ہیں ایسے میں وہ فارم پر لکھا ہوا بشارت کے مکان کا پتا نہ پڑھ سکی اور ذہن پر بوجھ رکھ کر فارم پر دستخط کر دیے۔

اب راستہ مل گیا۔ وہ کراچی جا کر آئی بینک سے بشارت کی موجودہ رہائش گاہ کا پتا معلوم کر سکتی تھی۔ وہ پھر فون کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اسی وقت گاسے نے آکر سلام کیا۔ وہ بولی۔ ”کیا بات ہے؟“

”بیگم صاحبہ! آپ نے بلایا تھا۔“

”میں نے؟“ وہ سوچنے لگی۔

وہ سر جھکائے کھڑا رہا۔ رشیدہ نے جس کام کے لیے بلایا تھا، وہ کام پریشانی کے سبب یاد نہ آیا لیکن یہ یاد آ گیا کہ وہ بشارت کا رشتہ دار ہے۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا بشارت تمہارا

اپنا بھتیجا ہے؟“

”اپنا تو نہیں ہے لیکن اپنوں سے بڑھ کر ہے۔ اس نے آپ کے سامنے میرا سر جھکا دیا ہے۔ اگر وہ کہیں مل جائے تو اسے جوتے مارتے ہوئے آپ کے قدموں میں لاؤں گا۔“

”اگر تم اسے گالیاں دو گے یا مارو گے تو ہماری بیٹی بدنام ہوگی۔ ذرا سی بھی بات پھیلے گی تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔“

”بیگم صاحبہ! وہ نظر تو آئے۔ پھر کوئی تدبیر کر لیں گے۔ میں بھیجے کے قدموں میں گر کر بی بی جی کو عزت آبرو سے یہاں لے آؤں گا۔“

”میں کراچی جا کر معلوم کر سکتی ہوں کہ وہ کہاں چھپا ہوا ہے۔“

”پھر تو آپ مجھے بھی ساتھ لے چلیں۔“

وہ سوچنے لگی۔ اسے لے جانے میں کیا حرج ہے؟ ہو سکتا ہے، یہ کوئی کام دکھا جائے۔ پنڈ کے لوگ ایک دوسرے کے لیے بڑی جذباتی محبتیں رکھتے ہیں۔ مجھے یہ طریقہ آزمانا چاہیے۔

”ٹھیک ہے، چلنے کی تیاری کرو۔ مگر پہلے صحیح حالات سن لو۔ شائستہ اس کے ساتھ بھاگنے کے بعد بھی یہاں آئی تھی۔ تم نے بھی اسے کل تک یہاں دیکھا ہے۔ وہ پھر کراچی جا کر اس نمک حرام سے دھوکا کھا گئی ہے۔ اس نے شائستہ کو کہیں قید کر رکھا ہے۔ وہ جگہ ہمیں معلوم ہو جائے گی۔“

وہ گامے کو تفصیل سے واقعات بتانے لگی۔ اس نے سننے کے بعد کہا۔ ”بیگم صاحبہ! آپ نے یہ سب کچھ بتا کر بہت اچھا کیا۔ اب آپ دیکھیں گی کہ میں کس طرح بین بجا کر بشارت جیسے سانپ کو اس کے بل سے نکالوں گا۔“

”اگر یہ محض دعویٰ نہیں ہے اور تم واقعی بشارت کو میرے قدموں میں لے آؤں گے تو میں تمہیں دس ہزار روپے دوں گی۔“

”نہیں بیگم صاحبہ! شرمندہ نہ کریں۔ میں بی بی جی کو واپس لانے اور اس کعبخت کو سزا دلانے کے لیے ایک پیسہ بھی انعام میں نہیں لوں گا۔“

”میں بیٹی کو واپس حاصل کرنے کے بعد اس کعبخت کو بہت بڑی چوری کے الزام

میں سزا دلاؤں گی۔ کیا تم بھی چوری کی گواہی دو گے؟“

”میں حق نمک ادا کرنے کے لیے اور قانون کے تقاضے پورے کرنے کے لیے مجرم کو اس کے جرم کی سزا ضرور دلاؤں گا۔ اس کے خلاف گواہی دوں گا۔ آپ جو حکم دیں گی اس پر عمل کروں گا۔“

رشیدہ نے اسے قریب بلایا۔ وہ قریب آکر قدموں میں بیٹھ گیا۔ وہ اس کی طرف جھک کر بولی۔ ”اس کی کوئی کمزوری ہو تو بتاؤ۔ یاد نہیں ہے تو سوچو۔ اس دنیا میں شہ زور وہی ہے جو دوسروں کی کمزوریاں معلوم کرتا ہے۔ خدا کی قسم! میں اس کی کسی بھی معمولی سی کمزوری سے کھیل کر اسے جہنم میں پہنچا دوں گی۔“

وہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔

☆-----☆-----☆

رات گزرنے لگی۔ پھر صبح ہونے لگی۔ شائستہ بڑی کمزور سی آواز میں کراہ رہی تھی۔ ہوش میں آتی جا رہی تھی۔ ایسے وقت اسے ہلکی ہلکی خراٹوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر دیکھا۔ پھر سوچا کہاں ہے؟ فوراً یاد آگیا کہ وہ بشارت کے کمرے میں ہے۔ وہاں وہ ٹھنڈی بوتل پینے کے بعد چکرا کر گر پڑی تھیں۔ لیکن فرش پر گری تھیں اور خود کو بستر پر محسوس کر رہی تھی۔ اس نے اٹھنا چاہا۔ پتا چلا اس کے دونوں ہاتھ پٹنگ کی پیوں سے بندھے ہوئے ہیں۔ اس نے بشارت کے ذریعے سرفراز کو بھی اسی پٹنگ پر اسی طرح بندھوایا تھا اور اب بشارت اس سے پکچھا ہوا سبق اسی پر دہرا رہا تھا۔ اس مرحلے پر اسے یقین ہو گیا۔ صندل، بول، میں دن دن اتنے والی دوا ملائی گئی تھی۔ اس یقین کے ساتھ ہی وہ کسمانے لگی۔ سے پاگل کھانا منظور نہیں تھا۔ اس نے زور لگا کر باتوں کو رسیوں کی گرفت سے نکالنا چاہا۔ یہ آسان نہیں تھا اور اس کے اعصاب زور ہو چکے تھے۔ وہ آدھے صندل میں نہ تھک رہا تھا۔

اس نے سر جھکا کر دیکھا۔ دوسرے پٹنگ پر بشارت گہری نیند کے مزے لے رہا تھا۔ اسے غصہ آنے لگا۔ اس نے چائے میں دوا ملا کر دی تھی۔ بشارت کو پاگل ہونا اور یوں بستر سے بندھا ہونا چاہیے تھا۔ لیکن وہ مکار نکلا۔ اس نے چال الٹ دی تھی۔ اس کا نمک کھانے والے، اس کے ٹکڑوں پر پلنے والے نے اسے باندھ رکھا تھا۔ وہ غصے سے چیخ

پڑی۔ ”کتے! کیئے.....!“

آگے جھپک کر نہ بول سکی۔ دماغ پھوڑے کی طرح دکھنے لگا تھا۔ اس کی یہ بہت بڑی کمزوری تھی کہ غصہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ ذرا سی بات پر پھٹ پڑتی تھی۔ اس ضرر رساں دوا کے باعث غصے میں بہت زیادہ شدت آگئی تھی۔ اس کے پیچھے پر بشارت اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے قریب آکر دیکھا، وہ جنوں میں مبتلا تھی۔ دانتوں کے درمیان اپنا نچلا ہونٹ چبا رہی تھی۔ اور ہونٹ سے خون رستا ہوا اس کی گردن پر آ رہا تھا۔ بشارت نے ایک تھپڑ رسید کیا تو اس کا منہ کھل گیا۔ نچلا ہونٹ دانتوں کے درمیان سے آزاد ہو گیا۔ وہ جیب سے شیشی نکال کر اے دکھاتے ہوئے بولا۔ ”ابھی تم اس چار دیواری میں ہو۔ دوسری خوراک دوں گا تو پاگل خانے پہنچ جائی گی۔“

وہ سہم کر آنکھیں پھاڑ کر اس شیشی کو دیکھنے لگی۔ بشارت نے پوچھا۔ ”کیا پاگل خانے جاؤ گی؟“

اس نے سہم کر انکار میں سر ہلایا۔ وہ بولا۔ ”میرے بات مانتی رہو گی تو دوسری خوراک نہیں دوں گا۔ بولو، مانو گی؟“

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ وہ بولا۔ ”میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لا رہا ہوں۔ تم کھاؤ گی، دودھ پیو گی اور توانائی حاصل کرو گی۔“

وہ اپنی اٹیچی کے پاس گیا۔ پھر واپس آکر اس کے منہ میں ایک چھوٹا سا رومال ٹھونس کر، اس کے اوپر شپ چپکاتے ہوئے بولا۔ ”میں آدھے گھنٹے میں کھانے پینے کا سامان لے آؤں گا۔ آرام سے گونگی بن کر پڑی رہنا۔“

وہ باہر چلا گیا۔ شائستہ نے کار کے اشارت ہونے اور دور جانے کی آوازیں سنیں۔ وہ پھر ہاتھوں کو آزاد کرانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ جسم میں جیسے جان نہیں تھی۔ دوا نے انتہائی لاغر بنا دیا تھا۔ وہ تھک کر صبر کرنے لگی۔ سوچنے لگی، کھانے پینے سے کچھ توانائی ملے گی تو وہ یہاں سے رہائی کی کوشش کرے گی۔

”وہ آدھے گھنٹے میں آگیا۔ اس نے منہ سے شپ ہٹا کر رومال نکال کر اپنے ہاتھ سے سبب کھلایا۔ پھر اسے سہارا دے کر ذرا اٹھایا اور دودھ پلایا۔ وہ پینے کے دوران بولی۔ ”میں بہت کمزور ہو گئی ہوں۔ اپنے پیروں سے چل کر کہیں نہیں جاسکوں گی۔ میرے ہاتھ

کھول دو۔“

”میں صرف ہاتھ روم جانے کی آزادی دوں گا۔ پھر تمہیں باندھ کر رکھوں گا۔“

”تم اس طرح کیا حاصل کرنا چاہتے ہو؟“

”اپنی سلامتی چاہتا ہوں۔ تمہیں اپنے بس میں رکھوں گا تو تمہارے اونچے خاندان والے میرے خلاف قانونی کارروائی نہیں کریں گے۔ تم نے دیکھا تھا کہ سرفراز کا حافظہ کمزور ہو گیا تھا۔ تم بھی پچھلی زندگی بھول جاؤ گی، میری شریک حیات بن کر رہو گی۔ میں تمہیں ملک سے باہر لے جاؤں گا تاکہ یہاں کوئی تمہیں ایک ڈرائیور کے ساتھ نہ دیکھے۔“

”میں تمہیں اتنی دولت دوں گی کہ تم باہر کسی ملک میں عیش و عشرت کی زندگی گزار سکو گے۔ مجھ پر بھروسہ کرو۔ دشمنی کا رشتہ تمہیں بھی نقصان پہنچائے گا۔“

”میں شیطان پر بھروسہ کر سکتا ہوں، تم ماں بیٹی پر کبھی نہیں کروں گا۔“

وہ اس کے ہاتھ کھول کر اسے سہارا دے کر ہاتھ روم کر اندر لے گیا۔ پھر بولا۔ ”یہ دروازہ کھلا رہے گا اور میں چوکھٹ کے اندر ایک پیر رکھے دوسری طرف منہ کر کے کھڑا رہوں گا۔“

وہ بولی۔ ”یہ میرے مزاج کے خلاف ہے۔ پلیز دروازہ بند کرنے دو۔ میں بند ٹائلٹ سے کہیں بھاگ کر نہیں جاسکوں گی۔“

”بند ٹائلٹ میں جینیں مار سکتی ہو۔ میرے دروازہ توڑنے تک لوگ جمع ہو جائیں گے۔ جاؤ مجھ سے بحث نہ کرو۔“

وہ مجبور ہو گئی۔ غصہ تو آ رہا تھا لیکن غصہ پر یہ خوف حاوی ہو گیا تھا کہ اس کے احکامات کی تعمیل نہ کرنے سے وہ دوسری خوراک حلق میں ٹھونس دے گا۔

آدھا دن گزر گیا۔ اس نے پھر اے پلنگ سے باندھ دیا تھا۔ وہ اس مکان میں اسی طرح کئی دن، کئی مہینے گزار سکتا تھا۔ شائستہ کا حافظہ کمزور ہوتے ہی اسے اپنی منکوحہ بنا کر کہیں دو جا کر زندگی گزار سکتا تھا لیکن ابھی یہ فکر تھی کہ کل رات سے اب تک اس کی ماں نے بیٹی کی خبر نہیں لی تھی۔ کوئی بے چینی یا پریشانی ظاہر نہیں کر رہی تھی۔ اس سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ ماں چپکے چپکے کوئی کارروائی کر رہی ہے۔

شائستہ نے شام پانچ بجے کہا۔ ”مجھے مئی سے باتیں کرنے دو۔“

”تمہاری ماں کا فون آئے گا تو میں دوسرے کمرے میں جا کر بات کروں گا لیکن تمہیں فون سے دور رکھوں گا ورنہ تم یہاں کا پتا اسے بتا دو گی۔“

وہ ہنسنے لگی۔ اس نے پوچھا۔ ”کس بات پر ہنس رہی ہو؟“

زندگی ایک مذاق ہے۔ اسی لیے پاگل کوئی لطیفہ سے بغیر ہنسنے لگتے ہیں۔ وہ ہنسنے ہنسنے یوں چپ ہو گئی جیسے سانس رک گئی ہو۔ پھر وہ کراہنے لگی۔ دائیں بائیں سر ہنسنے لگی۔ دونوں پاؤں زور زور سے مارنے لگی۔ بشارت نے اس کے سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر پوچھا۔ ”کیا ہو رہا ہے؟ کیوں تڑپ رہی ہو؟ آرام سے رہو۔“

شائستہ نے دیدے پھیلا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سرفراز نظر آ رہا تھا۔ وہ سہم کر ساکت ہو گئی۔ پھر اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو گئیں۔ بشارت نے اسے آواز دی۔ سینے پر سر رکھا، ہلکی سی دھڑکنیں جاری تھیں۔ ناک کے سامنے ہاتھ رکھا۔ وہ سانس لے رہی تھی مگر غافل ہو گئی تھی۔ پتا نہیں وہ بے ہوشی تھی یا عارضی غفلت؟ وہ پیچھے ہٹ کر دوسرے بستر پر بیٹھ گیا۔

اس حسن و شباب کو سامنے دیکھ کر یاد آیا کہ وہ اسے بری نیت سے نہیں دیکھ سکتا ہے اور ابھی اسے منکوحہ بنانے کی بات سوچ رہا ہے تو یہ بھی نادانی ہے۔ اگر وہ اپنے اندر باپ کی آنکھیں رکھ کر اسے بیوی بنائے گا تو وہ آنکھیں اسے سکون سے رہنے نہیں دیں گی۔ وہ دہری کیفیات میں بے شرمی سے جیتا اور شرم سے مرتا رہے گا۔

یہ منصوبہ بیکار ہو گیا کہ وہ ملک سے باہر اسے لے جائے گا اور اس کے ساتھ زندگی گزارے گا۔ کس حیثیت سے زندگی گزارے گا؟ آنکھوں کے حوالے سے باپ بن کر رہ پائے گا؟ یہ بڑا مضحکہ خیز خیال تھا۔ اب وہ دولت مند حسینہ پہاڑ لگ رہی تھی، اس کے سر پر رکھی رہتی اور استعمال میں نہ آتی۔ صرف اس کی دولت ہی کام آ سکتی تھی۔

اور اب یہ خوف کھانا فضول تھا کہ آئندہ چوری کے الزام میں پکڑا جائے گا۔ اس کی عقل نے سمجھایا۔ ٹھیک ہے انجام برا ہو سکتا ہے لیکن کہیں گمنامی کی زندگی گزار کر قانون کی گرفت سے محفوظ بھی رہ سکتا ہے۔

اس نے اپنی کھول کر نوٹوں کی گڈیاں گنتیں۔ پورے پانچ لاکھ تھے۔ سیف میں

بھی رقم تھی۔ آرام سے کہیں چھپ کر زندگی گزارنے کے لیے یہ دولت بہت تھی۔

تب اسے باپ کا خیال آیا۔ اس کی آواز سنائی دی۔ ”بشارے پترا کہاں ہے تو؟“

وہ کسی منصوبے کو ایک پہلو سے کامیاب بناتا تھا تو دوسرے پہلو سے ناکامی سامنے آتی تھی۔ ابھی تو یہ آزادی تھی کہ وہ کسی بھی شہر سے باپ کے پاس رقم بھیجتا تھا۔ روپوش ہونے کے بعد وہ جہاں سے رقم منی آرڈر کرے گا وہاں کی پولیس پیچھے پڑ جائے گی۔

پھر ماں چل بسی تھی۔ باپ بھی چند دنوں کا مسمان تھا۔ کیا آخری دنوں میں باپ کے سرہانے نہیں رہے گا؟ وہ کوٹھی والوں سے اور قانون کے محافظوں سے نہیں، اپنے بوڑھے باپ سے منہ چھپانے جائے گا۔

وہ بچپن سے باپ کا لاڈلا تھا۔ اس نے باپ کے خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے چودھری کا پیسہ قبول کیا۔ پیسو جیسی محبوبہ کو چھوڑا۔ باپ سے وعدہ کر کے شہر آیا کہ بڑا آدمی بنے گا اور پنڈ میں اس کا سراونچا کرے گا۔

پھر اسے باپ کی آواز سنائی دی۔ ”بشارے! میرا سراونچا کر۔ والے! اپنے مالک کی بیٹی بھگا کر لایا ہے۔ میرا سر جھک رہا ہے پترا! میں مٹی میں رٹنے والا ہوں۔“

اس بار وہ چونک گیا۔ باپ کی آواز خیالوں میں نہیں سن رہا تھا۔ وہ آواز کمرے کے بند دروازے کے باہر سے آرہی تھی۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ حیرانی اور پریشانی سے دروازے کو دیکھنے لگا۔ دستک کی آواز آئی۔ پھر گائے چاچا کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”بھتیجے! پنڈ والوں کی معصومیت اور غیر تمندی کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ تو نے ہمارا نام ڈبو دیا۔ میں تیرے ابا کو ساتھ لایا ہوں۔ باہر آ۔ باپ سے آنکھیں ملا۔ اور اس بوڑھی گردن کو پکڑ کر مٹی میں جھکا دے۔“

رشیدہ کی آواز آئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”گائے! اندر سے کوئی آواز نہیں آرہی ہے۔ میری بچی کی خیریت تو معلوم کرو۔ شائستہ! بیٹی! تم کہاں ہو؟“

باپ نے آواز دی۔ ”بشارے! چپ کیوں ہے؟ اپنی ماں کو جواب دے۔“

بشارت آکر دروازے پر دونوں بازو پھیلا کر یوں لگ گیا جیسے باپ سے لپٹ رہا ہو، پھر بولا۔ ”ابے! یہ دروازہ بڑا مہربان ہے۔ تیرے آنے سے پہلے بند ہو گیا ہے ورنہ تجھ

سے نظریں ملتے ہی میں مرجاتا۔“

گامے نے کہا۔ ”باتیں مت بنا، بی بی جی کو باہر لا۔“

”یہ بے ہوش ہے، ابھی ہوش آتے ہی باہر آجائے گی۔ مگر چاچا! تو ابے کو یہاں لا کر مجھے بے موت مار رہا ہے۔ کتنی غیرت اور شرافت کے ساتھ پنڈ سے نکلا تھا، کتنا بے غیرت اور ذلیل ہو کر باپ سے منہ چھپا رہا ہوں۔“

باپ کی کمزوری سی آواز سنائی دی۔ ”پترا مجھ سے تو کھڑا بھی نہیں رہا جاتا، تو نے کمر توڑ دی ہے۔ میں زمین پر بیٹھ گیا ہوں۔ خدا سے آخری دعا مانگ رہا ہوں کہ دروازہ کھلے اور بیٹے کا منہ دیکھنے سے پہلے میرے مالک! مجھے اٹھالے۔ مجھے موت نہیں دیتا تو آنکھوں کا نور چھین لے۔ لوگ بیٹوں کو آنکھوں کا نور کتے ہیں۔ مگر میں بیٹے کو دیکھنے سے پہلے اندھا ہو جانا چاہتا ہوں۔“

وہ بوڑھے باپ کی ایک بات پر تڑپ رہا تھا۔ اس نے پلنگ کے پاس آکر شائستہ کے ہاتھ کھول دیے۔ پھر اونچی آواز میں کہا۔ ”میں نے بڑا آدمی بننے کے لیے تیرے خواب پورے کرنے کے لیے شارٹ کٹ راستہ اختیار کیا تھا۔ یہ راستہ یہاں آکر ختم ہو رہا ہے۔ باہر رشیدہ بیگم کا روایتی انتقام ہے۔ موت یا قانون کی جھکڑیاں۔ میں ہر پہلو سے بازی ہار چکا ہوں۔ سوچتا ہوں، باہر نکل کر تجھے اور دنیا والوں کو کیا منہ دکھاؤں گا؟“

گامے نے کہا۔ ”دکھانا تو ہوگا، تجھے باہر آنا ہوگا۔“

”ہاں آؤں گا۔ آ رہا ہوں۔“

اس نے جیب سے شیشی نکالی۔ اسے اپنی نگاہوں کے سامنے ناکر کہا۔ ”آؤں گا ایسے آؤں گا کہ دنیا مجھے دیکھے لیکن میں ہوش و حواس میں کسی..... دیکھوں۔“

منہ اور کیسے چھپاتے ہیں؟

شرم والیاں آنچل میں چھپاتی ہیں۔

شرم والے سر جھکا لیتے ہیں یا نظریں چرا لیتے ہیں۔ انہیں بند کر لیتے ہیں۔

بہت زیادہ غیرت مند ہوں تو آنکھیں پھوڑ لیتے ہیں یا جان دے دیتے ہیں۔

ایسا انجام تب ہوتا ہے جب عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔

آج تک میری عقل پر محاورے کا پردہ پڑا رہا اب اس دوا کے ذریعے اپنی عقل اور اپنے ہوش و حواس پر مستقل پردہ ڈال رہا ہوں۔ ”خدا حافظ ابے! خدا حافظ۔“

اس نے شیشی کھولی۔ منہ کھولا پھر رہی سہی ساری دوا اپنے حلق میں اندیل لی۔ شیشی کو خالی کر کے ایک طرف پھینک دیا۔ اگر وہ کسی مشروب میں ملا کر پیا تو وہ دوا ذرا دیر سے اثر دکھائی۔ لیکن وہ خالص دوا زود اثر ہوئی۔ وہ لڑکھڑا کر اٹیچی پر رکھی ہوئی نوٹوں کی گڈیوں پر آیا۔ پانچ لاکھ روپے اس کے چاروں طرف بکھرتے چلے گئے۔ وہ قہقہہ لگانے لگا۔ اسی وقت شائستہ کی آواز سنائی دی۔ ”کون ہے؟ ہے کون ہنس رہا ہے؟“

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بشارت ہنستے ہنستے فرش پر لوٹ رہا تھا۔ وہ پلنگ سے اتر کر ہنستے ہوئے بولی۔ ”دیکھو دیکھو، گدھا زمین پر لوٹ رہا ہے۔“

رشیدہ نے گامے کو جھنجوڑ کر کہا۔ ”میری بیٹی کی آواز آرہی ہے۔ وہ ہوش میں آگئی ہے۔ شائستہ! دروازہ کھولو۔ میں تمہاری ماں بول رہی ہوں۔“

وہ کمرے کے اندر ہنستے ہوئے بولی۔ ”باہر بھی ایک گدھی بول رہی ہے۔ ہاااا۔ ہاااا۔“

گامے دروازے پر ہاتھ مار مار کر کہہ رہا تھا۔ ”بشارے! کیوں پاگلوں کی طرح ہنس رہا ہے۔ دروازہ کھول؟“

بشارت نے شائستہ سے کہا۔ ”اے تجھے سنائی نہیں دیتا، دروازہ کھول۔“

”ابے جا! میں تیرے باپ کی ملازمہ نہیں ہوں تو دروازہ کھول۔“

باہر رشیدہ نے روتے ہوئے کہا۔ ”وہ دونوں پاگل ہو گئے ہیں۔ یا اللہ! میری بیٹی کو اپنی حفظ و امان میں رکھ۔ ہماری غلطیوں کی اتنی بڑی سزا نہ دے۔ ہمیں معاف کر دے۔“

میں کان پکڑتی ہوں۔ توبہ کرتی ہوں۔ توبہ رہا! میری توبہ.....“

دنو کہمار نے کہا۔ ”گامے! وہ دونوں پاگل ہو گئے ہیں۔ دروازہ نہیں کھولیں گے، اسے توڑ دے۔“

رشیدہ نے کہا۔ ”ہاں توڑ دوں، میری بچی کو باہر نکالو۔“

انتا شور سن کر وہاں کے کچھ لوگ آگئے تھے۔ کئی جوانوں نے دھکے مار مار کر اس مضبوط دروازے کو توڑ دیا۔ ٹوٹے ہوئے دروازے کے پیچھے سے دو پاگل برآمد ہوئے۔

بات محض دروازے کی نہیں ہے۔ دل توڑ دیا پیاں وفا توڑو، آئینہ آبرو توڑ دیا رسم شرافت توڑو۔ ایسی ہر ٹوٹی ہوئی چیز کے پیچھے ٹوٹا ہوا انسان ہی ملے گا۔ ارے انہوں نے دروازہ توڑا تو کیا توڑا؟ لوگ تو دربار خداوندی میں کی جانے والی توبہ توڑتے رہتے ہیں۔

ختم شد

اس کتاب کی وفاداری
دارالعلوم اسلامیہ